دیوارِ سنگ سے آگے

رخسانہ نگار عدنان

دیوارِ سنگ سے آگے

''اس سال ہونے والی مردم شماری کے غیر سرکاری نتائج کے مطابق ملک کی آبادی چودہ کروڑ سے تجاوز کر گئی ہے۔ آبادی میں اس بے تحاشا اضافے کی وجہ سے کئی قسم کے مسائل میں اضافہ ہو گیا ہے۔ سڑکوں پر ٹریفک کا لوڈ بڑھ گیا ہے، جس سے فضائی آلودگی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ بے شمار اقتصادی و معاشرتی مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے شور'' جتنی تشویشناک خبر تھی اس سے زیادہ ہراس پڑھنے والے کے چہرے سے عیاں تھا۔ دھاری دار ٹائی اور نیلا کوٹ پہنے آنکھوں پر موٹے عدسوں کی عینک لگائے، سنجیدہ چہرہ اور گمبھیر آواز کے ساتھ نیوز کاسٹر خبریں نشر کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ کمرے میں مکمل سناٹا تھا۔ صرف اسی کی بھاری آواز گونج رہی تھی اور ساگ بناتی عصمی نے ہاتھ روک کر نیوز کاسٹر کے پروپیگنڈے کو غور سے سنا۔ چھوٹی خالہ اندر کمرے میں بیٹھی ہل ہل کر تسبیح پڑھ رہی تھیں، خالو تو ابھی مسجد سے نہ لوٹے تھے اور باقی گھر میں ہر طرف خاموشی تھی اور یہ بیوقوف کہہ رہا ہے کہ آبادی خطرناک حد تک بڑھ گئی ہے، ادھر تو وہی حالت ہے آبادی کی جو اس نے ہوش سنبھالنے سے لے کر اب تک دیکھی تھی۔

وہ اور خالہ امی اوپر تیسری منزل کے دو چوباروں میں مقیم اور درمیان والا پورشن خالی تھا۔ صرف ایک کمرے میں چھوٹی خالہ کے جہیز کا کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا جسے رُشی نے میٹرک پاس کرتے ہی اوپر منتقل کر دیا تھا۔ چھت کی چٹی لکانوں سے اٹی ہوئی تھی۔ پرانے زمانے کا ڈریسنگ ٹیبل پرانا سا بڑا پلنگ اور دو چار ٹوٹی پھوٹی کرسیاں اور پیتل کے بھاری بھرکم برتن۔ دوسرا کمرہ خالی تھا اور نیچے کے پورشن میں چھوٹی خالہ اور خالو تھے۔ جگنو اور رُشی کی

موجودگی سے پھر بھی لگتا تھا ۔ اس گھر میں کوئی انسان رہتا ورنہ تو سارا دن اوپر نیچے الو بولا کرتے تھے۔ جگنو نے جب سے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا تھا، وہ دو چار ماہ بعد ہی آتا تھا اور اب تو رُشی نے بھی وہیں داخلہ لے لیا تھا کالج میں۔

اسی وجہ سے اسے لگتا تھا کہ دنیا میں آبادی بے حد کم ہے۔ کم از کم اس چھوٹے سے قصبے میں تو نہ ہونے کے برابر تھی۔ خالہ امی کی سوشل لائف نہ ہونے کے برابر تھی۔ چھوٹی خالہ کے گھر سے قدم باہر رکھنے کی صرف دو انتہائی صورتیں تھیں یا تو وہ کسی کی شادی میں جاتی تھیں یا پھر کسی کے دنیا سے اٹھ جانے پر اور درمیانی صورت صرف ایک تھی اور وہ تھی میلاد یا قرآن خوانی کی محفل، اس کام کے لیے وہ انتہائی اہتمام سے تیار ہوتی تھیں، اور جیسے ہی وہ سر منہ ڈھانپ کر گھر سے قدم باہر نکالتیں۔ رُشی ڈیک فل والیوم سے چلا دیتی اور گھر کی دیواریں بھی جیسے حدیقہ کیانی کے ساتھ چیخ اٹھتیں۔

''دوپٹہ میرا ململ کا، کروں کیا اس چنچل کا۔''

وہ وقت بقول رُشی کے مکمل آزادی کا ہوتا تھا، چودہ اگست سے بھی زیادہ آزادی کا اور یہ تو اس وقت کی بات تھی جب وہ دونوں یہاں ہوتے تھے۔ جبکہ اب تو خالو ٹی وی صرف بوقت خبر نامہ لگاتے تھے۔ باقی وہ جتنا وقت گھر پہ گزارے کسی کی مجال تھی جو سانس بھی بلند آواز سے لے سکتا۔ اسی لیے وہ اپر اسٹوری سے بہت کم نیچے اترا کرتی تھی وہ بھی چھوٹی خالہ کے بلانے پر اور چھوٹی خالہ بھی اسے اسی وقت بلاتی تھیں جب انہیں اس سے کوئی کام ہوتا تھا، خاص طور پر کوئی پیچیدہ سی سبزی بنوانے کا کام۔

اسے سبزی بنانے سے جتنی چڑ تھی، چھوٹی خالہ اتنا ہی اس کام کے لیے اسے دعوت دے کر بلواتیں تو وہ کڑھ کڑھ کر رہ جاتی۔ خاص طور پر ساگ، پالک اور میتھی جیسی بے مزہ سبزیاں۔ جتنا وہ ان سے بھاگتی تھی۔ خالہ اتنی ہی اس کے آگے سجا سجا کر رکھ دیتی تھیں اور آج بھی ابھی سردیوں کی ابتدا بھی نہیں ہوئی تھی اور انہیں ساگ پکانے کی سوجھ گئی تھی اور ساتھ ہی عمصی کی شامت آ گئی تھی۔

شام سے وہ اوپر دیوار سے مختلف قسم کے بہانے گھڑ گھڑ کر پیش کر رہی تھی۔ کبھی میں آٹا گوندھ رہی ہوں۔ کبھی خالہ امی کے کپڑے پریس کر رہی ہوں۔ کبھی کچھ کبھی کچھ۔ لیکن

ان کی چوتھی کڑک دار آواز کی گونج ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ وہ نیچے سر جھکائے بیٹھی ساگ بنا رہی تھی۔

چھوٹی خالہ رُشی کی خودسری کے معاملے میں جتنی بے نیازی برتتی تھیں اس کے معاملے میں اتنی ہی سنگدل بن جایا کرتی تھی۔

اسے ساگ بناتے بناتے جمائیاں آنے لگیں۔

ٹی وی پر اب کھیل کی خبریں نشر ہو رہی تھیں۔ جس میں پاکستان ون ڈے کرکٹ میچ میں حسب سابق ہار گیا تھا۔ جمائیاں لے لے اس کا منہ دکھنے لگا اور آنکھوں میں پانی اکٹھا ہو گیا اس نے اکتا کر اپنے آگے پڑے ''ہلتھل فوڈ'' کے اس ڈھیر کو بیزاری سے دیکھا اور ایک ترچھی نظر کمرے میں بیٹھی چھوٹی خالہ پر ڈالی وہ اس کی سستی کو کڑی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ ان سے نظر ملتے ہی وہ ایک دم سے الرٹ ہوگئی اور سر جھکا کر تیزی سے پتے توڑنے لگی۔ جیسے ہی موسم کا حال نشر ہوا اس کا دل خوش ہو گیا کہ ایک دو روز میں سرما کی بارشیں شروع ہونے والی ہیں۔ ہا، بارش!

اس نے خوش ہو کر سوچا۔ اس سوئے ہوئے محل میں واحد خوش خبری اس کے ہاتھ تیز چلنے لگے، اسی وقت فرید چچا اندر داخل ہوئے۔ خبروں کے بعد موسیقی کا کوئی پروگرام چلنے لگا تھا اناؤنسر گلوکاروں کے نام بتا رہی تھی یہ تو ڈبل خوشی ہو گئی تھی۔ ویسے بھی جو لوگ خبروں کے دوران سو جاتے تھے۔ ان کو جگانے کے لیے موسیقی سے بہتر کوئی طریقہ نہیں۔ اس نے دل جمعی سے ٹی وی اسکرین کی طرف دیکھا چچا فرید نے آگے بڑھ کر کھٹاک سے بٹن آف کر دیا۔ ساتھ ہی اس کی ننھی سی خوشی کی لو بجھ کر رہ گئی۔ جیسے کسی قیدی کو بیرک سے نکالتے ہی دوبارہ واپس بھیج دیا جائے۔ وہ بے دلی سے پتے توڑنے لگی۔



اس روز تو اسے نیوز کاسٹر کی بات پر یقین نہیں آیا تھا، لیکن تیسرے روز کی شام کو جب وہ چھوٹی خالہ کی قمیص کی آستین ادھیڑ رہی تھی۔ خالہ امی بھی چھوٹی خالہ کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھیں بلکہ وہی باتیں کر رہی تھیں چھوٹی خالہ تو عمصی کے کام پر نظریں جمائے بیٹھی تھیں جب چچا امام دین سلام کرتے ہوئے اندر داخل ہوا۔

"یہ ایک اور بور شخص۔" اس نے سوچتے ہوئے زور سے دھاگا کھینچا۔

"توبہ جی توبہ، کیا بتائیں قیامت کی نشانیاں ہیں۔ اللہ میری توبہ۔"

وہ بیچ بیٹھتے ہی بڑی خضوع و خشوع سے توبہ کرنے لگا دونوں خالائیں تو اس کی طرف متوجہ ہوئی ہی تھیں، عصمی نے ایک پل کو ہاتھ روک کر اسے غیر دلچسپ انداز میں دیکھا، اور ہونہہ کہہ کر اپنے کام میں لگ گئی۔

"کیا ہوا بھائی امام دین! خیر تو ہے جو یوں توبہ تلا کر رہے ہو۔" خالہ امی نے پوچھا۔

"بس جی کچھ نہ پوچھیں ایک تو رات کو ہلکی ہلکی بارش ہوئی تھی، دوسرے کل رات کو ہی وہ مہتاب علی نہیں جس کی بڑی سی کپڑے کی دکان ہے۔"

وہ بولتے بولتے رکا قصبے کے بازار میں دو تین ہی بڑی بڑی دوکانیں تھیں خالاؤں کو پہچاننے میں کیا وقت ہوئی تھی فوراً بول پڑیں۔

"ہاں ہاں ہمیں پتا ہے، کیا ہوا ہے اسے؟"

"اجی اسے کچھ نہیں ہوا۔ کل رات اس کا باپ مر گیا۔ کئی سالوں سے بیمار تھا سانس کا مریض۔ اب بندہ پوچھے جہاں اتنے سال بیماری کے کاٹ لیے وہاں دو چار دن اور کاٹ لیتا یہ کم بخت بارشیں تو کچھ رک جاتیں۔" وہ منہ بگاڑ کر خیالوں میں شاید مہتاب علی کے باپ کی جلد بازی یا کوتاہ بینی کو کوس رہا تھا۔

"لو بتاؤ بھلا۔ یہ کوئی بندے کے بس میں ہے جب جی چاہا مر گئے جب جی چاہا موسم دیکھ کر ملک الموت کو ٹال دیا کہ بھائی کل آنا آج تو بارش ہو رہی ہے۔" چھوٹی خالہ نے افسوس بھرے انداز میں امام دین کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "جب اس کی آنی تھی آ گئی۔"

"چلو جی آ گئی۔ مانا یہ اس کے بس میں نہیں تھا پر صبح جو قبرستان میں پھسلن تھی دو تین تو وہیں رپٹ گئے۔ میں تو جی میں بڑا گھبرایا کہ کہیں ایک قبر کے بجائے دو تین اور نہ کھودنی پڑ جائیں۔ پر وہاں دو تین کا کیا سوال۔ ایک کھودنی ہی دشوار ہو گئی تھی۔" وہ پھر سے سسپنس پھیلاتے ہوئے بولا۔

"اجی تو بارش نہیں ہوئی رات، امام دین! جتنا تم فسانہ بنا رہے ہو۔" چھوٹی خالہ

شروع سے حقیقت پسند تھیں۔

"آپ کو نہیں پتا جی، یہ سرما کی موئی بارش ہوتی کم ہے زمین میں دھنستی زیادہ ہے نہ اس کا شور نہ اس کی آہٹ، بس اندر ہی اندر اترے چلی جاوے ہے زمین کے بیچ کیا رات بھی اس نے۔ اللہ موت دے تو سوکھے موسم میں۔" اس کی نئی ایجاد کردہ دعا پر تینوں حیران رہ گئیں۔

"لو کر لو بات۔ پہلے بندہ کہتا تھا اللہ موت دیتا عزت و آبرو کی ایمان کے ساتھ اٹھانا، اب یہ بھی کہنا پڑے گا کہ سوکھے موسم میں اس دنیا سے اٹھانا، امام دین تیرا بھیجا تو نہیں کھسک گیا۔" چھوٹی خالہ نے امام دین کو تنقیدی نظروں سے گھورا۔

"میری بات سنو گی تو جی آپ کو بھی لگے گا کہ بھیجا کھسک گیا ہے۔"

"اس نے پھر ادھوری بات کی عصمی نے ٹانکے ادھیڑنے چھوڑ دیے اور غور سے امام دین کو دیکھنے لگی۔ تیز گہرے رنگ کا شلوار سوٹ جو کبھی گرم رہا ہو گا مگر اب صرف رنگ اڑا بے جان سا کپڑا تھا اس کے اوپر نیلی سفید دھاریوں والی لنڈے کی بند گلے کی جرسی تھی۔ صبح قبر کھودنے کے بعد شاید اس نے ہاتھ دھوئے ہوں لیکن چہرے پر ہاتھ پھیرنا بھول گیا ہو گا کیونکہ اس کی جھریوں بھرے چہرے پر کہیں کہیں گیلی مٹی جمی ہوئی تھی اور سر کے کالے سفید کھچڑی بالوں میں بھی مٹی لگی تھی۔

"وہ تو جی عجیب سی کہانی ہو گئی۔ میں نے جی قبر کھودنی شروع کی سردی تو تھی ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی ہونے لگی۔ دس گیارہ بجے جنازہ تھا۔ میں تیزی سے پھاوڑا چلا رہا تھا کہ جلدی سے قبر کھودوں اور اس سردی سے جان چھڑاؤں۔ پر کیا بتاؤں پہلی قبر کھودی تو اندر مردہ۔"

"کیا؟" تینوں بلند آواز سے چیخیں۔ "ہائے!" چھوٹی خالہ نے انگلی لبوں پر رکھی اور دھک سے رہ گئیں۔ ڈر تو عصمی بھی گئی تھی۔

"پھر؟" خالہ امی نے حوصلے سے آگے پوچھا۔

"میں نے جلدی جلدی اسے بند کیا اور دوسری کھود ہی رہا تھا کہ لڑکا آ گیا قبر تیار ہے، جنازہ چل پڑا ہے۔ میرے تو ہاتھ پیر پھول گئے تیزی سے جو ہاتھ چلایا تو اس کے اندر بھی پہلے سے مردہ موجود تھا، نری ہڈیاں، ہائے جی کیا بتاؤں۔" اس کے چہرے پر زلزلے کے

آثار تھے۔

''اے امام دین! تجھے اللہ سمجھے ہارٹ فیل کروائے گا ہمارا، جلدی بول آگے۔'' چھوٹی خالہ کمزور دل کی مالک تھیں گھبرا کر بولیں۔

''بس جی کیا بولوں آگے۔ کہیں جا کر پانچویں قبر میں اس بڈھے کو جگہ ملی۔ میرا تو پورا وجود اکڑ گیا قبریں کھود کھود کر۔ میں تو سمجھا تھا کہ چھٹی قبر مجھے اپنی ہی کھودنی پڑے گی۔ اوپر سے کیچڑ دلدل اور پھر یہ انہونی۔ ایسا تو جی کبھی نہیں ہوا مجھے پینتیس سال ہو گئے ہیں اس کام میں۔ پہلی بار ایک مردے کے لیے اتنا خوار ہونا پڑا ہے۔ میں تو کہوں جی یہ دنیا پھٹنے کو ہو رہی ہے سڑک پر نکل جاؤ سر ہی سر۔ سوچا تھا قبرستان تو ویران ہوتے ہیں۔ اب تو وہاں بھی کال پڑ گیا ہے جگہ کا اتنی آبادی اوپر نہیں جتنی زمین کے نیچے ہو گئی ہے۔ جی اللہ کی پناہ۔ پتا نہیں ہمیں جگہ ملتی بھی ہے یا اس دن چیل کووؤں کی دعوت ہو گی۔''

''ہاں امام دین! سچ کہتا ہے تو اور یہ حدیث یونہی تو پوری نہیں ہوئی کہ ایک ایک قبر سے ستر ستر مردے نکلیں گے وہی ہو رہا ہے۔'' چھوٹی خالہ کو امام دین کی بات پر یقین آ گیا۔

''میں تو کہوں جی یہ سائنس دان اتنے کام جو کرتے ہیں اس زمین پر جگہ کی تنگی کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے اتنا آسمان فالتو پڑا ہے۔'' امام دین نے لالچی نظروں سے اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔

''اے کر تو رہے ہیں کبھی چاند پر منہ ماری کرتے ہیں کبھی مریخ پر۔ پر وہاں کی مخلوق بھی بڑی سیانی ہے۔ اس نے بھی ہوا پانی اپنے قبضے میں کر رکھا ہے۔ یہ جاتے ہیں اپنا سا منہ لے کر آ جاتے ہیں۔'' چھوٹی خالہ کی سائنسی معلومات بڑی وسیع تھیں۔

''پر آسمان پر دنیا بسانے کے باوجود مردے تو زمین میں ہی دفنانے پڑیں گے ورنہ تو آسمان سے ٹپاٹپ گریں گے۔'' امام دین کی سوئی قبرستان میں اٹکی ہوئی تھی اس کی اس نئی پریشانی پر عصمی کو ہنسی آ گئی۔

''ہاں واقعی آبادی کافی ہو گئی ہے۔'' خالہ امی نے بھی ان کی تائید کی۔

''لو کل بتا رہے تھے ٹی وی میں کہ سولہ آبادی چودہ کروڑ سے بڑھ گئی ہے میں تو یہ

سن کر ہی ہول رہی تھی۔ تم نے نئی خبر سنا دی کہ قبرستان میں بھی جگہ نہیں رہی۔ اب بچارے انسان جائیں تو جائیں کہاں نہ زمین کے اوپر گنجائش نہ زمین کے نیچے۔''

وہ اس دن سمجھ رہی تھی کہ خالہ تسبیح پڑھ رہی ہیں وہ تو خبریں سن رہی تھیں۔ واقعی تسبیح کا یہ فائدہ ضرور ہوتا ہے۔ کہ ایٹ اے ٹائم (ایک ہی وقت میں) تین چار نسیں کام کر رہی ہوتی ہیں۔

''تو قبرستان کا احاطہ بڑھوا دیں میونسپل والے۔'' خالہ امی نے تجویز پیش کی۔

''وہ کہاں سے بڑھوا دیں دونوں طرف تو سڑکیں ہیں ایک طرف چھوٹی نہر اور چوتھی اطراف میں محکمہ جنگلات کے افسران کی کوٹھیاں ہیں۔ جگہ اور کہاں سے مل سکتی ہے اب تو اسی احاطے میں گزارہ کرنا پڑے گا۔'' امام دین نے تینوں کی رہی سہی امید بھی ختم کر دی۔

اس کے بعد تینوں اپنی اپنی جگہ سوچ میں گم ہو گئے کہ جب ہمارا وقت آئے گا جگہ ملے گی یا نہیں اور اچھا موسم تو ضروری ہے کم از کم گورکن کو اگر تین چار قبریں کھودنی پڑیں تو وہ مردے کو تو کوسنے نہ دے۔

اور اس روز عصمی کو پورا یقین ہو گیا کہ آبادی حد سے تجاوز کر گئی ہے، حکومت نے اس مقصد کے لیے کروڑوں روپے لگائے اور نتائج نکالے لیکن عصمی کو یقین نہ آیا اور آج امام دین کی بات سے اسے صورت حال کی سنگینی کا اندازہ ہو گیا اور اس خبر پر یقین کرنے کی ایک اور وجہ بھی تھی، وہ گھر میں ہونے والے ایک نئے شخص کا اضافہ تھا جو اس خبر کے سچ ہونے کا ٹھوس ثبوت تھا۔



رات بھر دھیمے دھیمے سروں میں بارش برستی رہی۔ سرسراتی ہوا کے ساتھ بوندوں کی مدھم آہٹ جیسے کوئی رات کے سناٹے میں احتیاط سے زمین پر قدم دھر رہا ہو اور پھر بھی اس کے دل کی بے چینی بڑھتی گئی لوگوں کو ساون کی بارشیں بے چین کرتی ہیں۔ اسے نومبر، دسمبر کی بارشیں نہیں سونے دیتی تھیں۔ اگر رات بھر بارش ہوتی رہتی۔ وہ رات بھر رت جگا مناتی تھی دل چاہتا کہ اٹھ کر باہر جائے اور قطرہ قطرہ گرتی اداس بوندوں کو اپنے اندر سمو لے یا پھر خود ان قطروں کا حصہ بن جائے۔ پتا نہیں سردیوں کی بارش اسے کیوں اپنی طرف کھینچتی تھی اگر

خالہ امی کا ڈر نہ ہوتا تو شاید سارا وقت منڈیر پر بالکونی میں ہی گزار دیتی۔ خالہ امی عشاء کے بعد سارے وظائف بلکہ مزید اضافے کے ساتھ کر چکی تھیں۔ امام دین کی خوفناک باتوں نے انہیں خضوع و خشوع سے عبادت کرنے پر مجبور کر دیا تھا اب وہ دو دو چار بار کروٹیں بدلنے کے بعد غافل ہو چکی تھیں۔

مگر عصمی جاگ رہی تھی اور چپکے چپکے ہونے والی بارش کی موسیقی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ شاید آدھی رات سے زیادہ گزر گئی تھی۔ جب اس پر غنودگی چھانے لگی تھی کہ اچانک نیچے کی منزل میں پلنگ گھسیٹنے کی آواز آئی۔ پھر شاید لحافوں والی پیٹی کا ڈھکن زور سے بند کیا گیا کسی کے بولنے کی آواز بھی آ رہی تھی پہلے اس کا دل چاہا اٹھ کر دیکھے کہ نیچے کیا ہو رہا ہے لیکن پھر اس نے یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ خالہ امی کی آنکھ تو پتے کی آہٹ سے کھل جاتی تھی پھر تھوڑی دیر بعد وہ آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ ہر طرف خاموشی چھا گئی تھی۔ صرف بوندوں کی آہٹ تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ سو گئی۔

صبح حسب عادت خالہ امی کی نماز کے وقت آوازیں اس کے کانوں تک پہنچ ہی نہ سکیں وہ لحاف میں سر منہ لپیٹے سوئی رہی، جب اس کی آنکھ کھلی تو دن نکل چکا تھا۔ لیکن بادل ویسے ہی سر پر کھڑے تھے اور ہر طرف دھند کا ایک غبار پھیلا ہوا تھا۔ وہ کتنی دیر سستی سے بستر پر پڑی اٹھنے کے بارے میں سوچتی رہی۔

"لگتا ہے پھر بارش ہونے والی ہے۔" اس نے کھڑکی کے ادھ کھلے پٹ سے باہر دیکھتے ہوئے سوچا "مزہ جائے گا لیکن بارش کا مزہ بھی رات کو ہی ہے۔" رات سے اسے یاد آیا کہ نیچے کی منزل میں رات کو شور ہوا تھا۔

"جھگڑا ہوا ہوگا۔" اس نے خود ہی قیاس کیا لیکن وہ تو نیچے اپنے بیڈ روم میں سوتا ہے پھر اس نے کچھ دیر سوچا پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"اوہ بڑی سردی ہے۔" لحاف سے ذرا باہر نکلتے ہی اس نے ہاتھ آپس میں رگڑے۔

"ابھی تو لحاف ہی میں رہنا چاہیے۔" اس سے پہلے کہ وہ اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہناتی خالہ امی نے کمرے میں داخل ہوتے ہی شاید اس کے ارادے کو بھانپ لیا۔

"سو جاؤ بی رانی پھر سو جاؤ، ابھی دن کہاں نکلا ہے۔ کاہے کو اتنی جلدی اٹھ کر منہ کا مزہ خراب کرتی ہو۔" وہ کھسیانی ہو گئی اور سویٹر پہننے لگی۔

"خالہ امی! اٹھ تو گئی ہوں۔" شال اوڑھتے ہوئے وہ ان سے کنی کترا کر باہر نکل گئی اور سیدھی منڈیر کی طرف گئی، جہاں سے نیچے کی دونوں منزلوں کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا سب سے نیچے والی اسٹوری میں تو آمنے سامنے تین تین کمرے تھے درمیان میں بڑا سا صحن اور ایک سائیڈ کچن بنا ہوا تھا جبکہ دوسری منزل پر سامنے دو کمرے تھے اور ان کے کمروں کی چھت کے نیچے بڑا سا برآمدہ تھا۔

عصمی کا سارے دن میں دلچسپ مشغلہ اسی منڈیر پر کھڑے ہو کر یا تو نیچے کا نظارہ کرتا یا پھر ارد گرد کی چھتوں کا جائزہ لینا آسمان کی وسعتوں کو ناپنا، اڑتے ہوئے پرندوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا یا پھر رنگ برنگی ڈولتی لہراتی پتنگوں کو رشک سے دیکھنا۔

اور ان میں سے ہر ایک مشغلہ دونوں خالاؤں کے نزدیک انتہائی بیہودہ اور واہیات تھا۔ کہ یہ شریف لڑکیوں کو زیب نہیں دیتا کہ وہ ارد گرد کی چھتوں کو تاکتی پھریں یا منہ اٹھائے آسمان کو دیکھتی رہیں اور نیچے دیکھنا تو اخلاق سے گری ہوئی انتہائی گھٹیا حرکت تھی۔ کئی بار وہ اس حرکت پر چھوٹی خالہ سے بے بھاؤ کی سن چکی تھی۔ وہ انتہائی انہماک سے نیچے والوں کے مشاغل کا جائزہ لے رہی ہوتی جب چھوٹی خالہ اچانک چنگھاڑنے لگتیں۔

"اے بی! میں کہتی ہوں نیچے کیا بندر کا تماشا ہو رہا ہے جو ہونقوں کی طرح منہ کھولے دیدے پھاڑے دیکھتی جا رہی ہو۔ خدا جانے یہ لڑکی ہے یا ہمارے اعمالوں کی سزا۔ خدا نے ایک اوپر کی آنکھ بنا چھوڑا ہے اسے ہمارے لیے، کوئی کام، کوئی حرکت اس خدائی خوار سے چھپی نہیں رہ سکتی۔ اے فاطمہ آپا! میں کہتی ہوں پنہ ڈالو اس کو۔" وہ خالہ امی کو مخاطب کر کے کہتیں "اگلے گھر جائے گی تو یونہی دیدے پھاڑ پھاڑ کر سسرال والوں کی کن سوئیاں لیتی پھرے گی اگلے دوسرے روز چوٹی پکڑ کر باہر کریں گے۔ سنبھالو اس جانگلوں کو۔"

ان کی پھٹی ہوئی آواز خالہ امی کے سوا ارد گرد کے سارے گھر سنتے اور خالہ امی بے چاری بھلا کیسے سنتیں ایک تو ان کی قوت سماعت خاصی کمزور ہو چکی تھی دوسرے وہ ہمیشہ کچن میں پائی جاتی تھیں اور اس میں بھی عصمی کا کمال تھا کہ وہ کچن میں جاتی نہیں تھی تو خالہ امی بے

چاری کیسے فارغ ہوتیں جو ہو بھی جاتیں تو وہ منڈیر کی طرف کم ہی آتی تھیں۔ اور عصمی کی چھوٹی خالہ کی یہ پھنکار سن کر کان کھجاتی نظریں گھما کر ادھر ادھر دیکھتی کہ کہیں خالہ امی نے سن تو نہیں لیا پھر ذرا سستی سے ٹہلتی ہوئی منڈیر پر سے ہٹ جاتی۔

لیکن چھت کی کوئی ایک دیوار تو نہیں تھی کہ اسے وہاں سے ہٹنا ہو تو وہ اندر جا کر آرام کر لیتی۔ وہ گلی کی طرف والی دیوار کی طرف ہو جاتی وہ دیوار خاصی اونچی تھی البتہ اس کی سیمنٹ کی جالیوں میں سے نیچے کا منظر واضح طور پر نظر آتا تھا وہاں کھڑی ہو کر آتی جاتی اکا دکا سائیکلوں اور موٹر سائیکلوں کو دیکھنے لگ جاتی۔ چھوٹی خالہ نے اس کے بہت سے نام رکھ رکھے تھے، خبطی، دیوانی، کھسکی ہوئی، عقل سے پیدل عصمی۔ مگر وہ بھی کسی چکنی مٹی سے بنی تھی ایسے سنتی جیسے یہ خطاب وہ کسی اور کو دے رہی ہوں اور خالہ امی کو اس کے ان دلچسپ مشاغل کا علم تب ہوتا جب ان کی چھوٹی خالہ سے بالمشافہ ملاقات ہوتی۔ وہ عصمی کو گھورتیں، چھوٹی خالہ کے سامنے اسے ڈانٹتیں اور وہ سر جھکا کر سب کچھ سن لیتی تو چھوٹی خالہ جل کر اسے مسکینی اور گھنی کے القاب سے نواز کر نیچے اتر جاتیں تو اسے حیرت ہوتی کہ اب تو اس نے کچھ نہیں کیا پھر چھوٹی خالہ اس سے کیوں ناراض ہو گئیں۔

پہلے پہل وہ چھوٹی خالہ کے اس کٹھور رویے کے بارے میں سوچ سوچ کر کڑھا کرتی تھی بلکہ کبھی کبھار ایک آدھ آنسو بھی بھولے سے آنکھ میں آ جاتا تھا لیکن اب اس نے اس پیچیدہ مسئلے کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔

اس کے نزدیک ان دل دکھانے والی باتوں سے زیادہ دلکشی تو فطرت میں تھی۔ سرسبز درخت اور ان کی اونچی اونچی شاخوں پر بنے چڑیوں کے گھونسلے، خالہ امی کے گملوں میں گلاب، موتیے اور لیموں کے پودوں سے آتی مسحور کن خوشبو، سرمئی نیلا سفید سلیٹی روشنی دھوپ بھری دوپہریں، روئی کے گالوں سے تیرتے بادل اور کالی سیاہ گھٹائیں ٹھنڈی ہوائیں۔ آسمان پر اڑتے پرندے اور ان کی چہچہاہٹیں اور پھر ان سب سے بڑھ کر بارش!

اتنی اچھی باتوں کے درمیان اسے چھوٹی خالہ کی تلخ باتوں پر سوچنے کا موقع کم ہی ملتا تھا۔ وہ شال کو اپنے شانوں کے گرد اچھی طرح لپیٹ کر مشتاق انداز میں منڈیر کی طرف بڑھی۔ سب سے نیچے تو منظر پرسکون تھا۔ چھوٹی خالہ، چچا فرید کو بھیج کر اب ان کا بچا کھچا سمیٹنے

کی فکر میں ہوں گی۔ وہ سب کا بچا کھچا اسی طرح صاف کرتی تھیں کہ ضائع کرنے سے رزق کی بے ادبی ہوتی ہے اس لیے وہ اسے بڑے ادب و احترام سے اپنے معدے میں انڈیل لیتی تھیں پھر اس کے بعد بڑے اہتمام سے اپنے حصے کا کھانا کھاتی تھیں۔ عصمی ان کے معدے کو ڈسٹ بن کہا کرتی تھی جس میں وہ سب الم غلم ٹھونس لیتی تھیں آج کل تو ان کا معدہ شکر کر رہا ہوگا کہ رخشی اور جگنو ادھر نہیں تھے۔

دوسری منزل کے سامنے والے کمرے کا دروازہ کھلا تھا اندر شاید ساٹھ کا بلب جل رہا تھا۔ اس نے دلچسپی سے ذرا آگے ہو کر اندر تک دیکھنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ کچھ دیر ایسے ہی گزر گئی وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اوس سے بھیگی ہوئی ہوا اس کے چہرے سے ٹکرائی تو اسے کچھ سردی کا احساس ہوا گیلی منڈیر پر رکھے اس کے ہاتھ سرد ہو گئے تو وہ کہنیاں ٹکا کر آگے کی طرف جھک گئی کمرے کے کھلے دروازے کا تجسس اسے روکے ہوئے تھا۔

اسی لمحے سے کوئی باہر نکلا "اتنا لمبا قد؟" اس نے حیرت سے سوچا لمبے قد کا وہ کوئی اجنبی نوجوان تھا، ناک نقشہ اچھا تھا اور آنکھوں کے حجم کا پتا بھی اسے فوراً ہی چل گیا جب اس نے عصمی کی موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے اوپر دیکھا۔ بڑی بڑی سرخ آنکھیں عصمی کو دیکھ کر شاید حیران ہوئی تھیں۔ وہ ذرا سا جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے بھی زور سے سوں سوں کرتے ہوئے دوبارہ اندر کا رخ کیا۔ شاید اسے فلو ہو رہا تھا۔

"عصمی!" خالہ امی کی آواز پر وہ پلٹی۔ "اچھا اضافہ ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے باتھ روم کا رخ کیا۔ خالہ امی شاید سوجی کا حلوہ پکا رہی تھیں، ساری فضا میں سوجی بھونے کی سوندھی سوندھی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے جلدی جلدی ٹھنڈے یخ پانی کے دو چھپکے منہ پر مارے اور تولیے سے منہ رگڑتی ہوئی کچن کی طرف بڑھی۔

"خالہ امی! حلوہ بنایا ہے واہ!" وہ خوش ہو کر اندر داخل ہوتے ہوئے بولی۔

"تولیہ بھی اپنے ساتھ اٹھا لائی ہو۔" خالہ امی نے ناگواری سے اس کے ہاتھ میں پڑے تولیے کو دیکھا تو اس نے شرمندہ ہوتے ہوئے بغیر تولیہ کچن کے دروازے پر ڈال دیا۔

"خالہ امی! یہ نیچے کون آیا ہے؟" گرم گرم حلوہ حلق میں اتارتے ہوئے اس نے
.. ری انداز میں پوچھا۔

"جمیلہ کا بھتیجا ہے۔ ادھر لڑکوں کے کالج میں اس کا ٹرانسفر ہوا ہے۔" خالہ امی نے حلوہ اپنی پلیٹ میں نکالتے ہوئے کہا۔

"تو کیا اب یہ یہیں رہیں گے؟" اس نے ذرا ہاتھ روک کر کہا۔

"شاید۔" خالہ امی لاپروائی سے کہا تو اس نے بھی اپنی توجہ حلوے کی طرف کر لی۔ "اس وقت حلوہ زیادہ توجہ کا طالب ہے۔" اس نے سوچا۔



شام تک سردی میں اضافہ ہو چکا تھا۔ بادل اسی طرح سر پر کھڑے تھے جیسے کوئی قرض خواہ کسی قرض دار کے دروازے پر اڑ کر کھڑا ہو جائے۔ بادل بھی اسی موڈ میں لگتے تھے اور ایسے موسم میں تو عصمی کی جان تھی۔ وہ بہت خوش تھی مگر اس کی خوشی کا بھی اپنا ہی انداز تھا جو محسوس ہی نہ ہونے دیتی کہ وہ خوش ہے جیسے سردیوں کی بارش چپ چاپ زمین کے سینے میں سماتی ہے۔ اسی طرح خوشی کا احساس اسے مزید خاموش کر دیتا وہ خود ہی اس احساس سے محظوظ ہوتی۔ اس کی خوش مزاجی کا اندازہ خالہ امی کو اس بات سے ہوا کہ شام کو اس نے اپنی مرضی سے پکوڑے بنائے، چائے بنائی بلکہ رات کو آلو مٹر کی بھجیا کے لیے مٹر بھی بن کے چھیل دیے اور مٹر خالہ کے حوالے کر کے وہ پھر باہر آ گئی اور منڈیر سے نیچے جھانکنے لگی دوسری منزل کے پہلے کمرے کا بلب روشن تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ لمبا تاڑ سا مہمان اندر موجود ہے۔ صبح وہ دو تین گھنٹوں کے لیے سوٹ بوٹ پہن کر باہر گیا تھا۔ ہاتھ میں رومال تھا جس کو ناک کے آگے رکھ وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے دو تین بار زور سے چھینکا تھا۔

"ہا!" اس نے فضا میں گہرا سانس لیا۔ مسالے دار پکوان کی خوشبو نیچے والی منزل سے آ رہی تھی۔ چھوٹی خالہ کچن میں آج بہت مصروف تھی۔ خالہ امی نے بتایا تھا کہ شاید آج رخشی اور جگنو آ ئیں۔

ساگ تو انہوں نے لپیٹ کر رکھ دیا ہو گا۔ جگنو کو اس اسپیشل فوڈ، سے چڑ تھی اور چھوٹی خالہ اس کی موجودگی میں ایسے کھانوں سے بالکل بے نیاز ہو جایا کرتی تھیں پھر تو بس مرغ بریانی، روسٹ اور کڑاہی وغیرہ ہی بنتے تھے۔ ٹی وی لاؤنج سے جگنو کے کمرے میں شفٹ ہو جاتا تھا لیکن جتنی بلند آواز میں وہ ٹی وی لگاتا تھا لاؤنج تو کیا باہر سڑک سے گزرنے

والوں کو بھی اندازہ ہو جاتا کہ آج کل اس گھر میں کوئی بے چین روح اتری ہوئی ہے۔ وی سی آر اس نے اپنے کمرے میں رکھا ہوا تھا اور چچا فرید کی بصارت اور قوت سماعت ان دنوں بالکل بے کار ہو جاتی تھیں میوزک کو بھی یوں آرام سے سنتے جیسے وہ قصیدہ بردہ شریف کو جگنو کے آنے سے پہلے سنتے تھے۔

"شاید رخشی بھی آئے۔" وہ نیچے دیکھتی ہوئی سوچ رہی تھی۔ اسی وقت بوندیں پڑنی شروع ہو گئیں۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا تو دو تین ٹھنڈے قطرے اس کے چہرے پر آ گرے اسے عجیب سی خوشی ہوئی اور اس نے ہتھیلیاں آگے کی طرف پھیلا دیں دو تین بوندیں ان پر آ گریں۔

"عصمی!" خالہ امی کی تیز آواز آئی "پاگل ہو گئی ہو۔ فلو ہو جائے گا اندر آ جاؤ۔" تو اس نے جانے سے پہلے نیچے کی طرف یونہی عادتاً دیکھا تو وہ رات والا مہمان اپنے دروازے کی چوکھٹ پر کھڑا حیران نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

واقعی اس کے لیے تو حیرانی کی بات تھی جو صبح سے سوں سوں کر رہا تھا اور وہ مزے سے بارش میں کھڑی تھی۔ وہ فوراً کچن کی طرف پلٹی۔

"خالہ امی! اتنا اچھا موسم ہو رہا ہے کیا بتاؤں۔ میرا تو جی چاہتا ہے، آج باہر ہی کھڑی رہوں۔" وہ ان کے پاس زمین پر پڑی چوکی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"تمہارے تو پرزے ویسے ہی ڈھیلے ہیں۔ سچ کہتی ہے جمیلہ۔" خالہ نے ہنڈیا کے نیچے چولہے کی آنچ مدھم کی۔

"خالہ امی! اتنا شاندار موسم ہے، آپ کا جی نہیں چاہتا چھت پر کھڑے ہونے کو۔" وہ واقعی خوش تھی۔

"وقت وقت کی بات ہوتی ہے بچہ! کبھی ہم پر بھی ایسا ہی وقت تھا۔ جب پہروں بارش میں نہاتے تھے پھر بھی جی نہیں بھرتا تھا۔"

"نہیں خالہ امی! نہانا نہیں چاہیے بس بارش کو دیکھتے رہنا چاہیے نہانے سے تو بارش کا چارم ختم ہو جاتا ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے یہ بارش کوئی جادو ہو میں اسے چھوؤں گی تو یہ جادو ختم ہو جائے گا بس اسے آنکھوں سے محسوس کرنا چاہیے۔" وہ دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے

بولی۔

''تم تو بالکل بیوقوف ہو۔ اچھا اب یہ باتیں چھوڑو اور مجھے بتاؤ تم نے کچھ کرنا بھی ہے یا یونہی منڈیر پر پھرتے رہنا ہے۔'' انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیا۔ مجھے کیا کرنا ہے بھلا؟'' وہ کچھ حیرانی سے بولی۔

''تمہیں کچھ نہیں کرنا اس زندگی میں۔ یونہی بے کار گزار دو گی۔''

''میں نے آپ سے کہا تو ہے کہ مجھے بھی رمشی کے کالج میں داخل کروا دیں انٹر میں۔'' وہ آرام سے بولی۔

''رمشی کے اماں باوا اسے شہر کے اتنے اچھے کالج میں پڑھا سکتے ہیں پھر ہاسٹل کا خرچ۔ عصمی! تمہیں معلوم ہے میں اتنا خرچ نہیں اٹھا سکتی۔'' خالہ امی نے کئی بار کی بتائی ہوئی مجبوری دہرائی۔

''تو پھر رہنے دیں اور کیا کرنا ہے میں نے۔'' وہ لاپروائی سے بولی ''یا اگر ایسے ہو سکتا ہے کہ ہمارا کوئی رشتے دار لاہور میں ہوتا تو میں کالج میں داخلہ لے لیتی اور ہاسٹل کا خرچ بچ جاتا۔'' اس نے تجویز پیش کی۔

''اول تو ایسا کوئی ہے نہیں وہاں اور اگر ہوتا بھی تو میں تمہیں کسی کے گھر میں نہ چھوڑتی۔'' وہ قطعیت سے بولیں۔

''خالہ امی! میں لاہور میں پیدا ہوئی تھیں نا؟'' کئی بار کا پوچھا ہوا سوال اس نے پھر پوچھا۔

''ہوں۔'' بس ان ہی سوالوں پر خالہ امی کے پاس الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو جاتا ہے اس نے کڑھ کر سوچا۔

''اچھا خالہ امی! ایک بات تو بتائیں۔'' وہ ذرا آگے ہو کر بولی ''یہ چولہے کی آنچ تو تیز کریں، مجھے تو سردی لگنے لگی ہے۔'' اس نے ہاتھ رگڑتے ہوئے کہا۔

''گیلی دیوار سے لگو گی تو سردی تو لگے گی۔'' انہوں نے بڑبڑاتے ہوئے ہنڈیا نیچے اتار دی اور آنچ تیز کر دی۔

''آپ اور امی تو ہوئیں دونوں بہنیں اور ماموں تو میرے کوئی ہیں نہیں ہیں نا؟''

اس نے ان کی تاکید چاہی انہوں نے سر ہلا دیا۔

''کیا میرے ابو کے بھی کوئی بہن بھائی نہیں تھے؟''

''بتایا تو ہے تمہارے ایک تایا اور بس۔'' خالہ کا انداز کچھ بیزار سا ہو گیا۔

''تایا اور بس۔'' اس نے منہ میں دہرایا۔ ''وہی تو پوچھتی ہوں یہ تایا محترم کہاں پائے جاتے ہیں۔'' وہ براہ راست ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

''لاہور میں۔'' خالہ امی نے ٹھنڈے لہجے میں جواب دیا۔

''پھر مجھے لاہور میں داخل کرا دیں کسی کالج میں۔ ان کے پاس رہ لوں گی۔'' اس نے چٹکی بجاتے ہی جیسے ان کا مسئلہ حل کر دیا۔

''اور وہ تمہارے راستے میں آنکھیں بچھائے بیٹھے ہیں۔ ہے نا۔'' خالہ امی طنز سے بولیں۔

''ہزار بار بتایا ہے عصمی! کہ وہ لوگ ذرا اور مزاج اور طور طریقوں کے ہیں۔ ہم جیسوں کو تو۔'' وہ چپ کر گئیں۔

''کیا ہم جیسوں کو۔ میں ان کی بھتیجی ہوں پھر وہ مجھے اپنے پاس کیوں نہیں رکھیں گے آپ کی میں بھانجی ہوں۔ آپ نے بھی تو اتنے عرصے سے مجھے پناہ دے رکھی ہے۔''

''میری بات اور ہے خدا نے اولاد نہیں دی تو تمہیں والدین سے محروم کر کے میری یہ کمی دور کر دی جبکہ تمہارے تایا کے ساتھ ایسی کوئی مجبوری نہیں آج کل لوگ سروں کو سلامیاں ڈالتے ہیں جب سر ہی سلامت نہ ہوں تو دید مروت کس بات کی اس خیال کو دل سے نکال دو اور کالج کا خیال بھی۔ میری اتنی سکت نہیں ہے، تمہارے خالو کی پنشن نے بھرم رکھا ہوا ہے۔ ورنہ یہ دال دلیہ بھی چلانا مشکل تھا۔ اللہ کا شکر ہے۔ چھت اپنی ہے۔'' ان کی بات پر وہ چپ ہو گئی۔

''روٹی ڈالوں، کھانا کھا لو اب۔'' اسے چپ دیکھ کر وہ کچھ دیر بعد بولیں۔

''نہیں ابھی بھوک نہیں ہے۔'' وہ کچھ بجھی ہوئی آواز میں بولی۔ باہر بارش تیز ہو گئی تھی وہ کان لگا کر ٹپ ٹپ قطروں کو دھیان سے سننے لگی۔

''کھا لو رات زیادہ ہو جائے گی۔ میں نے پھر نماز بھی پڑھنی ہے، بارش بھی تیز ہو

گئی ہے۔" خالہ امی نے پھر کہا۔

"نیچے شور ہو رہا ہے میرا خیال ہے یہ جگنو کی آواز ہے۔" اس نے خالہ امی کو نیچے سے آتی آوازوں کی طرف متوجہ کرنا چاہا۔

"ہاں آ گئے ہوں گے۔ شام سے جمیلہ تیاریوں میں لگی ہوئی تھی۔" وہ لاپروائی سے بولیں۔

"ڈالوں پھر روٹی؟"

"ہاں ڈال لیں۔" وہ اکتاہٹ سے بولی تو انہوں نے پرات گھسیٹ کر تین پیڑے بنائے اور توا چولہے پر رکھا۔

"ہاں عصمی کی بچی! یہاں چھپ کر بیٹھی ہو، میں کب سے تمہارا نیچے انتظار کر رہی تھی۔"

"سلام تائی اماں!" رخشی اندر داخل ہوتے ہوئے عصمی کے پاس پڑی ہوئی دوسری چوکی پر بیٹھتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا۔

"وعلیکم السلام کب آئی ہو رخشی! جگنو بھی آیا ہے۔" خالہ امی نے روٹی سینکتے ہوئے کہا۔

"جی تائی اماں اور بھلا میں نے اکیلے آنا تھا۔ یہاں تو اچھی خاصی سردی ہو گئی ہے لاہور والے تو ابھی لان اور کاٹن پہنے پھر رہے ہیں اور یہاں جرسیاں بھی نکل آئی ہیں" اس نے عصمی کو جرسی میں سکڑتے دیکھ کر کہا۔ "ہم تو پچھلی بار گرم کپڑے بھی نہیں لے کر گئے تھے۔ آتے وقت مارے سردی کے ہم دونوں کا برا حال ہو گیا اور ادھر نہر کے پاس سے جب رکشہ گزر رہا تھا ہمارے تو دانت ہی بج اٹھے۔"

وہ بلا تکان بولتی چلی گئی۔

"ویسے اس دفعہ بارشیں کچھ جلدی شروع نہیں ہو گئیں۔ کیا پکایا ہے تائی اماں آپ نے؟" اس نے ان کا جواب سنے بغیر آگے بڑھ کر ہنڈیا کا ڈھکن اٹھا کر اس میں جھانکا۔

"اوں آلو مٹر۔" "آؤ عصمی! نیچے چلتے ہیں امی نے بڑے مزے کی مٹن کڑاہی اور چکن بریانی بنائی ہے۔ یہ جگنو بھائی کی وجہ سے ہمارے بھی عیش ہو جاتے ہیں۔" وہ اس کا ہاتھ

پکڑ کر اٹھتے ہوئے بولی۔

"تمہیں تو پتا ہے کڑاہی تو مجھے پسند ہی نہیں اور چاول تو مجھ سے رات کو کھائے ہی نہیں جاتے تم چلو، میں ابھی کھانا کھا کر نیچے آتی ہوں۔" اس نے بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔

"یار! بڑی بدذوق ہو، میرا خیال ہے تم روئے زمین پر واحد مخلوق ہو گی جسے مٹن کڑاہی پسند نہیں۔ خیر آ جانا یاد سے پھر خوب باتیں کریں گے۔ مجھے تو بڑی بھوک لگی ہوئی ہے۔ میں کھانا لگا لگایا چھوڑ کر آئی ہوں۔" وہ جانے کے لیے مڑی۔

اس کے ناک چڑھانے پر خالہ امی نے بھی کھانے کے لیے اصرار نہیں کیا۔

"اور ہاں عصمی! یہ ڈائنو سار کہاں سے درآمد کیا ہے؟" وہ جاتے جاتے رک کر نیچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"کون؟" عصمی نے حیرت سے پوچھا۔

"تائی اماں! سیڑھیوں کا بلب فیوز ہو گیا ہے۔ اتنا اندھیرا تھا وہ جو کمرے سے نکلا تو میری تو چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔" وہ شاید رات والے مہمان کا ذکر کر رہی تھی۔

"تمہارے ماموں کا بیٹا ہے نوروز۔" خالہ امی نے تین پھلکے اتار کر توا نیچے اتار لیا۔

"ماموں کا بیٹا۔" وہ کچھ اچنبھے سے بولی "ماموں تو کبھی ملے نہیں اور یہ حضرت کہاں سے ٹپک پڑے۔" وہ چوکھٹ سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔

"خالہ امی! یہ کیا نام ہوا نوروز۔ دس روز یا بارہ روز کیوں نہیں؟" عصمی بولی۔

"نوروز کا مطلب ہے۔ موسم بہار کا پہلا دن۔ ہے نا تائی اماں۔" رخشی نے اپنی علمیت جھاڑتے ہوئے خالہ امی سے تصدیق چاہی۔

"اتنا تو مجھے بھی پتا ہے اس کا مطلب، ایران کے موسم میں پڑھا تھا لیکن یہ نام تو پہلی بار سنا ہے۔" عصمی منہ بنا کر بولی۔

"نوروز کی ماں ایرانی تھی اور تمہارے ماموں ادھر بزنس وغیرہ کے سلسلے میں جایا کرتے تھے۔ نوروز کے نانا سے ان کا ملنا جلنا ہوا تو انہیں رابعہ پسند آ گئیں۔ دونوں نے شادی کر لی خاصے مالدار تھے نوروز کے نانا دونوں شادی کے کچھ عرصہ بعد وہیں رہے وہیں نوروز پیدا ہوا، اس کے نانا ہی نے اسکا یہ نام رکھا تھا پھر نانا کے انتقال کے بعد یہ دونوں پاکستان

آ گئے اور رابعہ کو وراثت میں ملنے والی ساری جائیداد بیچ کر یہیں یہاں کسی کاروبار میں لگا دیا۔ بس ماں باپ کے نصیب میں ہی اس پودے کی بہار دیکھنا نہ تھا، چھوٹا ہی تھا کہ ماں باپ کا انتقال ہو گیا اور۔" خالہ امی نے ذرا تفصیل سے بتایا۔

"اچھا تائی اماں! سوری مجھے تو بڑی بھوک لگی ہوئی ہے۔ باقی معلومات بہاراں صبح سے لوں گی۔ اب اجازت دیں۔" کہہ کر وہ برستی بارش سے بچتی ہوئی غڑاپ سے باہر نکل گئی۔

"عجیب لڑکی ہے یہ بھی بے چین اور چلبلی۔" تائی اماں بڑبڑائیں "چلو تم تو کھانا شروع کرو۔" انہوں نے پلیٹ میں سالن نکال کر اس کے آگے کھسکایا "یا نیچے جانا ہے۔"

پتا نہیں وہ اس کی مرضی پوچھ رہی تھیں یا طنز کر رہی تھیں اس نے کچھ جواب نہ دیا اور رکابی سے روٹی اٹھا کا لقمہ توڑنے لگی۔



اگلی صبح بے حد چمکیلی اور روشن تھی۔ پچھلے تین چار دن کے ابر آلود موسم کا آسمان پر شائبہ تک نہ تھا۔ کھلا اور شفاف نیلا آسمان اور نرم گرم دھوپ کی مہربان کرنیں۔ رات تو وہ نیچے جا ہی نہ سکی تھی، کھانا کھاتے ہی وہ بستر میں جا گھسی تھی۔ پچھلے تین دن کی مسلسل بارش کی وجہ سے وہ صفائی بھی ڈھنگ سے نہ کر سکی تھی اس لیے آج صبح وہ ناشتہ کرتے ہی صفائی میں جت گئی لیکن اس سے پہلے اس نے منڈیر پہ کھڑے ہو کر نیچے ضرور جھانکا تھا، پہلی نظر اس کی نوروز ہی پر پڑی بے چارے کا قُولبا ہی ہو گیا۔ ڈاکو ساز" وہ خود ہی ہنس پڑی۔ "یہ رخشی نے اچھا نام رکھا ہے" وہ سلیپر بمشکل گھسیٹتے ہوئے چل رہا تھا چال سے لگ رہا تھا بخار بھی ہو گیا ہے۔ اس نے خود ہی اندازہ لگایا نیچے والے پورشن میں مکمل خاموشی تھی۔ رات کو بہت دیر تک باتیں ہوئی ہوں گی اس لیے رخشی اور جگنو تو ابھی تک سو رہے ہوں گے۔

"اگر سروے مکمل ہو گیا ہو تو عصمت بیگم منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ تناول فرمائیں۔"

خالہ امی کی طنز بھری پکار پر وہ بغیر شرمندہ ہوئے اٹھی اور باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔

ناشتے کے بعد اس نے صفائی شروع کر دی۔ خالہ امی نیچے چلی گئیں شاید جگنو سے ملنے۔

"یہ بھی عجیب چیز ہے شہر جا کر تو اس کے انداز ہی بدل گئے ہیں۔" عصمی کو تو اس

کے سامنے جاتے ہی گھبراہٹ ہوتی تھی حالانکہ وہ جانتی تھی کہ وہ یہ سب مذاق میں کہتا ہے۔ لیکن چھوٹی خالہ اسے یوں دیکھتیں کہ عصمی کو وہیں وہاں کھڑے ہونا محال ہو جاتا۔ اس لیے جگنو کی موجودگی میں وہ نیچے جانے سے گریز ہی کرتی تھی۔

"اچھا تو اب پردہ بھی کرنے لگی ہو بھائی سے، وہ رات سے تمہارا پوچھ رہا ہے اور میڈم نخرے دکھا رہی ہیں۔" رخشی آخری سیڑھی سے بولتی ہوئی اوپر آئی تو وہ مسکرا اٹھی۔

"نہیں میں بس کام ختم کر کے نیچے ہی آ رہی تھی۔" اس نے جھوٹ گھڑا۔

"چلو اب دھوپ میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں نیچے تو ابھی خاصی سردی ہے۔" اس نے برآمدے میں پڑی کرسی دھوپ میں گھسیٹی تو عصمی نے بھی اس کی تقلید میں کرسی گھسیٹ کر دھوپ میں رکھ لی۔

"چائے بناؤں تمہارے لیے؟" اس نے بیٹھنے سے پہلے پوچھا۔

"نہیں پی لوں گی اگر تم کہو تو۔"

"چلو بنا لاؤ پھر۔" اس نے بیٹھے بیٹھے سورج کے رخ سے کرسی ذرا ترچھی کی۔

عصمی کچن کی طرف چل پڑی۔

"رخشی! کتنے دن کی چھٹیاں ہیں تمہیں؟" اس نے چائے بناتے ہوئے کچن سے ہی آواز لگائی۔

"چھٹیاں کہاں؟" وہ منہ بنا کر بولی اور پھر اٹھ کر کچن کے دروازے میں آ کھڑی ہوئی۔

"بس پرسوں چلے جائیں گے آگے پھر دسمبر کی چھٹیاں آئیں گی۔ آج کل تو خاصی پڑھائی ہو رہی ہے۔ امی نے لکھا تھا کہ ابو کی طبیعت ٹھیک نہیں، انہیں کو دیکھنے آئے ہیں۔ ایک آج کی چھٹی ہے کل سنڈے ہے۔ کل شام کو یا پھر پرسوں صبح صبح نکل جائیں گے۔"

"بس ایک دن کے لیے؟" عصمی کچھ افسردگی سے بولی۔

"ہاں بھی مجبوری ہے۔ پڑھائی کوئی آسان بات نہیں ہے۔" رخشی نے چوکھٹ سے ٹیک لگائی۔

"اب تو سنا ہے یہاں بھی لڑکیوں کا انٹر کالج بن رہا ہے۔" عصمی نے چائے کے کپوں

میں ڈالی۔

''ارے چھوڑو، جیسا بھکھر یہ قصبہ نما شہر ہے ویسے ہی اس کے کالج۔'' رخشی منہ بنا کر بولی۔ ''پہلے یہ بوائز کالج کو تو ڈگری کا درجہ دے دیں پھر انٹر کالج بنائیں۔''

''چائے یہیں پیو گی یا باہر چلیں۔'' عصمی نے پوچھا۔

''باہر ہی چلتے ہیں۔'' وہ مڑتے ہوئے بولی تو عصمی بھی ٹرے اٹھا کر اس کے پیچھے ہی چل پڑی۔

''تمہیں تو کہا ہے ایڈمیشن لے لو۔ دو سال سے بے کار بیٹھی ہو آج کل کون سا زمانہ ہے۔ محض میٹرک کا۔'' وہ کرسی پر بیٹھ کر چائے کا مگ اٹھاتے ہوئے بولی۔

''ہاں کہا تو ہے خالہ امی سے دیکھو۔'' اس کا لہجہ کچھ اداس سا ہو گیا۔

''عصمی! رات امی ابو باتیں کر رہے تھے۔ تمہارے تایا تو کروڑ پتی ہیں لاہور کے سب سے پوش علاقے میں رہتے ہیں۔ تم کوشش کرو ان سے ملنے کی۔ یونہی چلی جاؤ کسی روز تائی اماں کے ساتھ۔'' رخشی کا انداز وہ اسے اچھا لگا نہ تجویز۔

''ہوں گے مجھے کیا۔؟'' وہ کندھے اچکا کر بولی۔ ''راہ وہ پکڑنی چاہیے جہاں چاہ ہو، انہیں میری خبر نہیں اور میں یونہی ان سے ملنے چل پڑوں چھوڑو۔'' اس نے مگ اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔

''ارے ہاں، یہ ڈائنو سار تو بڑی چیز ہے بھئی۔'' رخشی نے جلدی سے مگ ٹرے میں رکھا۔

''کیا مطلب؟''

''اپلائیڈ سائیکالوجی میں ایم ایس سی ہیں، سول سروس کا امتحان دے چکے ہیں لیکن عقل میں پورے لگتے ہیں۔'' اس نے کچھ افسوس زدہ انداز میں کہا اور مگ اٹھا کر چائے پینے لگی۔

''کیا مطلب۔''

''بھئی دیکھو نا اتنا ایجوکیٹڈ بندہ اور اس بھکھر سے انٹر کالج میں پڑھانے چل پڑے تو عقل کا پورا ہی ہوا نا۔ آج لوگ ایڈوانس شہروں کی طرف بڑھتے ہیں اور یہ اس گاؤں میں

آ بیٹھے ہیں۔ اور امی بتا رہی تھیں اپنی مرضی سے یہاں اپنا ٹرانسفر کرایا ہے۔'' رخشی نے ایک ہی صبح میں ساری ''معلومات بہاراں'' اکٹھی کر لی تھیں۔

''شاید ہوتے ہیں کچھ ایسے خبطی سے لوگ بھی۔'' عصمی نے یونہی کہا۔

''ہاں واقعی خبطی ہے جو اچھی خاصی انکم ٹیکس آفیسر کی نوکری کو لات مار کر لیکچری کرنے چلا آیا ہے۔'' وہ منہ بگاڑ کر بولی۔ عصمی چپ رہی۔

''تمہاری پڑھائی کیسی جا رہی ہے۔'' کچھ دیر بعد عصمی نے پوچھا۔

''سو سو۔'' وہ لاپروائی سے بولی ''پتا ہے عصمی وہ میری دوست ہے نا ہما جس کا میں نے تمہیں لاسٹ ٹائم بتایا تھا۔'' وہ ذرا آگے ہو کر بولی تو عصمی نے ذرا یاد کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اس کا کزن ہے شارق۔ اتنا ہینڈسم اور ڈیشنگ ہے کہ تمہیں کیا بتاؤں۔'' وہ بائیں آنکھ ذرا سی دبا کر بولی۔

''پتا ہے عصمی! وہ مجھے اچھا لگنے لگا ہے۔'' پتا نہیں اس کا چہرہ دھوپ کی تپش سے سرخ ہو چلا تھا یا اس بات کی وجہ سے عصمی ٹھیک سے اندازہ نہ لگا پائی۔

''وہ بھی مجھے پسند کرنے لگا ہے۔'' وہ پھر بولی ''پتا ہے میں دو بار اس کے ساتھ شیزان بھی گئی ہوں۔'' اس نے جیسے انکشاف کیا۔

''اکیلی!'' عصمی نے آنکھیں پھیلائی۔

''بے وقوف اس کے ساتھ۔ پھر اکیلی کیسے۔'' رخشی نے اسے بچوں کی طرح سمجھایا۔

''تمہیں ڈر نہیں لگا؟''

''ڈر کس بات کا۔'' وہ بے خوفی سے بولی ''ہاں پہلی بار تھوڑا لگا تھا دوسری بار بالکل نہیں۔ اس کی باتیں میں تمہیں کیا بتاؤں۔'' وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

''اور اگر جگنو بھائی دیکھ لیتے تو؟'' عصمی نے جیسے اسے جگانا چاہا۔

''تو کیا ہوتا، سو بہانے ہوتے ہیں کہ میری دوست بیمار ہے اس نے مجھے بلایا ہے ملنے جا رہی ہوں یا اس کے گھر کمبائن اسٹڈی کے لیے جا رہی ہوں یا اس کی سالگرہ میں جا رہی ہوں وغیرہ وغیرہ۔ اول تو ایسا ممکن ہی نہیں۔ جگنو بھائی کو اتنی فرصت کہاں کہ میری

نگرانیاں کرتے پھریں۔ ان کا خود سارا دن ان ہی چکروں میں گزرتا ہے مجھے جیسے علم نہیں۔"

اس کی بے خوف گفتگو اور جگنو کے چکروں کے بارے میں جان کر عصمی حیران رہ گئی۔ "پھر تو ٹھیک ہے جو خالہ امی مجھے پڑھنے وہاں نہیں بھیج رہیں۔" اس نے سوچا۔

"پتا ہے عصمی! وہ بی اے کر رہا ہے۔" چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ۔ تمہیں پتا ہے ان کی اسٹارٹ سیلری کتنی ہوتی ہے؟" اس نے حیران نظروں سے دیکھتی عصمی سے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے لاعلمی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"بیس تیس ہزار تک۔ دو سال رہ گئے ہیں اس کی تعلیم مکمل ہونے میں پھر تو۔"

اس نے کرسی سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

بچے روشنی سے اتنا ڈرتے کیوں ہیں، عصمی نے اس کی بند آنکھیں دیکھ کر سوچا۔

"اچھا تم دونوں یہاں بیٹھی۔ اکیلی اکیلی چائے اڑا رہی ہو اور مجھے نیچے اکڑنے کے لیے بٹھایا ہوا ہے۔" جگنو اوپر آتے ہی زوردار آواز میں بولا۔

"اینڈ ہاؤ آر یو دی ڈارلنگ آف نیچر۔" وہ بے دھڑک لہجے میں عصمی کے پاس آ کر بولا تو اس کی کانوں کی لوئیں تپ اٹھیں۔

"تمہارا سورج طلوع ہو گیا ہے؟" رُشی اس کی بے وقت آمد پر کچھ ناگواری سے بولی۔

"ہاں بھئی، میری مارننگ تو کسی کو دیکھتے ہی ہو گئی ہے۔" اس کی بے باک نگاہیں مسلسل عصمی کو فوکس کیے ہوئی تھیں۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"آپ کے لیے چائے بناؤں جگنو بھائی۔" اس نے وہاں سے نکلنا چاہا۔

"اگر تمہارا کوئی بھائی نہیں ہے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے کہ تم اٹھتے بیٹھتے اپنی اس محرومی کا بدلہ مجھ سے لو۔ ویسے بھی میرا نام شرجیل ہے یہ جگنو کیا ہوتا ہے۔" وہ کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھے باقاعدہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اسے کنفیوژ کیے جا رہا تھا۔

"اس میں اس بے چاری کا کیا قصور ہے جگنو بھائی! تائی اماں نے اس کی ٹریننگ ہی اس طرح کی ہے کہ شادی سے پہلے دنیا کا ہر شخص تمہارا بھائی ہے یعنی یونیورسل برادر ہوڈ (عالمی بھائی چارہ) کا عملی نمونہ۔ کیا بات ہے۔" رُشی نے ہنستے ہوئے بھائی کا ساتھ دیا۔

"یہ کتنی بور لڑکی ہے رُشی! میں تو سوچتا ہوں یہ زندہ پتا نہیں کیسے ہے۔ نہ اسے میوزک سے دلچسپی نہ موویز سے، نہ پڑھنے سے اور تو اور محبت سے بھی نہیں۔ قدرت نے جو اتنی فیاضی سے اسے یہ حسن کی دولت دی ہے یہ اسے برتنے اتنی ہی کنجوسی کا مظاہرہ کر رہی ہے اس گھٹن آلود ماحول میں رہ کر۔ میں تو کہتا ہوں مجھ سے محبت کر لو جیون میں رنگ بھر جائے گا۔" وہ چہرہ اس کے پاس کر کے ذرا خمار آلود آواز میں بولا تو عصمی گھبرا کر دو تین قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"چھوڑو بھائی! آپ بھی کس پتھر سے سر پھوڑ رہے ہیں۔" رُشی نے لاپروائی سے اپنے ناخنوں کو آنکھوں کے سامنے پھیلا کر دیکھا۔

"پھر تم کہتی ہو بھائی گھر چلے اب گھر میں اتنی بوریت ہو تو بندہ کیا گھر جائے گا۔ وہ دن یہاں اتنے روکھے پھیکے گزرتے ہیں جیسے کوئی عید کا دن روزے سے گزار دے۔" اس کی ذومعنی بات پر وہ جل کر رہ گئی۔ پتا نہیں وہاں کچھ پڑھتے ہیں دونوں بہن بھائی۔" اسے غصہ آ گیا۔

"یہاں سب سے زیادہ تکلیف دہ یہ چیز ہے۔" اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے عصمی کی طرف اشارہ کیا۔ "اتنا حسین چہرہ اور پتھر سا دل۔" وہ آہ بھر کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

اسی وقت خالہ امی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئیں تو عصمی کا سینے میں اٹکا ہوا سانس جیسے باہر نکلا، ایک ہی لمحے میں خالہ امی جیسے صورت حال کو سمجھ گئیں۔

بس فارغ کھڑی رہنا۔ کوئی کام کاج نہ کرنا تم سے اتنا نہ ہوا کہ ماں نیچے گئی ہوئی ہے تو کچھ چولہے کا ہی کر لوں مگر تمہارے اندر تو احساس نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں عصمی۔" خالہ امی اوپر آتے ہی بولنا شروع ہو گئیں حالانکہ سیڑھیاں چڑھنے سے ان کا سانس پھولا ہوا تھا۔

"جی تائی اماں! یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ اس میں احساس نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔" جگنو نے ذومعنی انداز میں کہا۔

اور ابھی جگنو کی بیہودہ گفتگو کا صدمہ کم نہ ہوا تھا کہ خالہ امی نے جھاڑ پلا دی اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

"چلو اندر جا کر آلو چھیلو۔ میں آ کر آلو والی روٹیاں بنا لیتی ہوں۔" انہوں نے

اس کی اتری ہوئی صورت دیکھ کر جھجکا تو وہ اندر کی طرف بڑھ گئی۔

جب وہ کافی دیر تک کچن سے نہ نکلی تو جگنو خالہ امی سے دو چار ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد نیچے اتر گیا۔

''رخشی اس کے پاس اندر آ گئی مگر عصمی نے ٹھیک طرح سے بات نہ کی۔ کتنا اسے دکھ ہوا تھا دونوں کی گفتگو پر۔ پھر رخشی بھی بور ہو کر نیچے چلی گئیں اور جاتے جاتے اسے نیچے آنے کی دعوت دے گئی۔ اس نے محض سر ہلا دیا اور وہ کوئی پاگل تھی جو جگنو کی فضول بکواس سننے پھر نیچے چلی جاتی۔

''خالہ امی! مجھے ٹھیک ہی منع کرتی ہیں ان دونوں سے بہت گھلنے ملنے سے۔'' آٹا گوندھتے ہوئے اس نے خالہ امی کی فراست کو سراہا۔



پھر وہ دونوں اگلے ہی دن شام کو واپس چلے گئے وہ رخشی کے ہزاروں بلاووں پر تھوڑی دیر کے لیے نیچے گئی مگر جگنو کے فلمی گانوں کی گنگناہٹ نے اسے دسویں منٹ ہی اوپر پہنچا دیا اور جو چھوٹی خالہ کی کڑی نظروں کا سامنا کیا وہ الگ۔ رخشی دو بار آئی اوپر اس کے پاس مگر وہ ٹھیک سے اس بات نہ کر سکی۔ رات خالہ امی نے اسے سختی سے منع کیا تھا کہ کوئی ضرورت نہیں رخشی کے ساتھ زیادہ گھلنے ملنے کی۔ شہر میں جا کر پڑھنے سے اس کے بڑے پر پرزے نکل آئے ہیں۔ خبردار جو تم نے زیادہ دوستانہ اس سے گانٹھا تو۔ ان کی ایک گھرکی ہی اس کو ڈرانے کے لیے کافی تھی۔ ویسے اسے حیرت ہوتی کہ خالہ امی کے سامنے تو رخشی بڑی مؤدب رہتی تھی سلیقے سے بات کرتی تھی پھر انہیں کیسے پتا چلا کہ اس کے بڑے پر پرزے نکل آئے ہیں۔

ان دونوں کے جاتے ہی پھر اوپر نیچے سناٹا چھا گیا۔ وہ دونوں اس گھر کی خاموش فضا میں ایک ارتعاش پیدا کر جاتے تھے۔ اور عصمی تو اس ارتعاش سے کتنے دن سنبھل ہی نہ پائی تھی کسی کا جانا اس کے اندر عجیب سی اداسی بھر دیتا تھا حالانکہ وہ دونوں دو دن رہے تو وہ سوچتی رہی کہ وہ کب واپس آ جائیں گے اور ان کے جاتے اسے اداسی نے آ گھیرا۔

شام ہوتے ہی پھر بادل چھا گئے۔ وہ کتنی دیر آہستہ آہستہ پورے آسمان پر چھاتی

گھٹا دیکھتی رہی، پرندے سرِ شام ہی گھونسلوں کی طرف بڑھ رہے تھے اور سورج تو دوپہر ہی سے بادلوں کی اوٹ میں جا چھپا تھا اب ہلکی ہلکی سرد ہوا چلنے لگی تھی۔ لگتا ہے آج پھر بارش ہو گی۔ اس نے سوچتے ہوئے نیچے جھانکا۔

چھوٹی خالہ برآمدے کے تخت پر کمبل لپیٹے حاجن سے ٹانگیں دبوا رہی تھیں۔ وہ ان کی جز وقتی ملازمہ تھی اور خالہ کا فریک تو بیچ کچھ کھانے سے اٹا پڑا ہو گا اور اب ان کے ایک ہفتے تک کوکنگ کا کوئی پروگرام نہیں ہو گا۔ اس کے بعد دسمبر کی چھٹیوں تک ڈھیروں ساگ میتھی اور پالک منگوا لیں گی اور پورا مہینہ بچت کر کے سارا خرچ بیلنس کریں گی کتنی کنجوس ہیں چھوٹی خالہ بھی۔

دوسری منزل کے پہلے کمرے کا بلب روشن تھا۔ کھڑکی پر پردہ پڑ گیا تھا پہلے کھڑکی کی جالی سے کافی کچھ نظر آ جاتا تھا شاید اسی لیے اس نے کھڑکی پر پردہ ڈال دیا تھا۔

''پتا نہیں یہ کھانے پینے کا انتظام کہاں سے کرتا ہو گا۔'' چھوٹی خالہ اتنی فیاض کہاں۔''

''عصمی اندر آ جاؤ۔'' خالہ امی کی آواز پر اس نے منڈیر پر جھکا ہوا سر اٹھایا اور ایک گہرا سانس لے کر اندر کی طرف چل پڑی۔

خالہ امی چاول صاف کر رہی تھیں۔

''آج بریانی تم پکاؤ۔'' انہوں نے اسے اندر آتے دیکھ کر کہا۔

خالہ امی! مجھ سے صحیح نہیں پکے گی پھر جو ذائقہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ مجھ سے تو چاول نرم ہو جاتے ہیں۔'' اس نے بیٹھتے بیٹھتے تین جواز گھڑ دیے خالہ امی اسے ایک لمحے کو گھور کر رہ گئیں اس نے کچھ کھسیا کر چاولوں کی ٹرے ان کے ہاتھ سے لے لی اور چاول چننے لگی۔

''میں آج نیچے گئی تھی تو روز کے پاس اچھا لڑکا ہے۔'' انہوں نے خود ہی کہنا شروع کیا۔ وہ بے نیازی سے چاول چنتی رہی۔

''میں سوچ رہی تھی۔'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔

''عصمی! تم پرائیویٹ امتحان کیوں نہیں دے دیتیں انٹر کا۔'' انہوں نے کچھ دیر بعد کہا۔

''عجیب ہی لگتا ہے خالہ امی! یہ پرائیویٹ امتحان بھی۔ جیسے بندہ کوئی جائز کام بھی ناجائز طریقے سے کرے۔'' وہ منہ بنا کر بولی ''اور پھر آج کل ریگولر والوں کو کوئی نہیں پوچھتا، پرائیویٹ والے بھلا کس کھاتے میں شمار ہوتے ہیں۔'' اس نے اٹھ کر چاول تسلے میں ڈالے اور بھگونے لگی۔

''ہم نے شمار قطار کو کیا کرنا ہے۔ تعلیم ہی حاصل کرنی ہے نا۔ اگر انسان کے پاس اتنے ذرائع نہیں کہ باقاعدہ کالج جا سکے تو بیٹا گھر بیٹھ کر پڑھنے میں کیا حرج ہے یوں فارغ بیٹھنا بھی تو اچھا نہیں۔'' انہوں نے ذرا پیار سے سمجھایا۔

''خالہ امی! گھر بیٹھ کر بھی وہی پڑھتے ہیں جو ذرا میرا مطلب ہے لائق ہوں میں بغیر کسی کی مدد سے بھلا کیسے پڑھ سکوں گی اور پھر کالج کی پڑھائی اتنی مشکل ہوتی ہے مجھ سے نہیں پڑھا جائے گا۔ میٹرک ہی اتنی مشکل سے پاس کیا تھا اب پھر اس جنجال میں پھنس جاؤں گی۔ ویسے بھی تو اتنی لڑکیاں ایسے ہی پھرتی ہیں فارغ۔ وہ نسرین خالہ کی بیٹی آصفہ بچی فردوس کی کوثر اور۔''

''بس بڑی مثالیں ہیں تمہارے پاس اپنی جیسی نالائقوں کی۔'' انہوں نے اسے ٹوک دیا۔

''تم اپنی سنوارو۔ تمہیں ان سے کیا غرض اور کوئی کالج کی پڑھائی مشکل نہیں ہوتی جیسی اسکول ویسی ہی کالج کی اور محنت ہر مشکل کو آسان کر دیتی ہے اور جہاں تک کسی کی مدد کی بات کا تعلق ہے۔ میں نے نوروز سے بات کر لی ہے وہ تمہیں کالج سے آ کر پڑھا دیا کرے گا۔ کل یا پرسوں وہ تمہیں کتابیں لا دے گا۔ ابھی تو وہ کہہ رہا تھا کہ کسی لڑکے سے لا دوں گا۔ پھر جب تم ذرا چل پڑو گی تو میں تمہیں نئی کتابیں منگوا دوں گا۔ اب مزید میں کوئی بہانہ نہ سنوں ہاں۔'' انہوں نے سارے مسئلے کو پہلے طے کر رکھا تھا۔

''خالہ امی! پلیز مجھ سے نہیں پڑھا جائے گا۔ اور وہ بھی اس ڈانٹو۔'' اس کے منہ سے نکلتے نکلتے رہ گیا۔ خالہ امی کی گھورتی نظروں نے سے چپ کروا دیا۔

''کیا مصیبت ہے؟'' وہ پٹختے ہوئے باہر نکل گئی۔

''پہلے ہی اتنی مشکل سے اس پڑھائی سے جان چھوٹی تھی اب پھر سے پھنسا رہی

ہیں مجھے اس مصیبت میں۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی چھت پر تیز تیز چکر لگانے لگی۔ بادل بہت گہرے ہو چکے تھے اور ہوا میں مزید خنکی آ گئی تھی تھوڑی ہی دیر میں اسے سردی لگنے لگی وہ اندر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

اس رات بریانی بھی اٹک اٹک کر اس کے حلق سے نیچے اتری اور نیند تو بے حد بے چین آئی تھی، شروع ہی سے اسے پڑھنے سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا رو دھو کر میٹرک کیا بس اک ذرا رنگینی کی دلچسپ کہانیوں کی بدولت کالج جانے کا شوق تھا اسی شوق میں کتابیں بھی گوارا کر لیتی لیکن اب یوں گھر بیٹھے ان کتابوں سے سر پھوڑنا۔

اسے بہت غصہ آ رہا تھا اور خالہ امی بھی کبھی جب اپنی کسی بات پر اڑ جاتی تھیں تو پھر اس خیال سے انہیں دنیا کی کوئی طاقت نہیں ہٹا سکتی تھی اس بات کا اسے اندازہ تھا۔



اور پھر تیسرے ہی دن نوروز صاحب انٹر کی دو تین درسی کتب اٹھائے اوپر چلے آئے انہیں اس طرح کتابیں لاتے دیکھ کر اس کا جی ہی جل گیا انہیں خالہ امی کے پاس بٹھا کر وہ ابھی آئی، کہہ کر جو باہر نکلی تو کتنی دیر یونہی بے مقصد کچن میں برتنوں کے ساتھ کھٹر پٹر کرتی رہی جب اسے باہر آئے کافی دیر ہو گئی تو خالہ امی کی تیز آواز پر وہ بادل نخواستہ اندر کی طرف بڑھی۔

''جی!'' اس نے دروازے پر کھڑے کھڑے ست آواز میں کہا۔

''بی نہیں چائے ابھی۔'' انہوں نے اسے گھور کر دیکھا۔

''جی۔'' اس نے کچھ انجان پن سے کہا پھر جیسے ان کے گھورنے کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔

''جی لا رہی ہوں۔'' کہہ کر وہ پھر باہر نکل گئی۔

جلدی جلدی دو کپ چائے کے بنائے اور ٹرے میں رکھ کر اندر لے آئی۔ ٹیبل ان کے آگے رکھ کر اس نے ٹرے رکھی اور پھر باہر جانا چاہا کہ خالہ امی نے اسے ڈپٹ کر پکارا۔

''اب کہاں جا رہی ہو بیٹھو ادھر۔'' تو وہ مجبوراً دوسری کرسی گھسیٹ کر نوروز کی کرسی سے ذرا پرے رکھ کر بیٹھ گئی۔

"چائے لو بیٹا۔" خالہ امی نے میٹھے لہجے میں اس سے کہا جو خاموشی سے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اتنے اونچے لمبے مرد کو یوں مؤدب بیٹھے دیکھ کر غصہ کے باوجود اسے ہنسی آ گئی۔

"انٹر میں آپ کون سے سبجیکٹس۔ رکھنا چاہ رہی ہیں؟" چائے کے تیسرے گھونٹ کو حلق میں اتارنے کے بعد اس نے عصمی کو مخاطب کیا اور اس کی طرف دیکھے بغیر۔

"جی!" وہ کچھ نہیں سمجھی میٹرک میں تو ایسے ہی ہوتا تھا۔

"دیکھیں یہ انٹر کا سلیبس ہے۔ آپ نے جو سبجیکٹس رکھنے ہوں انہیں دیکھ لیں، پھر مجھے بتا دیں۔"

"اس نے کپ میز پر رکھ کر ایک کتاب کھولی اور اس میں سے دوہرا کیا ہوا انٹر کا سلیبس کھول کر اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے سلیبس لے کر دیکھنا شروع کیا جب کافی دیر گزر گئی اور اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ سارے ہی مضامین ایک جیسے لگ رہے تھے بے حد مشکل۔

نوروز نے چائے کا کپ میز پر رکھا۔

"پھر کون سے مضامین پڑھیں گی آپ؟"

"ارے بیٹا! میں اس بدھو کو کیا سمجھ کہ کیا پڑھنا چاہیے کیا نہیں اور ویسے بھی پڑھنے کی کوئی اتنی شوقین نہیں ہے بس تم خود ہی دیکھ کر کوئی آسان آسان سے مضمون اسے رکھوا دو۔ جن میں یہ آسانی سے نکل سکے۔" اس سارے عرصے کے دوران اسے پہلی بار خالہ امی پر پیار آیا تھا۔ کیسے انہوں نے اس کی مشکل آسان کی تھی۔

"خالہ جان! مضمون کوئی سا بھی ہو کیوں نہ ہو پڑھنا تو پڑے گا ہی اور محنت بھی کرنی پڑے گی۔ میں نے کہا تھا کہ یہ خود دیکھ لیں کہ انہیں کون سا آسان لگتا ہے یا ان کے ذہنی رجحان سے مطابق رکھتا ہے۔" وہ جو سلیبس اسے واپس تھما رہی تھی اس کی بات سن کر اس کا ہاتھ رک گیا۔

"خیر لائیں۔ مجھے دیں۔ میں دیکھتا ہوں۔" پہلی بار اسے کے کشادہ چہرے پر مسکراہٹ کی ہلکی سی کرن نمودار ہوئی۔

"میرا خیال ہے ایجوکیشن اور اردو ایڈوانس ٹھیک رہیں گے اور آپشنل میں عربی رکھ لیں یا پھر پرشین (فارسی)" اس نے سلیبس پر ایک نظر دوڑاتے ہوئے اسے مشورہ دیا۔

"میٹرک میں آپ نے عربی پڑھی تھی یا پرشین؟"

"عربی!" اس نے مرجھائی ہوئی آواز میں کہا۔

"چلیں ٹھیک ہے پھر کل سے میں یہ کتابیں لے کر آؤں گا۔ آپ پڑھنا شروع کر دیجیے گا پھر اگر یہ سبجیکٹس آپ کو آسان لگیں تو پھر اپنی بکس منگوا لیجیے گا ٹھیک ہے۔" اس نے گردن ہلا دی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"خالہ جان! مجھے اجازت دیں۔ کل اسی وقت آؤں گا۔ پھر پڑھائی شروع کر دیں گے۔"

"ارے بیٹا! بیٹھو کھانا کھا کر جانا۔ شام تو پہلے ہو چلی ہے۔" خالہ امی نے بامروت لہجے میں کہا۔

"نہیں خالہ جان! شکریہ کھانے کی تکلیف رہنے دیں۔ اچھا میں چلتا ہوں خدا حافظ۔"

وہ کہہ کر باہر کی طرف بڑھا۔ چوکھٹ سے گزرنے کے لیے اسے گردن جھکا کر گزرنا پڑا تو عصمی کی ہنسی نکل گئی۔

"بس یہ کبھی کبھی کرنا آتا ہے۔ ادب کرنا سیکھو استاد کا۔" خالہ امی نے اسے فوراً ٹوک دیا۔

"چلیں اب ہنسنے پر بھی پابندی لگا دیں۔ میں نے کون سی ان کی شان میں بے ادبی کر دی ہے، ایک تو اس مصیبت میں پھنسا رہی ہیں اوپر سے۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی ٹرے اٹھا کر باہر نکل گئی۔



پھر اگلے روز وہ کتابیں اٹھائے چلا آیا۔ عصمی کا جی جل کر رہ گیا۔ اب ایسا بھی کیا وعدے کا پابند شخص کہ ایک منٹ کی دیر نہیں ہوئی۔

لیکن خالہ امی کی گھورتی آنکھوں نے آج اسے باہر نکلنے کا موقع ہی نہ دیا۔ سب سے پہلے اس نے انگلش کی کتاب کھول کر اس کے آگے رکھی۔

"His First Flight" اسے لگا یہ اس بگلے کی نہیں اس کی اپنی فرسٹ فلائٹ

بے اٹک اٹک کر اس نے Lesson (سبق) سنایا۔ ان دو سالوں کے آرام سے ساری انگریزی چوپٹ ہو چکی تھی اور میٹرک میں بھی تو اس نے رو رو کر انگلش پڑھی تھی۔ نو روز نے ڈھیر سارے ورڈز انڈر لائن کر دیے۔

"ان کے اسپیلنگ اور مطلب دونوں یاد کرنے ہیں۔ کل میں لکھواؤں گا اور کل دوبارہ اس کی ریڈنگ ہوگی۔" اس کا جی چاہا کھڑکی کھول کر نیچے چھلانگ مار دے۔

"اردو کیسی تھی آپ کی میٹرک میں۔" اس نے اردو کی کتاب کھولتے ہوئے ذرا اور دوستانہ ماحول پیدا کرنا چاہا۔

"جیسی انگریزی تھی۔" اس نے جل کر کہا۔

"اس کا مطلب ہے آپ اردو کو بھی اتنی ہی محنت اور لگن سے پڑھتی ہیں۔ جتنی انگلش کو گڈ۔" اس نے شاید طنز کیا تھا اتنی بے وقوف نہیں تھی کہ نہ سمجھتی۔

پھر ایک کے بعد ایک کتاب کھلتی چلی گئی اور اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ ڈھیر سا کام اور سارے کا سارا یاد کرنے والا۔ اس کا جی چاہا دھاڑیں مار مار کر رونے لگ جائے اور شاید وہ ایسا کر گزرتی اگر ڈھائی گھنٹے بعد اسے اجازت لینے کا خیال نہ آ جاتا۔

"اچھا کل آپ یہ سب تیار کر لیجیے گا۔ میں لکھواؤں گا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا تو اس سے سر ہلا کر بھی ہاں نہ بھری گئی۔ اتنا ڈھیر سارا کام۔ اس کی آنکھوں میں بارش اترنے لگی۔

اس کے جانے کے بعد بھی وہ یونہی ہی بیٹھی رہی۔ بے حس و حرکت خالہ امی نے جھانک کر شاید چائے کا بھی پوچھا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

اور رات جب بارش کی بوندیں دھیمے دھیمے سروں میں برس رہی تھیں تو وہ Dear Departed کا پہلا سوال رٹ رہی تھی۔

اگلے دن نو روز اس کی کارکردگی سے ذرا مطمئن نظر نہ آیا۔ جتنی اسپیلنگ میں غلطیاں تھیں اس سے زیادہ Pronounciation (تلفظ) میں، سارا کام دوبارہ مل گیا وہ بھی نئے اضافوں کے ساتھ، اس کے لیے تو وہ بہار کا پہلا دن خزاں کا ابتدائیہ بن کر آیا تھا۔ دو دن سے نہ تو وہ منڈیر پر کھڑی ہوئی تھی، نہ بادلوں کو دیکھا تھا، نہ پودوں کو پانی دیا تھا۔ نہ چھوٹی خالہ کی ایکٹنوئی دیکھ سکی تھی اور تو اور احتجاجاً اس نے دو دن سے کسی کام کو ہاتھ نہ لگایا تھا۔

بے چاری خالہ امی خود ہی گھٹنے پکڑ پکڑ کر سارا کام خاموشی سے کیے جا رہی تھیں۔ کئی بار اسے خیال آیا کہ ان کی طبیعت خراب ہو جائے گی لیکن پھر اس سنگدلی کا بھی خیال آ جاتا جو مصیبت ان کی وجہ سے اس پر ٹوٹی تھی۔

تیسرے دن بھی وہ نو روز کے جانے کے بعد کتابوں کے ڈھیر میں کنول آسن جمائے بیٹھی تھی۔

"اسپیلنگ بھول جاتے ہیں۔ تلفظ منہ سے نکلتے نکلتے کیا سے کیا ہو جاتا ہے، Idioms پلے نہیں پڑ رہے اور Perposition سے تو اللہ بچائے اور یہ عربی۔" اس نے عربی کی کتاب اٹھائی" یہ میٹرک میں تو اتنی مشکل نہیں تھی اور اردو یہ تو اردو نے معلی ہے میں نے یہ کیوں رکھ لی بات بے بات شعر پڑھو۔" اس کے دل نے دہائی دی۔

"اور ایجوکیشن ہونہہ، سولہ سو ڈیڑھ کی تعلیمی تھیوریاں اب پڑھا رہے ہیں اکیسویں صدی میں۔" اس نے جل کر ایجوکیشن کی کتاب اٹھائی اور کرسی پر نیم دراز ہو کر اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔

وہ جس کی کتاب تھی، وہ بھی اس سے متنفر نظر آتا تھا جگہ جگہ فلمی گانے اور اشعار لکھے ہوئے تھے وہ انہیں دلچسپی سے پڑھنے لگی۔

ہم دل والوں کی بات مت پوچھو جی
جو پیار کیا سو پیار کیا جو نفرت کی سو نفرت کی

"ابن خلدون کا نظریہ تعلیم۔"

گلی گلی میں گونج رہی ہیں تیرے پیار کی خبریں
چاروں طرف ہیں چرچے تیرے بول کہاں سے گزریں

اسے ہنسی آ گئی، کیا ذوق ہے حضرت کا۔ اس نے ورق اٹھایا تو نیچے بائیں کونے میں باریک نب کی نوک سے لکھی تحریر نظر آئی وہ پڑھ کر اچھل ہی پڑی۔

"سر نو روز یہ کتابیں لے کر چچا فرید کے گھر جاتے ہیں اور چچا فرید کے گھر پڑھنے والے تین لوگ ہیں۔ جگنو اور رخشی تو لاہور میں ہیں تو پھر تیسرا کون ہے؟ یقیناً تم عصمی ہو۔ عاصمہ خالہ کی بھانجی Am I Right اگر یہ صحیح ہے تو اس پر ٹک لگا دو باقی پھر کل لکھوں گا۔

ڈھونڈنا امام غزالی والے سبق میں۔"

نیچے کا کروچ کی شکل کے سائن تھے۔ اس کی سمجھ میں نہ آئے۔

ہائیں یہ کون ہے اتنی پکی رپورٹ چھوٹی آبادی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ یہاں گمنام رہنا بہت دشوار ہوتا ہے تو یہ اگر سر پڑھ لیتے تو؟ وہ پریشان ہوگئی۔

دوبارہ غور سے وہ پیراگراف پڑھا۔ ''کیا عقل کے گھوڑے دوڑائے ہیں اس نے؟'' اس نے لڑکے کی عقل کو داد دی۔

''ٹک لگانے میں کیا حرج ہے، کسی کو کیا پتا چلے گا۔ کہ ٹک کس نے لگایا ہے۔'' اس کے اندر سے کوئی بولا اگر ''سر کو پتا چل گیا تو وہ کیا سوچیں گے، میں ایسی لڑکی ہوں۔ سوچتے رہیں۔ میں نے ان کی سوچوں کا ٹھیکہ لیا ہوا ہے۔ اتنی خشک اور بور کتابیں خود کو پڑھنی پڑیں نا تو پتا چل جائے ہونہہ!'' یہ کہہ کر اس نے پنسل سے کونے میں ٹک لگا دیا۔

یاد تو اس نے رات کو جو کیا سو کیا لیکن سوئی ایک ہی نقطے پر اٹکی ہوئی تھی۔ پتا نہیں کون ہے؟ میرے ٹک کا کیا رسپانس دیتا ہے اگر خالہ امی کو علم ہو گیا تو؟

اور اگلی دوپہر اسے بے چینی سے نوروز کے آنے کا انتظار تھا اس روز وہ اپنی عادت کے برخلاف دس منٹ لیٹ آئے اور پہلی بار اسے پڑھنے کے لیے تیار بیٹھے دیکھ کر کچھ حیران ہوئے۔ خالہ امی دو تین دن ان کے پاس بیٹھیں، اب وہ اٹھ کر اپنے کام سے لگ جاتیں پہلے تو اس کا جی چاہا ان سے کہہ دے خالہ امی آپ فکر نہ کریں میرا اس جیسے لکڑ پتھر ٹائپ، خشک اور بور بندے سے عشق کرنے کا کوئی ارادہ نہیں لیکن شاید خالہ امی کو بن کہے ہی اس بات کا یقین ہو گیا تھا اس لیے وہ بے فکر ہو کر باہر چلی جاتیں۔

پھر جیسے ہی سر پڑھا کر گئے اس نے جلدی سے ایجوکیشن کی کتاب اٹھائی اور امام غزالی والا باب نکالا۔ سارے ورق الٹ لیے وہاں کچھ بھی نہ تھا بس دو چار نئے اشعار اور گانے تھے اس نے سرے سے پھر ورق گردانی کی مگر کچھ نہ ملا۔

اس نے بے دلی سے کتاب میز پر پٹخ دی کچھ دیر یونہی بے مزہ ہو کر بیٹھی رہی پھر دوبارہ کتاب اٹھا کر اس نے ابن خلدون والا صفحہ نکالا اس کے ٹک کے نیچے لکھا تھا Thank you آگے لکھا تھا۔

"The Princess on the Road کے صفحہ نمبر 17 پر دیکھو۔"

اس نے جلدی سے انگلش ڈرامے کی کتاب اٹھائی اور مطلوبہ صفحہ نکالا۔ نیچے کونے میں پھر ایک نوٹ تھا۔

"اردو ایڈوانس کی کتاب کا جو بیرونی کور ہے، اسے اتار کر دیکھو۔"

"کیا مصیبت ہے؟" اس نے جھنجلا کر اردو ایڈوانس کی کتاب اٹھائی اس پر آج کور چڑھا ہوا تھا اسے پہلے پتا نہیں چلا تھا اس نے احتیاط سے کور اتارا تو اندر سے تہہ کیا ہوا کاپی کا ایک صفحہ نکلا۔

"ہیلو ڈیئر عصمی۔"

ہاؤ آر یو تم نے میرے نوٹ پر ٹک لگا کر میرے بیان کی تائید کر دی شکریہ۔ میرا نام جواد ہے۔ یار لوگ پیار سے جودی کہتے ہیں۔ تمہیں تو پتا ہی ہوگا کہ جودی اس پہاڑ کا نام ہے جس پر آدم ثانی حضرت نوح کی کشتی اتری تھی۔

سو ڈیئر! اپنا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ یاروں کے یار ہیں جس کے ساتھ ایک بار دوستی کا رشتہ جوڑ لیں، مرتے دم تک نبھانے کا دم خم رکھتے ہیں۔

اور سناؤ میری کتابیں کیسی لگیں تمہیں؟ اچھی ہیں نا۔ میں بائنڈنگ کے لحاظ سے پوچھ رہا ہوں۔ ویسے تو یہ سب دری کتابیں ٹوٹلی بکواس ہوتی ہیں۔ رف اینڈ ٹف ہوا اس کو تحمل کر دینے والی (ویسے میں خود بھی بہت اچھا ہوں) اپنی کلاس کا سب سے جینئس اسٹوڈنٹ ہوں اس کا اندازہ تمہیں میری کتابیں دیکھ کر ہو بھی گیا ہوگا۔

اگر مجھے جواب دینا ہو تو اس کور کے اندر رکھ دینا میں نکال لوں گا کل تمہیں اسی کور کے اندر سے اپنے خط کا جواب مل جائے گا۔ باقی باتیں تمہارا خط ملنے کے بعد۔

اور ہاں میرا فون نمبر لکھ لو ہو سکے تو مجھ سے بات کرنا ویسے چچا فرید کے گھر کے فون نمبر کا تو مجھے علم ہے۔ لیکن تم خط میں لکھ دینا کس وقت فون کے پاس موجود ہوگی میں رنگ دوں گا او کے بائے۔"

نیچے اس کا فون نمبر اور وہی کا کروچ والے میز جیسے سائن تھے۔

اس کی ہتھیلیاں پسینے سے تر ہو گئیں۔ اس نے خط مٹھی میں بھینچ لیا اور اٹھ کر کھڑی

ہو گئی اس پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔

''اللہ میری توبہ! کتنے فضول ہوتے ہیں لڑکے، میں نے ایک ٹک کیا لگایا اس نے پوری داستان لکھ بھیجی۔

اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا خالہ امی پودوں کو پانی دے رہی تھیں وہ واپس کرسی پر آ بیٹھی۔ پھر وہ کاغذ کا پرزہ کھول کر پڑھنے لگی۔

''پھاڑ دوں اسے؟'' اس نے محض سوچا۔

اور پھر رات تک اس سے کچھ پڑھا ہی نہ جا سکا۔

''کیا کروں جواب دوں یا یونہی خاموشی اختیار کر لوں۔''

رات دیر تک کتابیں لے کر بیٹھی رہی اور پھر کوشش کے باوجود وہ جواب نہ لکھ سکی، صبح جا کر کتابیں یونہی دے آئی۔ وہ واپسی پر کتابیں لے کر آتے تھے۔

دوپہر تک وہ بے چینی سے ان کے آنے کا انتظار کرتی رہی جیسے ہی ان کی سیڑھیاں چڑھنے کی آواز اس نے سنی وہ تیزی سے نیچے اتر کر آ گئی۔

''سلام سر!'' وہ ابھی کمرے میں داخل ہی ہوئے تھے کہ اس نے جا کر عجلت سے سلام جھاڑا۔

''وعلیکم السلام۔'' جواب کچھ حیرت زدہ سا تھا۔

''وہ سر! وہ کتابیں لینی تھیں۔ رات میں کچھ پڑھ نہ سکی تھی۔'' اس نے تیزی سے بہانہ گھڑا۔

''ہاں لے لیں۔ یہ رکھی ہیں۔'' وہ ٹیبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے الماری کی طرف بڑھ گئے اس نے جلدی سے کتابیں اٹھائیں اور اوپر کمرے میں آ کر ہی سانس لیا۔

جلدی جلدی اردو ایڈوانس کا کور اتارا تو خالی جلد اس کا منہ چڑھا رہی تھی پھر ایک ایک کر کے اس نے ساری کتابیں دیکھ ڈالیں کہیں کچھ نہیں لکھا تھا۔

''ہوں لگتا ہے حضرت خفا ہو گئے ہیں۔'' اس نے کتابیں میز پر رکھ دیں اور کرسی کی پشت پر سر ٹکایا۔

''ہوتا ہے تو ہوتا رہے۔ مجھے کیا۔ جو یہ خالہ امی کو پتا چل جائے تو میری چھڑی ادھیڑ

دیں۔'' اس نے جھرجھری لے کر کتاب اٹھا کر پڑھنا شروع کیا۔

پھر اگلے دن بھی وہ کتاب کا کور ادھیڑنے سے خود کو باز نہ رکھ سکی وہاں ایک چھوٹا سا پرزہ تھا جس پر شعر لکھا تھا۔

درد بڑھتا ہی ہے ایسی دوا دے جاؤ
کچھ نہ کچھ میری وفاؤں کا صلہ دے جاؤ

وہ شعر پڑھ کر مسکرائی۔ پڑھنے کے دوران بھی جواب سوچتی رہی لیکن کچھ سمجھ نہ آیا آخر اگلے روز کتابیں دینے سے پہلے اس نے اسی شعر کے نیچے لکھ دیا۔

''مجھے شعر نہیں آتے۔'' اور چٹ واپس کور کے اندر رکھ دی۔

اگلے دن جوابی رقعہ موجود تھا۔

''ہیلو ڈیئر عصمی!''

چلیں، آپ نے کچھ نہ لکھنے کی قسم تو توڑی۔ آپ کا یہ چار لفظی فقرہ ہی ہمارے لیے کل کائنات ہے۔ اس قابل سمجھا شکریہ۔

میں نے کل تین چار بار فون کیا تمہارے چچا کے گھر۔ بڑی ٹک چڑھی ہیں تمہاری خالہ محترمہ تو۔ صرف ہیلو کہنے پر ہی کاٹ کھانے کو دوڑ رہی تھیں ان کے دونوں لاڈلے اس لیے یہاں سے بھاگے رہتے ہیں۔

میں کل صبح دس بجے آپ کے گھر کے سامنے پنک شرٹ اور بلیو جینز میں آؤں گا۔ ایک جھلک ضرور دکھا دینا۔ پلیز۔

دید کا طالب جواد۔

''ہائے اللہ'' اس نے خط پڑھ کر دھک دھک کرتا دل تھام لیا۔

''توبہ میں بھلا ایسا کر سکتی ہوں خالہ امی کو پتا چل جائے۔ نعوذ باللہ توبہ میں کوئی ۔۔۔ ۔۔ٹی ہوں جو آرام سے چل پڑوں گی۔ ہونہہ!'' اس نے چٹ کا جواب کوئی نہ لکھا البتہ اگلی صبح ۔۔ انتظار خواہ مخواہ شروع کر دیا۔

اگلی صبح ساڑھے نو بجے تک اس نے جیسے ہی سارا کام ختم کیا چھوٹی خالہ اوپر ۔۔ گئیں۔

"اوہو یہ کہاں سے آ گئیں اب گلی کی طرف جھانکنا بھی ممنوع ہو جائے گا۔" اس نے جھنجلا کر سوچا۔

"چھوٹی خالہ آپ اندر چل کر بیٹھیں۔ خالہ امی کچن میں ہیں۔" اس نے ان کے ہانپتے کانپتے وجود کو سہارا دیتے ہوئے کہا۔

"اے بی رہنے دو۔ اندر چل کر بیٹھوں اتنی سردی ہے اندر۔ یہیں کرسی اٹھا کر لاؤ۔"

وہ چھت کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر ہٹ دھرمی سے بولیں تو اسے مجبوراً اندر سے کرسی اٹھا کر لانی پڑی۔ خالہ امی بھی باہر آ گئیں اور ان کے کہنے پر وہ چائے بنانے کچن میں آ گئی چائے دے کر اس نے اندر جا کر ٹائم دیکھا دس بج کر پانچ منٹ ہو گئے تھے وہ بے چینی سے باہر آئی چور نظروں سے گلی والی دیوار کی طرف دیکھا چھوٹی خالہ تھوڑی آڑی ہو کر بیٹھی ہوئی تھیں، وہ کچھ دیر شش و پنج میں وہاں کھڑی رہی پھر بے آواز قدموں سے دیوار کی طرف بڑھی۔

دیوار کے پاس پہنچ کر اس نے ذرا نیچے جھک کر جالی سے باہر جھانکا۔

وہ ہیرا اسی حلیے میں سامنے ہی کھڑا تھا ابھی اس کی پہلی نظر ہی پڑی تھی کہ چھوٹی خالہ کی اس پر نظر پڑ گئی۔

"آپا فاطمہ! میں کہتی ہوں اس لڑکی کو پٹہ ڈالو۔ یہ کوئی طریقہ نہیں اچھی بھلی دیواروں سے لگی پھرتی ہے، شریف بیٹیوں کے یہ چلن نہیں ہوتے۔ نہ تم نے کہیں دیکھا ہے ایسے وضع دار گھرانوں کی بچیوں کو منڈیر پر منڈلاتے۔ یہ عادتیں تو اب چھوکروں میں نہیں رہیں اور یہ۔" ان کی لعن طعن پر وہ الٹے قدموں اندر کمرے کی طرف چلی گئی۔

"حد ہو گئی یعنی کہ اور کوئی کام نہیں جب دیکھو چھپکلی بنی کبھی اس دیوار پر کبھی اس دیوار پر۔" اتنے گندے جانور سے اسے تشبیہ دینے پر اس کا دل جل گیا۔

"بی بی! ہم عزت دار لوگ ہیں، ہماری عزت کو نہ بٹہ لگاؤ۔ تمہارا تو کچھ نہیں جائے گا لوگ ہمارے نام پر انگلی دھریں گے ہاں۔ ایک میری بچی ہے مہینے دو مہینے بعد جو پڑھائی سے ذرا فرصت ملے آتی ہے تو مجال ہے جو کبھی دیواروں سے اس کی طرح لگتی ہو۔ ویسے آپا فاطمہ! تم بڑی اصول پسند بنتی ہو، اس کے لیے سارے اصول موم کر لیے تم نے؟" وہ خالہ امی کے سامنے بیٹھی انہیں لتاڑے جا رہی تھیں کہ اچانک پیچھے گلی والی سائیڈ سے ایک کاغذ میں لپٹا

ہوا پتھر آیا اور کسی میزائل کی طرح دھائیں سے ان کے سر پر آ کر لگا ان کے منہ سے ڈکراتی ہوئی ہولناک چیخ نکلی۔

"ہائے آہ، ہائے میں مر گئی۔" وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ گئیں۔ خالہ امی گھبرا کر اٹھیں۔

"کیا ہوا جمیلہ!" وہ بھی کچن سے باہر نکل آئی، ان کی کرسی کے پچھلے پائے کے پاس کاغذ میں لپٹا اچھا خاصا توانا، پتھر پڑا تھا وہ جلدی سے آگے بڑھی اور ان کے پیچھے کھڑے ہوتے ہوئے جھک کر غیر محسوس طریقے سے پتھر اٹھا کر اس نے بغل میں دبا لیا۔ چھوٹی خالہ کی ہائے ہائے اب با آواز بلند تھی۔ اسے اپنی ہنسی روکنا محال ہو رہا تھا۔



اگلے روز اسے پھر بے چینی سے سر نوروز کے آنے کا انتظار تھا جیسے ہی وہ سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں پہنچے تو وہ ان کے سر پر موجود تھی۔

"سر! وہ کتابیں لے لوں مجھے پڑھنا ہے۔" حالانکہ اب تک ہونے والے سب ٹیسٹوں میں اس کے نمبر چار اور پانچ کے درمیان آ رہے تھے یعنی بری طرح فیل۔

سر نوروز نے اسے ایک لمحے کو ذرا غور سے دیکھا وہ اپنے آپ میں سمٹ گئی۔

"میں ابھی اوپر آتا ہوں کتابیں لے کر۔ آپ جائیں۔" انہوں نے کچھ بے رخی سے کہہ کر منہ دوسری طرف کر لیا وہ پہلے تو کچھ حیران ہوئی اور پھر مایوسی سے لوٹ آئی۔

خیر جب وہ اوپر آئے کتابیں لے کر تو اس نے سنجیدگی سے پڑھنا شروع کر دیا چور نظروں سے ایک دو بار اردو ایڈوانس کی کتاب کو دیکھا۔

"میں ابھی آتا ہوں۔" تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ کر باہر چلے گئے تو اس نے سکون کا سانس لیا اور جلدی سے اردو کی کتاب اٹھا کر بے صبری سے اس کا کور اتارا اندر رقعہ موجود تھا۔

"ہیلو ڈیئر عصمی!

یہ کیا ظلم کیا کل ہم غریبوں پر۔ کھڑے کھڑے میری ٹانگیں شل ہو گئیں مگر دید کی پیاس نہ بجھی۔ سچ کہا ہے کسی نے بھلا چاند بھی کبھی دن میں نظر آیا ہے۔ کل تو تم نے ہمارے صبر کے پیمانے خوب ہی چھلکائے۔ اب کوئی بتائے کہ محبت کے مارے دل کس کو جا کہتا

سنائیں۔ ڈیئر اتنی ظالم نہ ہو صرف ایک بار ان دید کے مارے پیاسے نینوں کو سیراب کر جاؤ کل شام پانچ بجے تمہارے گھر کے سامنے پھر یہ دیوانہ آئے گا، محبت کی اک نظر کی خیرات دے دینا۔

تیری اک دید کا طالب جودی۔

پیچھے سے کسی نے ہاتھ مارا اور رقعہ جھپٹ لیا وہ حواس باختہ ہو کر کھڑی ہو گئی سر نوروز رقعہ ہاتھ میں لیے کھڑے تھے۔ انہوں نے رقعہ پڑھنا شروع کیا ان کی آنکھیں سکڑتی جا رہی تھیں اور ماتھے پر شکنیں بڑھتی جا رہی تھیں دانت بھینچے وہ لفظوں پر تیزی سے نظریں دوڑا رہے تھے ان کے تیور دیکھ کر اس کا جسم تھر تھر کانپنے لگا اس سے پہلے کہ وہ رقعہ تمام کر کے ایک طمانچہ اس کے منہ پر جڑتے وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ انہوں نے اسے جانے دیا وہ دوسرے کمرے میں جا کر دھڑ دھڑ کرتے دل کو سنبھالنے لگی۔ خوف سے اس کا جسم اب بھی ہولے ہولے کانپ رہا تھا کہ تھوڑی دیر میں ان کی سیڑھیاں اترنے کی آواز آئی تو وہ دھڑام سے پلنگ پر گر پڑی۔

اور رات تک اس کے سارے حواس نیچے سے آنے والے قدموں کی چاپ پر لگے رہے کہ اب انہوں نے خالہ امی کو اوپر آ کر کچھ کہا اور اب خالہ امی نے اس کی چمڑی ادھیڑی مگر حیرت ناک بات تھی کچھ بھی نہ ہوا اگلے دن تک۔



ہاں اگلے روز یہ ہوا کہ اس کا سارا کورس نیا آ گیا اور سر کے چہرے پر مزید سنجیدگی چھا گئی اور وہ پہلے ہی اپنی جگہ چور بنی بیٹھی تھی۔ نہ سر نے کچھ پوچھا نہ اس کی جرأت ہوئی ان سے آنکھ ملانے کی بس نظریں جھکائے بڑھتی رہی احساس ندامت گردن اٹھانے نہیں دے رہا تھا۔

''کیا سمجھتے ہوں گے یہ مجھے کہ میں اتنی گری ہوئی لڑکی ہوں کہ جو چاہے مجھے دو حرف لکھ کر بتا سکتا ہے، اپنے رستے پر چلا سکتا ہے۔''

''میں تو رخشی کو ایسا سمجھ رہی تھی اور میں تو اس سے بھی کمزور نکلی فقط دو حرفوں کی فقیرنی اور بس کسی نے جھوٹی محبت کے دو بول میرے کاسے میں ڈالے اور میں آنکھیں بند کر

کے بیٹھی اپنی اتنی عزت و آبرو والی ماں کی ساکھ کی پروا کیے بغیر تف ہے مجھ پر۔''

کتنے دن اس کا ضمیر اسے لعن طعن کرتا رہا۔

اس چھوٹے سے واقعے نے جیسے اس کی آنکھیں کھول دیں اس نے سنجیدگی سے پڑھنا شروع کر دیا۔

بھیگا بھیگا سا دسمبر آدھے سے زیادہ بیت چلا تھا اور وہ جو شروع میں کتابوں سے ہراساں ہو کر ہر چیز بھول بیٹھی تھی پھر سے اپنی پہلی اور سچی محبت کی طرف لوٹنے لگی بارش اور موسم سے محبت، نومبر اور دسمبر سے محبت اور خالہ امی کے پکائے ہوئے گرم گرم میٹھے حلوؤں سے محبت۔ ان محبتوں کے سامنے یہ گلی کی نکڑوں پر ملنے والی دو گھڑی کی محبتیں کیا حیثیت رکھتی ہیں، ہونہہ۔

اس نے بادلوں سے اٹے آسمان کی طرف خوشی سے سر اٹھا کر دیکھتے ہوئے سوچا۔

''ہائے آج بارش ہو جائے تو کیا ہی اچھا ہو۔ کتنے دنوں سے میں نے بارش سے باتیں نہیں کیں۔'' اس کے پاگل پن نے سوچا۔

شام ہوتے ہی ہر طرف دھند کا غبار پھیل گیا اس نے منڈیر سے ذرا نیچے جھانکا سر الیکٹرک کیتل میں اپنے لیے چائے بنا رہے تھے انہوں نے کھڑکی سے ایک نظر عصمی کو دیکھا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

''اگر یہ خالہ امی کو بتا دیتے، تو ہے، میں کیا کرنے چلی تھی۔'' اس نے خوف سے جھرجھری لی۔

''خالہ امی! آج مٹر پلاؤ اور شامی کباب میں بناؤں گی۔ اور نیچے سر کو بھی بھیجیں کے کیونکہ چھوٹی خالہ کا تو سائگ کا چوتھا دن چل رہا ہے آج۔''

وہ کچن میں داخل ہوتے ہوئے بولی خالہ امی چائے بنا رہی تھیں۔

''اسے سائگ پسند ہے تو تمہیں کیوں برا لگتا ہے۔'' انہوں نے دیورانی کی حمایت کی۔

''اب ایسی بھی کیا پسندیدگی کہ بس پہنانے کی کسر رہ جائے۔'' وہ منہ بنا کر بولی۔

دسمبر کی چھٹیوں میں جگنو دو تین دن کے لیے آیا، رخشی بالکل نہ آئی۔ اس نے چھوٹی

خالہ سے پوچھا تو ناک سکوڑ کر بولیں۔

''پڑھنے گئی ہوئی ہے وہاں کوئی فارغ نہیں کہ دو چار چھٹیاں ملیں تو گھر کو بھاگ لے۔ کہہ رہی تھی امی اس دفعہ کلاس میں میری پوزیشن بن رہی ہے اس لیے ہاسٹل میں رہ کر خوب پڑھوں گی۔ میری بچی کا پڑھ پڑھ کر اتنا سا منہ نکل آیا ہوگا۔ جگنو کے ہاتھ گاجروں کا حلوہ بنا کر بھیجا ہے میں نے اللہ اسے کامیاب کرے۔'' ان کا لہجہ شہد بھرا تھا۔ معصی چپ کر گئی۔



''اس بار ہونے والی انٹر کے امتحان ایک ماہ لیٹ ہو گئے ہیں۔ میرا خیال ہے آپ ایڈمیشن بھجوا دیں۔ آدھے پیپرز اب دے دیں آدھے سیکنڈ ایمپ میں دے دیجیے گا۔''

سرنوروز اس کے ٹیسٹ کی چیکنگ کے دوران اسے بتا رہے تھے۔

''جی اچھا!'' اس نے We are seven کی سمری ان کے آگے رکھتے ہوئے تابعداری سے کہا۔

دل میں اس نے سوچ رکھا تھا کہ پیپرز پورے ہی دے گی جو ہونا ہوگا ایک ہی بار ہو جائے گا بار بار سولی پر لٹکنے سے فائدہ۔ تین چار ماہ جان لڑا کر محنت کر لیتی ہوں۔ دوبارہ ان کتابوں کی اللہ مجھے شکل نہ دکھائے۔

پھر مئی میں ہونے والے پیپرز جون میں شروع ہوئے اور جون تک اسے نہ اپنا ہوش تھا اور نہ چھت منڈیروں کا۔ ویسے بھی گرمیوں میں اوپر اس قدر گرمی ہوتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی سیخ کباب کو چاروں طرف سے گھما گھما کر سینک پہنچا رہا ہو۔ یہی حال اوپر کے کمروں کا تھا صبح پانچ بجے جو سورج سروں پر چمکنا شروع ہوتا تھا رات سات آٹھ بجے جا کر کہیں اندھیرے کی صورت نظر آتی تھی۔ وہ صبح صفائی کر کے کتابیں اٹھاتی اور درمیان والی منزل کے برآمدے میں جا بیٹھتی۔ خالہ امی بھی اس کے ساتھ ہی نیچے چھوٹی خالہ کی پاس چلی جاتیں۔ دوپہر کے لیے وہ صبح ہی کچھ نہ کچھ بنا لیتی تھیں روٹیاں حاجن انہیں تنور سے لا دیتی تھی اور وہ دونوں نیچے ہی چھوٹی خالہ کے پاس دوپہر کا کھانا کھا لیتی تھیں۔

''چلو ان کتابوں کے بہانے ہی سہی معصت بی بی کی بے چین روح کو چند مہینے

چین تو ملے گا اور دیواروں نے بھی چند سکھ کا سانس لیا ہوگا یہ علیحدہ بات ہے کہ مقصد صرف امتحان دینا ہے یا کچھ اور ہے۔''

ان کا طنز وہ تو سمجھ جاتی لیکن خالہ امی شاید جان کر انجان بن جاتیں اور چھوٹی خالہ کی ہاں میں ہاں ملانے لگتیں۔

''بس جمیلہ! میں نے سوچا چار حرف پڑھ لے گی تو کچھ آسرا ہو جائے گا۔ یہاں کون سا اس کے کوئی آگے پیچھے بیٹھا ہے۔ کل کلاں کو کوئی بات ہو گئی تو یہ تعلیم کام آ جائے گی میری سانسوں کا کیا بھروسا!''

خالہ امی کی بات پر تڑپ کر اس نے انہیں دیکھا۔ وہ اسے آج کل ویسے بھی ٹھیک نہیں لگ رہی تھیں۔ ان کا رنگ پھیکا پڑتا جا رہا تھا، گرمی جو زیادہ ہے، اس کے دل نے جواز گھڑا تو وہ اطمینان سے ''قرارداد پاکستان'' کے نکات رٹنے لگی۔

پھر امتحان آئے اور ہو بھی گئے۔ خلاف توقع اس کے سب پیپرز اچھے ہوئے تھے اسے تو بس پاس ہونے کی تمنا تھی۔ اچھے نمبروں کے خواب اس نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اسے اپنی قابلیت کا اندازہ تھا۔ اگرچہ سرنوروز کا خیال تھا کہ اس کے نمبر بہت اچھے آئیں گے۔

پڑھائی ختم ہونے کی خوشی میں اس نے گرمی کا احساس بھی بھلا لیا۔ سارا دن اوپر ہی گزارتی، جون جولائی کی لو برساتی ہوائیں پنکھے سے ٹکرا کر آگ کے گولے بن جاتیں مگر وہ ڈھیٹ بنی سوتی رہتی پندرہ بیس دن تک اس نے خوب نیندیں پوری کیں۔ خالہ امی کی ڈانٹ کا بھی کچھ اثر نہ ہوتا، اس نے نیچے جانا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ ایک تو گرمی اوپر سے چھوٹی خالہ کے سوئیوں جیسے چبھتے طنز۔

پھر جولائی میں بارشیں شروع ہو گئیں تو اس کے دل کی کلیاں کھل گئیں۔ اوپر کا موسم بہت اچھا رہنے لگا تھا۔ اب تو خالہ امی بھی نیچے نہیں جاتی تھیں۔

''خالہ امی! یہ رخشی اور جگنو بھائی اس بار آئے ہی نہیں۔ رخشی کے تو پیپرز بھی کب کے ختم ہو گئے ہیں۔'' ایک دن اسے اچانک یاد آیا تو پوچھ بیٹھی۔

''آج کل میں آنے والے ہیں۔ پیپرز کے بعد رخشی اپنی پھپھو کی طرف چلی گئی تھی اور کچھ دن شاید اپنی کسی دوست کے ہاں بھی رہی ہے۔ کل شاید دونوں آ جائیں۔ جگنو کے

امتحان پرسوں ختم ہوئے ہیں، جمیلہ بتا رہی تھی۔"

وہ بے چینی سے سے ان کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔

اور اگلے دن واقعی وہ لوگ آ گئے۔ جیسے ہی نیچے ان کے آنے کی اسے خبر ہوئی وہ فوراً رخشی سے ملنے گئی کتنے ماہ ہو گئے تھے اس سے ملے۔

رخشی نے آف وائٹ نیٹ کی شرٹ اور براؤن دوپٹہ اور شلوار پہن رکھی تھی۔ اس کی صحت پہلے سے بہت اچھی ہو گئی تھی اور جسم بھی فربہی مائل تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ چمک رہا تھا اور آنکھوں میں جیسے ستارے جگمگا رہے تھے۔ عصمی اسے دیکھ کر حیران سی رہ گئی۔ جگنو البتہ کچھ اکھڑا اکھڑا اور بیزار سا تھا۔

"ہائے رخشی! تم کتنی پیاری ہو گئی ہو۔ یہ کیسے امتحان تھے تمہارے جنہوں نے تمہیں اتنا رنگ روپ دے ڈالا۔ میرا تو ان امتحانوں نے خون ہی جلا ڈالا ہے۔" وہ اس کے گلے لگتے ہوئے پیار سے بولی۔

"اچھا واقعی!" وہ زور سے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

Would I take

It is a compliment or---

(کیا میں اسے تعریف سمجھوں یا-----)

"نہیں رئیلی یو لک ویری پریٹی۔" اس نے ستائش بھری نظر سے اسے دیکھا۔

"تھینک یو!" اس نے اسٹیپس میں کٹے بالوں کو اک ادا سے جھلایا۔

"ہائیں، تم نے بال بھی کٹوا لیے؟" اس پر تو اس کی نظر نہ پڑی تھی۔

"یار! وہاں ان مصیبتوں کو سلجھانے کا ٹائم نہیں ملتا تھا، اس لیے میں نے فقتوں۔"

اس نے انگلیوں سے قینچی بالوں پر چلا دی۔

"چھوٹی خالہ نے کچھ نہیں کہا۔" اس نے کچھ تشویش سے پوچھا۔

"کیوں میں نے ان کے بال کٹوائے تھے جو وہ کچھ کہتیں۔" وہ ناک سکوڑ کر بولی۔

"یہ جگنو بھائی کو کیا ہوا ہے۔ آتے ہی کمرے میں گھس گئے ہیں۔" اس نے پوچھ

ہی لیا۔

"ان کی "سونیا" انہیں ڈاج دے گئی ہے۔ چند دن تو سوگ منائیں گے۔"

"کیا مطلب؟" وہ حیرانی سے بولی۔

"تمہاری سمجھ اس گھر میں رہ کر بالکل Still (جامد) ہو گئی ہے۔" وہ لاپروائی سے بولی۔ "تم پریشان نہ ہو۔" کہتے ہوئے وہ دھم سے بیڈ پر گر گئی۔

"ان کے پیپرز تو اچھے نہیں ہوئے؟ ویسے "سونیا" سے وہ کچھ کچھ تو سمجھ ہی گئی تھی۔

"ہاں شاید۔ اچھا ابھی میں تو سوؤں گی، خاصی تھکاوٹ ہو رہی ہے۔"

اس نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ اس کی یہ حرکت عصمی کو بالکل اچھی نہ لگی۔ وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

"او کے، میں چلتی ہوں۔"

"بیٹھو تم تو۔ میں تو ویسے ہی کہہ رہی تھی۔ بڑی باتیں کرنی ہیں تم سے۔" وہ اس کا ہاتھ کھینچ کر بولی۔

"نہیں، خالہ امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے جا کر کھانا بنانا ہے۔ اتنے میں تم آرام کر لو کل باتیں کریں گے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" رخشی نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"پھر وہ دن اور اس سے اگلا دن بھی گزر گیا۔ رخشی اوپر نہ آئی۔ وہ بھی نیچے نہ گئی۔ کچھ انا آڑے گئی، کچھ خالہ امی کی طبیعت ٹھیک نہ تھی لیکن دوسرے دن کی شام کو نیچے سے تیز تیز آوازیں سنائی دینے پر وہ منڈیر کی طرف بڑھی۔ صحن میں کوئی نہیں تھا۔ آوازیں اندر دالان سے آ رہی تھیں۔ چھوٹی خالہ چیخ رہی تھیں، رخشی انہیں تیز آواز میں جواب دے رہی تھی لیکن تو اس کے ایک پلے نہ پڑا۔

اسی لمحے جگنو تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا دالان سے نکلا اور باہر گیٹ کی طرف چلا گیا پھر نیچے خاموشی ہو گئی۔

پہلے اس کا جی چاہا کہ نیچے جا کر پتا کرے۔ چھوٹی خالہ پہلے ہی غصے میں ہیں، یہ نہ

ہو مجھ پر برس پڑیں۔ اس نے سوچتے ہوئے کچن کا رخ کیا۔ اس نے رات کو خالہ امی سے اس بات کا ذکر کیا تو انہوں نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی۔ ''ہوگا ان کا کوئی آپس کا مسئلہ۔ ہمیں تو وہ لینے کی کیا ضرورت ہے۔''

پھر دو دن اسی خاموشی سے گزر گئے۔ اسے بڑی بے چینی تھی۔ تیسرے دن خالہ امی ڈاکٹر کو دکھانے گئیں تو وہ بھی ان کے ساتھ گئی۔ واپسی پر چھوٹی خالہ صحن میں بیٹھی تھیں۔ خالہ امی ان کے پاس بیٹھ گئیں۔

''چھوٹی خالہ! رخشی کہاں ہے۔؟'' اس نے کھڑے کھڑے پوچھا۔

''اندر سو رہی ہے۔'' وہ بیزاری سے بولیں۔ سونے کا مطلب وہ سمجھتی تھی، اس لیے خاموشی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئی۔

بس اب تو اس گرمی سے جان چھوٹنے والی ہے۔ اگست اور پھر ستمبر۔ اس نے اوپر آسمان پر کہیں کہیں بادلوں کے ٹکڑوں کو دیکھ کر سوچا اور چھت پر پانی چھڑکنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد خالہ امی بھی اوپر آ گئیں۔

''پتا نہیں کیا بات ہوئی ہے نیچے۔ جمیلہ کا مزاج اچھا نہیں لگ رہا تھا۔'' وہ چائے پیتے ہوئے بولیں۔

''ہوگا ان کا آپس کا مسئلہ، ہمیں تو وہ لینے کی کیا ضرورت۔'' اس نے جتا کر انہیں اسی لہجے میں جواب دیا۔

''عصمی! بڑی تیز ہو گئی ہو تم۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے اسے گھورا۔

''خالہ امی! آپ زیادہ نہ سوچا کریں۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا اس سے آپ کا بی پی لو ہو جاتا ہے۔ خوش خوش رہا کریں۔'' وہ ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر بولی۔

''میں تو خوش ہی رہتی ہوں۔ مجھے بھلا کیا غم ہے۔'' انہوں نے اس کا ماتھا چوم کر کہا۔ ''میری بیٹی انٹر کر لے گی۔ میں اور خوش ہو جاؤں گی۔''

''ان شاء اللہ، بلکہ ماشاء اللہ۔'' وہ ہنسی۔

اگلے دن وہ صبح کام ختم کرتے ہی نیچے آ گئی۔ چھوٹی خالہ تو اندر کمرے میں لیٹی ہوئی تھیں، رخشی اپنے کمرے میں فون کر رہی تھی۔ وہ وہیں جا کر بیٹھ گئی تو باتیں کرتی رخشی نے

اپنی آواز مدھم کر لی کہ اسے خواہ مخواہ شرمندگی نے آ گھیرا۔ وہ اٹھ کر باہر آ گئی۔ کچھ دیر صحن میں ٹہلتی رہی پھر چپکے سے اوپر آ گئی۔ سرفروز بھی جب سے چھٹیاں ہوئی تھیں گاؤں گئے ہوئے تھے۔ ان کے کمرے میں بھی تالا لگا ہوا تھا۔

پھر وہ دوبارہ نیچے گئی ہی نہ اور نہ ہی رخشی اوپر آئی۔ وہ عجیب سی ہو گئی تھی۔ روکھی اور بیزار۔ ایک دو بار منڈیر سے ہی اس نے رخشی کو اوپر آنے کی دعوت دی تو وہ ''آؤں گی'' کہہ کر ٹال گئی۔ اس دن خالہ امی کے ساتھ ڈاکٹر کے یہاں سے آتے ہوئے اس کا سامنا ہو گیا۔ وہ تخت پر بیزاری سے بیٹھی تھی۔ عصمی کے حال چال پوچھنے پر اس نے صرف 'ہوں، ہاں' میں جواب دیا۔ ماں بیٹی میں بھی کچھ ٹھنی ہوئی لگتی تھی۔ اسے کیا ضرورت تھی کریدنے کی۔

اگست کی بارشیں شروع ہو گئی تھیں، جب ان کا رزلٹ آؤٹ ہوا تھا۔ سرفروز جس دن اس کا رزلٹ آیا اسی روز گاؤں سے لوٹے تھے۔ وہ سیکنڈ ڈویژن میں بہت اچھے نمبر لے کر پاس ہوئی تھی۔ خالہ امی نے مٹھائی منگوا کر حاجن کے ہاتھ سارے محلے میں بھجوائی تھی۔

اسی شام رخشی کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ حاجن خالہ امی کو بلانے نیچے چلی گئیں اور پھر رات گئے تک نہ لوٹیں۔ آخر انتظار کرتے کرتے وہ گیارہ بجے ہار کر نیچے اتری۔ نیچے صرف فرید چچا تھے۔

''چچا جان! خالہ امی کہاں ہیں؟'' اس نے گم صم بیٹھے چچا فرید سے پوچھا۔

''وہ ڈاکٹر کے پاس گئی ہیں تمہاری خالہ کے ساتھ۔'' انہوں نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

''کیوں، خیریت تھی۔ کیا ہوا تھا رخشی کو؟''

''ہاں، بس طبیعت خراب ہو گئی تھی اس کی۔'' انہوں نے ٹالنے والا جواب دیا۔

پھر دوبارہ اس نے کچھ نہ پوچھا۔ کچھ دیر کھڑی رہی پھر باہر دالان میں تخت پر آ کر بیٹھ گئی۔ بیٹھے بیٹھے تھک گئی تو لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر میں اسے نیند آ گئی۔

''عصمی! یہاں کوئی سوئی ہوئی ہو؟'' خالہ امی اس پر جھکی ہوئی پوچھ رہی تھیں۔

''آپ آ گئیں، خالہ امی! مجھے اوپر بڑا ڈر لگ رہا تھا۔ آپ کا پتا کرنے نیچے آئی

تھی۔" وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔

"چلو اوپر چلتے ہیں۔" ان کا لہجہ عجیب دکھی سا ہو رہا تھا۔

"رخشی اور چھوٹی خالہ کہاں ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"وہ ڈاکٹر کے کلینک ہی ہیں۔ صبح تک آ جائیں گی، تم چلو اوپر۔" وہ سلیپر پیروں میں ڈال کر کھڑی ہو گئی۔

"کیا زیادہ طبیعت خراب ہو گئی تھی رخشی کی؟" سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے خالہ امی سے پوچھا۔

"ہوں۔" انہوں نے مختصراً کہا۔

"کیا ہوا تھا۔ صبح تو اچھی بھلی تھی۔" آخری سیڑھی پہ پہنچ کر وہ پھر سوال کر بیٹھی۔

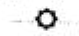
خالہ امی چپ رہیں۔

اوپر پہنچ کر جب اپنے بستر میں بیٹھ گئیں تو وہ کھانا گرم کرنے چلی گئی۔

"رہنے دو اب کھانا۔ بس دودھ ٹھنڈا کر کے لے آؤ۔ اب اتنی رات کو کیا کھانا۔" انہوں نے آواز لگائی۔

"خالہ امی! کیا ہوا رخشی کو۔ آپ نے بتایا نہیں۔" لیٹتے لیٹتے اس سے رہا نہ گیا تو پھر پوچھ بیٹھی۔

"فوڈ پوائزنگ" کی وجوہات سوچتے سوچتے پتا نہیں کب نیند کی وادی میں اتر گئی۔



دوسرے دن شام کو رخشی آئی تو اس نے خیریت پوچھنے نیچے جانا چاہا تو خالہ امی نے اسے روک دیا۔

آخر تیسرے دن صبح کی صفائی کر کے وہ پھر خالہ امی کے پاس آ بیٹھی۔

"خالہ امی! جاؤں نیچے، اتنے دن ہو گئے ہیں۔ رخشی کیا کہے گی؟" وہ کچھ لجاجت سے بولی۔

"جاؤ لیکن پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگانا۔ مجھے آ کر دوائی دینی ہے۔" انہوں نے طوعاً کرہاً اسے اجازت دی۔

"آپ ابھی لے لیں" اس نے کام نپٹانا چاہا۔

"نہیں تم ہو آؤ۔ جلدی آنا۔" پتا نہیں انہیں کیا پریشانی تھی۔ وہ سر ہلا کر نیچے آ گئی۔ چھوٹی خالہ کچن میں تھیں اور رخشی اپنے کمرے میں لیٹی تھی۔

وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ یہ وہ رخشی تو نہ تھی جو لاہور سے ایسے آئی تھی جیسے کوئی کھلا ہوا گلاب ہو۔ یہ رخشی تو اس کا کوئی سایہ لگ رہی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور پیلا زرد رنگ اور ہنسلی کی ہڈیاں دونوں طرف سے نکلی ہوئی تھیں۔

"کیا حال ہے رخشی؟" اس نے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں۔" اس کا لہجہ ہنوز بے مروت سا تھا۔

"کیا طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تھی؟"

"ہوں۔"

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا پوچھے، وہ تو بالکل اجنبی بنی بیٹھی تھی۔

"تمہارا رزلٹ آ گیا؟" یہی بات اس کے ذہن میں آئی۔

"آ گیا ہو گا۔" اس نے بے نیازی سے کہا۔

"تمہیں نہیں پتا چلا؟"

"نہیں۔"

"اب کیسی طبیعت ہے؟" وہ اس کا رویہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

"کیا نظر آتا ہے تمہیں" اس کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

"کافی کمزور ہو گئی ہو۔ رخشی! تمہیں کیا ہوا ہے؟" وہ ہمدردی سے اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔

"جب بجلی ٹھوکر لگتی ہے نا تو آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے پھر اس اندھیرے کے چھٹتے چھٹتے بہت سے منظر بدل جاتے ہیں۔" اس کی بات عصمی کے سر سے گزر گئی۔ پھر کچھ دیر یونہی گزر گئی۔

"لاہور اب کب جاؤ گی؟"

"شاید کبھی نہیں۔" اک ملال افسردگی، یا حیت پتا نہیں کیا کیا اس کے لہجے سے

عیاں تھا۔

"جاؤں گی کچھ عرصے تک۔" تھوڑی دیر بعد وہ بولی۔

"معصی! تمہیں آپا بلا رہی ہیں اوپر۔" چھوٹی خالہ نے پردہ اٹھا کر خشک لہجے میں اسے پیغام پہنچایا تو وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم آنا اوپر۔ آج کل اوپر کا موسم بہت اچھا ہو رہا ہے۔" اس نے کھڑے ہوتے ہوئے اسے دعوت دی۔

"موسم تو اندر ہوتا ہے۔ اوپر تو صرف دھوکا ہوتا ہے۔" اسے لگا زخشی اپنے حواسوں میں نہیں ہے۔

پھر وہ دوبارہ نیچے نہ گئی، کتنے ہی دن۔

سرفروز نے اسے بی اے کی تیاری کرنے کے لیے کہا تو وہ ٹال گئی۔

خالہ امی کی طبیعت اب ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ پتا نہیں کیا بیماری تھی انہیں۔ ڈاکٹر جاوید کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا تھا۔



موسم تیزی سے بدلنا شروع ہو گیا تھا۔ آسمان نے سرِشام ہی بام کی طرف جھکنا شروع کر دیا تھا۔ ہوا میں خنکی آ گئی تھی۔ دھوپ کی حدت میں کمی آتی جا رہی تھی۔ صبح سورج کو اپنی کرنیں پوری چھت پر پھیلانے میں کافی وقت لگتا تھا۔ دن میں تیز اور ٹھنڈی ہوائیں چلتی تھیں۔ درختوں کے پتے اترنا شروع ہو گئے تھے۔ اور جو درختوں پر موجود تھے ان کی رگوں میں زردی دوڑنا شروع ہو گئی تھی۔ شاموں میں اداسیاں گھلنے لگی تھیں۔ دن چھوٹے ہو رہے تھے اور راتوں کی طوالت بڑھ رہی تھی۔ اس کا پسندیدہ موسم شروع ہونے والا تھا۔ وہ اس بات پر خوش تھی لیکن کوئی چیز تھی اندر جو اسے خوش نہ ہونے دے رہی تھی۔

خالہ امی کو روز بخار ہو جاتا۔ روز میڈیسن بدلنے سے بھی افاقہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ دنوں میں ہی اتنی کمزور ہو گئی تھیں کہ روز نیچے اتر کر ڈاکٹر کو دکھانے بھی نہ جا سکتی تھیں۔ چچا فرید کے کہنے پر وہ انہیں لے کر کچھ دنوں کے لیے نیچے ہی شفٹ ہو گئی۔

مگر ان کی طبیعت بجائے سنبھلنے کے بگڑتی چلی گئی۔ نومبر کا آخری ہفتہ تھا۔ رات

سرما کی پہلی بارش ہوئی تھی مگر اس کو بارش پر بہت غصہ آیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا بارش رو رہی ہے نحوست پھیلا رہی ہے۔

خالہ امی کا بخار بہت تیز تھا اور وہ نیم بے ہوشی میں پڑی تھیں۔ وہ کچھ دیر تو بے بسی سے انہیں دیکھتی رہی پھر چچا فرید کو بلانے چل پڑی۔ جگنو تو ایک عرصے سے لاہور میں تھا۔

"جگنو بھی نہیں آیا، کتنے فون کیے ہیں اس کو۔ اوپر سے آپا کی حالت مجھے تو وہ ٹھیک ہوتی نظر نہیں آتیں۔ ڈاکٹر نے بھی جواب دے دیا ہے۔" چھوٹی خالہ پریشان آواز میں کہہ رہی تھی۔

"اور اولاد کو سر پہ چڑھاؤ۔ تم نے اوتار سمجھ لیا تھا ان ناخلفوں کو، نیک اور پارسا۔ دیکھا کیا گل کھلایا تمہاری معصوم بچی نے اور وہ ملعون پانچ سالوں سے ایم اے نہیں کر پا رہا اور کیا وہ یونہی بیٹھا ہوگا وہاں۔ جن خبیثوں کی صحبت میں وہ دن رات رہتا ہے وہ اسے آنے دیں گے ادھر۔"

چچا فرید کی آواز خاصی بلند تھی۔ "اور وہ ادھر آئے بھی کیوں؟ پیسوں کے لیے آتا ہے نا۔ وہ تم اسے بھجوا دیتی ہو۔ بڑی پڑھائیاں کر لیں دونوں نے۔ بڑے تمغے اور گولڈ میڈل پہنا دیے ماں باپ کے گلوں میں باپ کے۔"

"آہستہ بولیں، اب جوان بیٹے کو میں باندھ کر تو نہیں بٹھا سکتی تھی گھر میں۔ سب پہ یہ وقت آتا ہے۔ آپ کو یاد نہیں رہا تو الگ بات ہے۔" چھوٹی خالہ ترخ کر بولی۔

"بکواس نہ کرو۔ یوں ماں باپ کی عزتیں چوراہوں پر نہیں اچھالتے پھرتے تھے ہم۔ تمہاری اسی ڈھیل نے ان حالوں کو پہنچایا ہے۔ بیٹے کو تم باندھ نہیں سکتی تھیں، بیٹی پر تو نظر رکھ سکتی تھیں۔ تم سے تو یہ بھی نہ ہو سکا۔" ان کا لہجہ زہر آلود تھا۔

"اچھا بس بہت ہو گئی ہے، بڑے طعنے سن لیے میں نے۔ اکیلی میں ہی ذمہ دار نہیں ان خرابیوں کی۔ آپ سوئے ہوئے تھے خود خبر گیری کر لیتے۔ ہونہہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ اگر خود کو تماشا بنوانے کا شوق ہے تو خوب چیخیں۔ گلی میں لوگوں کو پکڑ پکڑ کر بتائیں کہ آپ کی اولاد نے کیا کیا ہے۔ جسے نہیں خبر اسے بھی بتائیں۔ یہاں پارسا کون ہے؟" وہ بے چاپ واپس آ گئی۔

اور شام تک خالہ امی کی طبیعت بے حد بگڑ گئی۔

بخار کی شدت سے ان کا جسم کپکپا رہا تھا اور وہ تکیے پر بے چینی سے سر زور زور سے پٹخ رہی تھیں۔ ابھی ڈاکٹر دیکھ کر گیا تھا لیکن کچھ افاقہ ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ عصمی کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔

"جمیلہ! اب میرا بچنا محال ہے۔ میرے بعد عصمی کا کیا ہوگا۔" بخار ذرا ہلکا ہوا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ ان کی آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔

"آپا! اللہ مالک ہے، کیسی باتیں کرتی ہیں۔ اللہ نے چاہا تو تم ٹھیک ہو جاؤ گی، فکر نہ کرو۔" چھوٹی خالہ نے ہاتھ پکڑ کر انہیں دلاسا دیا۔

"نہیں جمیلہ! اب میں ٹھیک نہیں ہوں گی، مجھے پتا ہے۔ مجھے بتاؤ عصمی کا کیا ہوگا۔ میرا اللہ مجھے اتنی مہلت دیتا۔" اس کا سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا۔

"آپا! تم لیٹ جاؤ، ایسی باتیں نہ کرو۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔" چھوٹی خالہ کی آواز بھرا گئی۔ اتنے برسوں کا ساتھ تھا ان کا۔ خالہ امی کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ کونے میں فرید چچا بھی سر جھکائے بیٹھے تھے۔ ایک طرف رخشی بھی بیٹھی تھی۔

"یہ دیکھو جمیلہ! یہ میرے بندھے ہوئے ہاتھ دیکھو۔ میری عصمی کا میری آنکھوں کے سامنے کچھ کر دو خدا کے لیے۔ فرید بھائی میں تمہیں اللہ کا واسطہ دیتی ہوں۔"

وہ لیٹے لیٹے پھر تڑپ کر اٹھ بیٹھیں اور ان کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ کر بولیں۔

"خالہ امی! خالہ امی! ایسا نہ کریں خدا کے لیے۔" وہ روتی ہوئی ان کے بندھے ہوئے ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگا کر بولی۔

"عصمی! تو جا یہاں سے۔" وہ اس کے ہاتھ جھٹک کر بولیں۔ "جا تو باہر۔"

وہ زور سے بولیں تو فرید چچا نے پیچھے سے آ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے باہر جانے کا اشارہ کیا تو وہ روتی ہوئی باہر نکل گئی۔ رخشی بھی اس کے ساتھ باہر آ گئی۔

"فرید بھائی! تمہیں تو اس زمانے کی خبر ہے نا۔ یہاں تو ماں باپ والیاں محفوظ نہیں، میری بچی تو بالکل بے آسرا ہو جائے گی۔ مجھ مرتی کی فریاد سن لو جگنو، جگنو کو ہی بلا دو۔ اسی سے۔" وہ تکیے پر سر پٹخ کر رونے لگیں۔

"بھابھی، بھابھی! اللہ کا آسرا بہت ہے بے سہاروں کے لیے۔ کیوں دل چھوٹا کرتی ہو۔ اتنی سی تھی جب ماں باپ اٹھ گئے۔ تب بھی اللہ نے تمہارا آسرا اسے دیا۔ اب بھی وہی مالک ہے۔ کیوں جی ہوا کرتی ہو۔ ہم ہیں عصمی کے ماں باپ۔" فرید چچا نے پاس بیٹھ کر نرمی سے انہیں سمجھایا۔

"نہیں نہیں۔ یہ جھوٹی تسلیاں نہ دو مجھے۔ وہ وقت اور تھا، اور میں نے اسے آسرا دیا کہ مجھے بھی تو جینے کے لیے کچھ چاہیے تھا۔ پر اب اسے کسی مضبوط سہارے کی ضرورت ہے۔ فرید بھائی! اللہ تمہیں سلامت رکھے کچھ کرو۔" ان کی سانس ٹوٹنے لگی اور پھر غشی طاری ہونے لگی۔

"یا اللہ تو رحم کر۔ جائیں ڈاکٹر کو پھر بلائیں۔ آپا کی حالت بگڑتی جا رہی ہے۔" چھوٹی خالہ نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

"تو روز گیا ہوا ہے ڈاکٹر کو بلانے۔ اوپر سے موسم بھی خراب ہے، بارش شروع ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر بے چارہ کیا کرے۔ اس نے تو جواب دے دیا ہے کہ میرے بس کا کام نہیں یہ۔ آپ لاہور لے جائیں۔ پر اس وقت کیسے لے جائیں۔ جگنو ہوتا تو شاید کچھ کر لیتے۔ موسم بے حد خراب ہو رہا ہے۔" ان کا لہجہ فکر مند تھا۔

اسی وقت تو روز اور ڈاکٹر اندر داخل ہوئے۔ دونوں بھیگے ہوئے تھے۔

بارش تیز ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر نے اندر آ کر اپنا فرسٹ ایڈ باکس دوسری کرسی پر رکھا اور اسٹیتھو سکوپ نکال کر دل کی دھڑکن چیک کرنے لگا۔

"میں نے تو فرید صاحب سے کہا تھا آپ انہیں لاہور لے جائیں، ان کی حالت خدانخواستہ کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا ہے۔ یہاں میرے پاس اتنی سہولتیں نہیں کہ مکمل ٹریٹمنٹ دے سکوں۔" تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر نے سنجیدہ انداز میں کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ کی بات صحیح ہے لیکن اس موسم میں۔ آپ کچھ ایسا کر دیں صبح تک۔ پھر اللہ نے چاہا تو میں صبح ہوتے ہی کچھ کروں گا۔" وہ لجاجت سے بولے۔

"وہ تو میں کر ہی رہا ہوں۔ آگے جو اللہ کو منظور۔" ڈاکٹر نے سرنج میں دوائی ڈالتے ہوئے کہا۔ دوائی کے زیر اثر وہ دو تین گھنٹے سو رہیں۔

جونہی رات گہری ہوئی گھنے بادلوں نے سارے آسمان کو گھیر لیا اور دو گھنٹے سے گھنے گھنے بادل قطرہ قطرہ برسنے لگے۔

ان کا بخار یک لخت اتر گیا اور جسم ٹھنڈا ٹھار ہو گیا۔ چھوٹی خالہ نے ان کے اوپر لحاف دیا لیکن ان کی سردی میں کمی نہیں ہو رہی تھی۔

''جمیلہ! اس کو پرے کرو۔ عصمی کہاں ہے، اسے بلاؤ۔'' انہوں نے ایک دم لحاف پرے کرتے ہوئے گھبرا کر کہا تو دروازے میں پژمردہ کھڑی عصمی اندر آ گئی۔

''نہیں کچھ کیا تم لوگوں نے۔ جمیلہ! میں یونہی چلی جاؤں گی نامراد۔ کیا منہ دکھاؤں گی جا کر اس کی ماں کو۔ ہائے مجھے کیا ہو رہا ہے۔'' وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھیں۔

''آپا! ڈاکٹر نے کہا ہے تم ٹھیک ہو جاؤ گی، بس حوصلہ کرو۔'' چھوٹی خالہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''نہ دو مجھے یہ دلاسے۔ مجھے پتا ہے میرا وقت قریب آ گیا ہے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔'' جگنو، جگنو نہیں آیا۔ جمیلہ میں کیا کروں۔'' مجھے مر کر بھی چین نہیں آئے گا۔ میری بچی کیا کرے گی میرے بعد ہائے۔'' وہ تکیے پر سر پٹخنے لگیں۔

ان کی حالت دیکھ کر چھوٹی خالہ کا اپنا دل پانی ہونے لگا۔ انہوں نے سچے دل سے جگنو کے آنے کی دعا مانگی۔

''جمیلہ! میری بات سنو۔'' فرید چچا نے انہیں اشارے سے بلایا تو وہ دونوں اٹھ کر باہر چلے گئے۔

وہ خالہ ای کے پاس بیٹھ کر ان کی پیشانی پر ہاتھ پھیرنے لگی وہ بے بسی سے اسے دیکھنے لگیں۔ ان کی آنکھوں سے جھانکتی دہشت سے اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر ان کا ماتھا سہلاتی رہیں۔ ان پر کچھ غنودگی طاری ہو گئی۔

''آخر اس میں حرج کیا ہے۔ آخر کہیں نہ کہیں ہاں بھرنی ہی پڑتی ہے۔'' چھوٹی خالہ کی سرگوشی اسے کھڑکی کی طرف سے سنائی دی۔

''آپ کو تو پھپھو! سب پتا ہے پھر بھی۔'' یہ نوروز کی جھلی ہوئی مدھم آواز تھی۔

''وہ معاملہ تو ختم سمجھو بلکہ اسے تو تم بھول ہی جاؤ۔ تمہاری ذرا سی ہمدردی سے اگر

کسی کو ابدی سکون مل سکتا ہے تو دیر کیوں کرتے ہو؟'' چھوٹی خالہ کی سرگوشی اب کچھ بلند تھی۔

''یہ ٹھیک نہیں ہے پھپھو! جب تک وہ معاملہ۔''

''دفع کرو اس معاملے کو۔ عصمی میں کیا برائی ہے۔''

''میں کب یہ کہہ رہا ہوں۔'' وہ جھنجلا کر بولے۔

''تو پھر چھوڑ دو سب سوچوں کو۔ جو میں کہہ رہی ہوں وہ کرو۔''

''یہ کرنا اتنا آسان ہے۔ نہیں پھپھو! میں نہیں کر سکتا۔'' ان کا لہجہ دوٹوک تھا۔

''دیکھو نوروز! میں نے ہمیشہ تمہیں جگنو ہی کی طرح سمجھا ہے۔ بس حالات کچھ ایسے رہے کہ ۔۔۔ اس وقت یہ باتیں فضول ہیں۔ اگر آج میرا جگنو ہوتا تو کیا مجھے اس کی اتنی منتیں کرنی پڑتیں، وہ میرے ایک بار کہنے پر تیار ہو جاتا۔ چاہے کتنا ہی مجبور کیوں نہ ہو اور ویسے تم مجھے ماں کی جگہ سمجھتے ہو۔ مجھے بڑا مان ہے تم پر۔ میرا اتنا سا کہا نہیں مان سکتے۔'' ان کا لہجہ روٹھا روٹھا سا تھا۔

''پھپھو! یہ اتنی سی بات نہیں ہے۔ یہ تو زندگی بھر کے معاملے ہیں۔'' نوروز نے انہیں مسئلے کی نزاکت کا احساس دلایا۔

''کبھی کبھی زندگی بھر کے معاملے یونہی عجلت میں سلجھ جاتے ہیں۔ تمہیں اللہ پر بھروسہ نہیں؟'' وہ خفگی سے بولیں۔

''یہی تو میں کہہ رہا ہوں آپ سے۔ اللہ پر بھروسہ کریں، خالہ جان ٹھیک ہو جائیں گی۔'' نوروز نے انہیں تسلی دی۔

''بس رہنے دو اپنی ہمدردیاں۔ اللہ جگنو ہی آ جائے بے چاری آپا نے ساری زندگی نے بعد مجھ سے آخری لمحوں میں مانگا بھی تو کیا۔'' وہ بے بسی سے بولیں۔ ''کتنے احسان ہیں ان کے مجھ پر۔ مجھ یتیم کو فرید کی مخالفت کے باوجود بیاہ لائیں پھر سارا گھر میری حوالے کر کے نو تیج دھوپوں میں بسیرا کر لیا کہ جمیلہ تم بچوں والی ہو، مجھے تو ایک کمرہ بہت ہے اور میں ان نے ایک احسان کا بدلہ نہیں اتار سکی۔'' وہ شاید رونے لگی تھیں پھر باہر مکمل خاموشی چھا گئی۔

تھوڑی دیر بعد خالہ ای کی آنکھ کھل گئی۔ اسی وقت چچا فرید اندر داخل ہوئے۔ ان

کے پیچھے چھوٹی خالہ اور ان کے پیچھے نوروز اور ان کے ساتھ گئے کے تین چار لوگ تھے۔ عصمی گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"بیٹھ جاؤ بیٹا؟" چچا نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"فاطمہ بھابھی! نوروز عصمی سے نکاح پڑھانے کو راضی ہے۔ اگر تمہیں منظور ہو تو نکاح ابھی پڑھا دیا جائے۔" فرید چچا نے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا تو عصمی کی ٹانگیں تھر تھر کانپنے لگیں۔

"نہیں، نہیں خالہ امی! الفاظ اس کے حلق میں اٹک گئے اور آنکھوں میں جیسے دسمبر کی دھند بھر گئی۔

خالہ امی نے تھکی مسکراہٹ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اور تھوڑی دیر میں فرید چچا نے اس کا کانپتا لرزتا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر نکاح نامے پر سائن کروا لیے۔

بھیگتی رات نے جیسے کتنے قطرے اپنے اندر اتار لیے۔

رات جتنی پر اسرار اور اذیت ناک تھی، صبح اس سے زیادہ وحشت زدہ تھی کہ تین بجے جو اس کے نکاح کے بعد خالہ امی نے سکون سے آنکھیں موندیں۔ اس کے بعد کھولی ہی نہیں اور خاموشی سے لمبے سفر پر روانہ ہو گئیں اس کے آنسو اور سسکیوں کی پروا کیے بغیر۔

اور بارشوں کو رونے کا جواز مل گیا۔



اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ اب کتاب زیست کو کون سے صفحے سے پڑھنا شروع کرے۔ سارے حرف جیسے گڈمڈ ہو کر رہ گئے تھے۔ خالہ امی نے جس بے وفائی سے اس کا ساتھ چھوڑا تھا اسے اب کسی کی وفا پر اعتبار نہ رہا تھا۔ بیچ صحن ہمہ وقت پرسہ دینے والوں سے بھرا رہتا تھا اور سارا وقت سر جھکائے یا تو سیپارہ پڑھتی رہتی یا آنسوؤں کی چادر آنکھوں پر تانے خالہ امی کی شبیہ تکتی رہتی۔ دسمبر کی دھند نے ہر چیز کو اپنے غبار میں لے رکھا تھا۔ کوئی بھی منظر واضح نہیں ہو رہا تھا۔

پھر آہستہ آہستہ لوگوں کی آمد و رفت بھی کم ہونے لگی۔ گھر میں سناٹے بولنے

لگے۔ جگنو سارا دن گھر سے باہر گزارتا اور رخشی اپنے کمرے میں بند ویڈیو پر ہلکی آواز میں مووی دیکھتی رہتی۔ فرید چچا کی خاموشی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا اور نوروز کے نہ آنے کا پتا چلتا نہ جانے کا۔ وہ پیٹنٹ لیدر کے شوز پہنتے تھے۔ بے آواز قدموں سے دو تین دنوں بعد کمرے میں چھوٹی خالہ کے پاس آتے پھر اسی طرح واپس چلے جاتے اور اس کا سر ان کی آمد پر جیسے مزید زمین میں دھنس جاتا۔

چالیسواں بھی ہو گیا لیکن زندگی پھر چھایا ہوا جمود جیسے ثبت کر رہ گیا۔ ان دنوں کچھ وقفے کے بعد پھر سے بارشیں شروع ہو گئی تھیں۔ وہ بھی ایک گیلی نم آلود صبح تھی۔ جب باہر دروازے پر ایک مرسیڈیز آ کر رکی۔

وہ چھوٹی خالہ کے پاس بیٹھی گاجریں چھیل رہی تھی۔ جب ایک ادھیڑ عمر کی فیشن ایبل اور سوبر سی عورت اندر داخل ہوئی۔ اس نے میرون ویلوٹ کا قیمتی سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے اوپر فر کا بیش قیمت کوٹ۔ گلے میں ڈائمنڈ کا نیکلس دور ہی سے جگمگا رہا تھا۔ اس کی چال میں ایک کر و فر تھا، ایک احساس تمکنت۔ اس کے پیچھے شاید اس کی بیٹی تھی۔ خوبصورتی کو اگر مجسم کیا جا سکتا تو وہ اس لڑکی کی شکل میں سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی۔ رائل بلو گرم سوٹ، بلیک شوز اور بلیک کوٹ میں اس کا دراز قد اسے عجیب سی شان عطا کر رہا تھا۔ وہ انہیں نہیں پہچان سکی تھی۔ لیکن چھوٹی خالہ نے کچھ وقت کے بعد شاید انہیں پہچان لیا تھا۔ اسی لیے جلدی سے چھری ہاتھ سے رکھ کر استقبال کو آگے بڑھیں۔

"مہناز! مہناز بھابھی ہیں نا آپ؟" چھوٹی خالہ نے کچھ گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔

عورت نے کچھ نخوت سے اثبات میں سر ہلایا اور ڈائمنڈ کی رنگز سے سجایا ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"نوروز کہاں ہے؟" اس کی بلند آواز سن کر اپنے کمرے میں بیٹھا جگنو باہر آ گیا۔

"وہ تو کالج گیا ہوا ہے۔ آپ آئیں، بیٹھیں نا۔" چھوٹی خالہ کچھ لجاجت سے بولیں۔

"اب تو بیٹھنا ہی پڑے گا۔" اس نے ناقدانہ نظروں سے ارد گرد کا جائزہ لے کر شاید بیٹھنے کے لیے جگہ دیکھنی چاہی۔

"ادھر آ جائیں۔" چھوٹی خالہ انہیں دالان میں پڑے صوفے کی طرف لے

آ گئیں۔

لڑکی بھی کچھ ابرو چڑھا کر ارد گرد کا جائزہ لے رہی تھی۔ ماں کے ساتھ صوفے پر ہی بیٹھ گئی۔

"آپ جمیلہ ہو۔ آں جہانگیر بھائی کی بہن۔" وہ صوفے پر بیٹھ کر ذرا تکلف سے بولی۔

"جی ٹھیک پہچانا آپ نے۔ میں جہانگیر کی بہن ہوں۔" چھوٹی خالہ اپنے پہچان لیے جانے پر خوش ہو کر بولیں۔

"نوروز کب سے ہے یہاں پر۔" ان کے چتون پر ہنوز شکنیں پڑی تھیں۔ جگنو ذرا تولتی نظروں سے اپنے کمرے کی چوکھٹ پر کھڑا ان کا جائزہ لے رہا تھا۔

"اب تو سال ہونے کو آیا ہے۔ اسے یہاں آئے۔"

"اور یہاں آ کر جم کر بیٹھ گیا، اپنی اوقات میں آ گیا۔ نالی کی اینٹ کو چوبارے پر لگا بھی دو تو وہ اپنی اوقات کا اعلان وہ دور ہی سے کر دے گی۔" وہ صوفے کے بازو پر ہاتھ مار کر بولیں۔

"ماما!" اس کی نازک مزاج بیٹی نے احتجاج کیا۔

"تمہاری فرسٹریشن نے یہ دن دکھایا ہے جو ہمیں گلے گلے کے لوگوں کو منہ لگانا پڑ رہا ہے۔" اس نے بیٹی کو جھاڑا تو اس نے منہ بسور کر چہرہ باہر کی طرف گھما لیا، جہاں اس کی نظریں دروازے پر ایستادہ جگنو سے ٹکرائی جو اس کو فوکس کیے ہوئے تھا۔

"میں نے سنا ہے اس نے یہاں کوئی چکر وکر چلا لیا ہے۔" وہ کچھ دیر بعد بولیں۔

"کیا چکر جی؟" چھوٹی خالہ حیرت سے بولیں۔

"کوئی نکاح وغیرہ کر لیا ہے۔ اس نے۔" اب کے وہ دوٹوک انداز میں بولیں۔

"ہاں کیا تو ہے۔" چھوٹی خالہ ہچکچا کر بولیں۔

"واٹ، واہی بنایا ہوا ہے اس نے نکاح کو۔" وہ دھاڑیں۔

"ماما!" لڑکی کچھ حیرت اور صدمے سے بولی۔

"شٹ اپ ماہی! تم خاموش رہو۔ آپ کو پتا ہے پہلے سے نکاح کیا ہوا ہے اس

نے میری بیٹی سے اور میں تو اسے لینے آئی تھی کہ کچھ اڑتی سی ہوا سنی تھی میں نے۔ کہا کسی نے پروپیگنڈہ کیا ہو گا مگر یہ تو سچ نکلا۔ میں تو اسے کورٹ میں گھسیٹ لے جاؤں گی۔ اس نے کیا کھیل سمجھا ہے میری بیٹی کی زندگی کو۔" وہ تیز تیز بولنے لگیں۔

"پر وہ تو کہتا ہے کہ یہ معاملہ ختم کر چکا ہے۔" چھوٹی خالہ نے دبے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ختم کر چکا ہے۔ وہ کون ہوتا ہے ختم کرنے والا۔ اب یہ تو میں اسے بتاؤں گی کہ یہ معاملے کیسے ختم ہوتے ہیں۔ ہمارے ٹکڑوں پر پلنے والا آج ہماری عزت کو للکارنے لگا۔ ماہی! کال کرو اپنے پپا کو، وہ فوراً آئیں اور اپنے لائر کو بھی ساتھ لائیں۔" وہ بیٹی کی طرف پلٹ کر بولی تو اس نے جھٹ کر ہینڈ بیگ سے موبائل نکال کر ماں کے حکم کی تعمیل کرنی چاہی۔

"دیکھیں آپ کا جو بھی معاملہ ہے اسے اپنے گھر میں جا کر سیٹل کریں۔ ہم لوگوں کو بیچ میں کیوں گھسیٹ رہی ہیں۔" جگنو نے آگے بڑھ کر لڑکی کے ہاتھ سے موبائل چھینتے ہوئے کہا۔

"ہمارے کیس کا اصل مجرم اس گھر میں ہے، اس لیے معاملہ بھی یہیں طے ہو گا۔ تم کون ہوتے ہو بیچ میں بولنے والے؟" وہ عورت غصے سے جگنو کے آگے کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

"میں اس گھر کا مالک ہوں۔ البتہ آپ یہاں سے چلتی پھرتی نظر آئیں۔" جگنو نے موبائل آف کر کے لڑکی کو تھمایا۔

"جگنو! یہ ہمارے مہمان ہیں۔ مہمانوں سے اس لہجے میں بات نہیں کرتے۔" چھوٹی خالہ نے اسے ڈانٹا۔ "میرا بیٹا ہے شرجیل ذرا مزاج کا تیز ہے۔" انہوں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

"مہمانوں کو بھی اپنی حد میں رہنا چاہیے۔" وہ تلخی سے بولا۔

"یہ لڑکی کون ہے؟" اس عورت کی نظر اب شاید عصمی پر پڑی تھی۔

"یہ۔" چھوٹی خالہ کو تعارف کرانا کچھ مشکل لگا۔ "یہ وہاب بھائی کی بیٹی ہے عصمت

را ہے۔"

"اوہ۔" عورت نے ہونٹ سکوڑے۔ "یہ ادھر ہوتی ہے۔" آئی سی مگر یہ تو اپنی آنٹ کے پاس کیا نام تھا؟" اس نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"ہیں فاطمہ! اس کے پاس ہوتی تھی۔" وہ اسے یوں دیکھ رہی تھیں جیسے کوئی زمین پر رینگنے والے کیڑے کو دیکھتا ہے اور چھری ہاتھ میں لیے اس کے بدن میں چیونٹیاں رینگنے لگیں۔

"فاطمہ آپا کا مہینہ ہوا انتقال ہو گیا ہے۔" چھوٹی خالہ نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"اوہ اچھا۔ اب یہ کس کے پاس ہوتی ہے؟" اسے پتا نہیں اس کی ذات سے اتنی دلچسپی کیوں ہو رہی تھی۔

"فی الحال ہمارے پاس۔" چھوٹی خالہ نے مختصراً کہا۔

وہ جیسے کچھ مطمئن ہو کر بیٹھ گئی۔ جگنو باہر نکل گیا۔

"شادی وادی نہیں کی کہیں اس کی؟" وہ ہنوز اس پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔

"ہوں، طے کر دی ہے۔" چھوٹی خالہ بتانا نہیں چاہ رہی تھیں۔

"اچھی بات ہے۔ ادھر آؤ، کیا نام ہے تمہارا۔ آں عصمت۔" عورت نے اسے یوں پکارا جیسے کوئی بلی یا کتے کو پکارتا ہے۔ تو وہ کچھ ٹپٹا گئی۔ سوالیہ نظروں سے چھوٹی خالہ کی طرف دیکھا تو وہ سپاٹ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"آجاؤ تائی ہیں یہ تمہاری۔ تمہارے تایا آفتاب کی بیگم۔" چھوٹی خالہ نے کچھ جتا کر اسے کہا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ مہناز نے چہرے پر بناوٹی مسکراہٹ سجائی۔

"باپ جیسی تو نہیں لگتی۔ ہاں آسیہ جیسی لگ رہی ہے۔" وہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولیں۔

وہ خاموشی سے باہر نکل آئی اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئی۔

"ہیں یہ اسے کیا ہوا ہے۔ میں اسے بلا رہی تھی یہ باہر چلی گئی۔" مہناز حیرت سے بولی۔

"ماما! پاپا آ رہے ہیں۔ میں نے انہیں کہہ دیا ہے۔" اس کی بیٹی نے موبائل آف کرتے ہوئے ماں کو خبر دی۔

"چلو اچھا ہے، یہ جھگڑا نپٹا کر ہی جائیں گے۔ یہ کب تک آئے گا نوروز؟" وہ پھر

چھوٹی خالہ سے بولی۔

"آنے والا ہے۔" وہ کچھ بیزاری سے بولیں۔

"ماما! میں بور ہو رہی ہوں۔" لڑکی منہ بسور کر بولی۔

"تمہیں ہی شوق تھا آنے کا۔ ورنہ میں خود ہی یہ سب ہینڈل کر سکتی تھی۔" اسی وقت رخشی اندر کمرے سے نکل آئی تو چھوٹی خالہ نے دونوں کا تعارف کرایا۔

"رخشی! اسے اپنے کمرے میں لے جاؤ، دل بہل جائے گا اس کا جاؤ بیٹا۔" چھوٹی خالہ کے کہنے پر وہ دونوں رخشی کے کمرے کی طرف چل پڑیں۔



وہ پورے پینتالیس دنوں بعد اوپر آئی تھی۔ دونوں کمرے اور چھت سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اس نے کمروں کے بند دروازے کھولے، کمرے دھول مٹی سے اٹے ہوئے تھے۔ دیواروں اور چھتوں سے جالے لٹک رہے تھے۔ وہ کچھ دیر کھڑی دیکھتی رہی پھر خالہ امی کے پلنگ کی طرف بڑھی۔ ایک دم سے اس کا دل بھر آیا۔ وہ ان کے تکیے سے لپٹ کر زور زور سے رونے لگی۔ جیسے بچپن میں وہ اسے سوتا چھوڑ کر نیچے چلی جاتی تھیں تو وہ خوب زور زور سے حلق پھاڑ کر روتی تھی تو وہ بھاگی آ جاتی تھیں مگر اب اسے پتا تھا کہ اسے چپ کرانے کوئی نہیں آئے گا، اس لیے وہ خوب روئی۔ خالہ امی کو آوازیں دے دے کر ان سے ڈھیروں شکوے کیے۔ کتنے دنوں کا چھایا ہوا غبار آنسوؤں کے رستے بہہ نکلا۔ ان کے تکیے سے ابھی تک ان کی خوشبو آ رہی تھی۔ وہ اس خوشبو کو اپنے اندر اتارتی رہی۔ پتا نہیں کب روتے روتے وہ سو گئی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو دھوپ دیواروں پر اپنے پر سمیٹ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر یونہی لیٹی رہی پھر اٹھ کر باہر آ گئی۔

گملوں میں پودے سوکھ گئے تھے۔ چھت پر سوکھے پتوں کا ڈھیر جگہ جگہ لگا تھا۔ وہ کچھ دیر کھڑی اس ویران منظر کو دیکھتی رہی۔ پچھلے سال کے دن اس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگے۔ آنسو پیتے ہوئے اس نے جھاڑو اٹھائی۔ دونوں کمرے اور چھت صاف کرتے کرتے اسے شام ہو گئی۔ اس نے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے۔ نہانے کی ہمت نہیں تھی۔ کوئی اسے بلانے نیچے سے نہیں آیا تھا۔ وہ کچن میں آ گئی۔

"کیا کروں؟ یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔" اس نے بے بسی سے سوچا۔

پھر چاول نکال کر بھگوئے اور پیاز کاٹنے لگی۔ چاول تیار ہونے میں آدھ گھنٹہ لگ گیا۔ چاول کھا کر اس کی جان میں جان آئی۔

"چائے کے لیے دودھ نہیں ہے۔ شاید نیچے حاجن بی ہوں، ان سے منگوا لیتی ہوں۔" وہ خالہ امی کی الماری سے پیسے لے کر منڈیر کی طرف چل دی۔ الماری میں چند سو روپے پڑے تھے۔

منڈیر سے اس نے نیچے دیکھا۔ صحن میں کوئی نہیں تھا۔ سرنوروز کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ رات کے سائے ہر طرف پھیل چکے تھے۔ بادل پھر اکٹھے ہونے شروع ہو گئے تھے نجانے اب کیوں اسے بادلوں سے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ بارش سے پہلے کی خاموشی فضا میں چھائی ہوئی تھی۔ اسے یک دم سے خوف محسوس ہونے لگا کہ وہ چھت پر بالکل اکیلی ہے۔ اگر کوئی کہیں سے آ جائے یا...... خوف سے اس نے جھرجھری سی لی۔ وہ جگہ جہاں اس نے اپنی زندگی کے اٹھارہ انیس سال گزارے تھے۔ ایک دم سے اجنبی اور بیگانی سی لگنے لگی تھی۔ اندھیرے اسے ڈرانے لگے تھے۔ اس نے جلدی سے کمروں اور کچن کے دروازے بند کیے اور پیسے مٹھی میں لیے سیڑھیاں اترنے لگی۔ سیڑھیوں کا بلب فیوز تھا۔ اندھیرے میں اس نے جلدی جلدی سیڑھیاں عبور کیں۔ درمیان والی منزل میں بھی سناٹا تھا۔ سرنوروز کے کمرے میں روشنی تھی مگر دروازہ اب بند تھا۔ اس نے ذرا سا آگے ہو کر کھڑکی میں سے جھانکنے کی کوشش کی، کمرے میں کوئی نہیں تھا۔

وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھی اور ذرا تیزی سے قدم اٹھاتی نیچے آ گئی۔ جب وہ صحن میں پہنچی تو آسمان سے پہلی بوند گری۔ وہ تیزی سے دالان کی طرف بڑھی۔ اندر سے آتی آوازوں نے اس کے قدم روک لیے۔

"تم نے دوسرا نکاح کس سے پوچھ کر کیا؟ بلکہ تم ایسا کرنے کے مجاز ہرگز نہ تھے۔" کوئی گھن گرج والی اجنبی آواز تھی۔

"میرا خیال ہے شرعی طور پر میں نے کوئی گناہ نہیں کیا دوسرے آپ مجھے کہہ چکے ہیں کہ میں اس معاملے کو ختم سمجھوں۔"

"کیا اس طرح کہنے سے یہ معاملے ختم ہو جاتے ہیں۔ بغیر طلاق اور خلع کے تم دوسرا نکاح کیسے کر سکتے ہو؟" یہ آواز اسی عورت کی تھی۔ بارش کی بوندیں ٹپ ٹپ اس پر گرنے لگیں۔

"بہرحال اب تمھیں اسے طلاق دینی ہو گی اور ہمارے ساتھ چلنا ہو گا۔" اسی اجنبی آواز نے کہا۔

"میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

"کیوں تم ایسا نہیں کر سکتے۔ ہم نے تم پر اس لیے روپیہ پانی کی طرح نہیں لگایا تھا کہ ایک روز تم ہمیں یوں آنکھیں دکھانے لگو۔ تمھیں اعلیٰ تعلیم دلوائی، اعلیٰ رہن سہن دیا اور پھر سب سے بڑھ کر اپنی عزت، اپنے اسٹیٹس میں تمھیں اپنے برابر جگہ دی اور تم ہمارے احسانوں کا یہ بدلہ اتار رہے ہو۔" وہ عورت چیخ کر بولی۔ بارش اب تیز ہو گئی تھی۔ اس کے دانت بجنے لگے۔

"ایک سال بعد اپنے احسانوں کا حساب لگانے آئے ہیں۔ سال پہلے تو آپ لوگوں نے مجھے دھتکار دیا تھا کہ جا کر اپنا ٹھکانہ کر لوں۔ میں آپ لوگوں کے قابل نہیں ہوں۔"

"ہم نے سوچا دھکے کھاؤ گے تو عقل ٹھکانے آ جائے گی۔ جنھیں مفت کی منہ کو لگی ہو وہ کم ہی غیرت والے ہوتے ہیں۔" مہناز نے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔

"جب میں واپس نہیں پلٹا آپ لوگوں کی طرف تو پھر اس کا کیا مطلب ہوا۔ یہی نا کہ مجھے ابھی عقل نہیں آئی اور نہ آئے گی۔"

"ہم یہاں بحث کرنے نہیں آئے اس معاملے کو نپٹانے آئے ہیں۔" اجنبی آواز نے بیزار لہجے میں کہا۔

"میں بھی ایسا ہی چاہتا ہوں۔ جلد سے جلد اس معاملے سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہوں۔"

"تو پھر جان چھوڑو ہماری۔" مہناز غصے سے بولیں۔

"ٹھیک ہے۔" سرنوروز کہہ کر دھم دھم کرتے باہر نکلے اور برستی بارش میں اس کے قریب سے گزر کر سیڑھیوں کی طرف چڑھ گئے۔

"وہ چڑیل وہاب کی بیٹی ہے۔ آفتاب سنا تم نے۔ پہلے اس کی ماں تمہارے بھائی

کو کھا گئی۔ اب یہ میری بیٹی کی خوشیاں اجاڑنے چلی ہے۔"

"وہ کوئی بھی ہو میری بیٹی کی خوشیوں کو نہیں نگل سکتی۔ مہناز تم فکر نہ کرو، ایسا کرنے سے پہلے میں اسے طلاق دلوا دوں گا۔"

اس کے سارے کپڑے بھیگ گئے تھے۔ اور بدن پر کپکپی طاری ہونے لگی تھی۔ وہ بھاگتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ گئی۔

دوسری منزل کی سیڑھیاں چڑھنے سے پہلے ہی اسے خوف نے آلیا۔

"اوپر میں اکیلی کیسے رہوں گی رات بھر۔" وہ واپس مڑ گئی اور اندھیرے برآمدے میں پڑی کرسی پر ٹھٹھرتی ہوئی بیٹھ گئی۔ گیلے کپڑے، آر پار سے آتی سرد اور یخ بستہ ہوائیں۔ اس کا بدن تھر تھر کانپنے لگا۔

"وہ چڑیل وہاب کی بیٹی ہے۔ آفتاب سنا تم نے۔" اس نے بازو سینے کے گرد لپیٹ لیے۔

"وہ کوئی بھی ہو، میں اسے طلاق دلوا دوں گا۔ کوئی بھی ہو۔" اس نے ٹانگیں اکٹھی کر کے اوپر رکھیں اور گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئی۔

کتنی ہی دیر اسے اس طرح بیٹھے گزر گئی۔ سر نوروز کے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی۔ نیچے صحن کی لائٹ بند ہو گئی تھی۔ آوازیں آنی بند ہو گئی تھیں۔

ہر طرف سناٹا تھا، صرف بارش کے قطروں کی پراسرار آواز اس کے اعصابوں پر ہتھوڑے کی طرح بج رہی تھی سردی سے اس کا سارا جسم اکڑ گیا تھا۔ لیکن اوپر جانے کا حوصلہ نہیں رہا تھا۔ اوپر چلی جاتی اگر سیڑھیوں میں اندھیرا نہ ہوتا۔

"میں سر سے کہتی ہوں۔ مجھے اوپر چھوڑ آئیں۔"

"نہیں وہ کیا سوچیں گے؟" اس نے خود ہی یہ خیال مسترد کر دیا۔

اس وقت بجلی زور سے چمکی اور دوسرے لمحے لائٹ چلی گئی۔ ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ اس کا دم حلق میں آ گیا۔ بارش میں تیزی آ گئی تھی۔ وہ کرسی پر اور سمٹ گئی۔

"نیچے چلی جاؤں۔" اسی وقت نوروز کے کمرے میں ٹارچ کی روشنی ہوئی اور دروازہ کھل گیا۔

انہوں نے ہاتھ میں ٹارچ پکڑ رکھی تھی۔ وہ احتیاط سے قدم اٹھاتے ہوئے اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ وہ سانس روکے انہیں اوپر جاتا دیکھتی رہی۔

"عصمی! عصمی کہاں ہیں آپ؟" چھت سے ان کی آواز آئی۔ اس کا جی چاہا وہ بھاگ کر ان سے جا کر لپٹ جائے کہ "میں یہاں ہوں۔" خوف سے میرا دم نکل رہا ہے۔ مگر اس کا جسم بے جان ہو چکا تھا۔

"اب کیا کروں۔ اتنی لمبی رات ہے۔ یہاں کرسی پر تو خوف اور سردی کے مارے میرا دم نکل جائے گا۔"

فیصلے کے لیے وقت بہت تھوڑا تھا۔ کبھی کبھی ڈر کا انتہائی لمحہ بھی انسان کو بہادر بنا دیتا ہے۔ اور اس سے ایسے فیصلے کروا لیتا ہے۔ جن کے بارے میں وہ نارمل حالات میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ تھوڑی دیر میں ان کے نیچے اترنے کی آواز آئی۔ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔



ایک طویل قیامت سے لمبی ڈر اور خوف سے حزیں رات۔ وہ صبح جب دھند کا سینہ چیر کر ہلکا سا دھندلکا ہر طرف پھیلا تو وہ چپکے سے بمشکل تمام اٹھی اور خوف کو کھینچ کر سیڑھیوں کی طرف لے گئی۔ اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ گھسٹ گھسٹ کر اس نے سیڑھیاں چڑھیں اور کچن کا دروازہ کھول کر لائٹ جلائی۔ لائٹ پھر غائب تھی۔ اس نے ماچس اٹھا کر چولہا جلا دیا اور وہیں آگ کے پاس بیٹھ گئی۔ باہر کہر چھایا ہوا تھا۔ اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر الماری سے موم بتی لے کر جلائی اور اندر کمرے میں جا کر کپڑے نکالے۔ رات کے اکڑے ہوئے گیلے کپڑوں سے نجات حاصل کی۔ ایک سویٹر اور اس کے اوپر جرسی پہنی اور دوبارہ چولہے کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

"خالہ امی! یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟" آنکھیں پھر سے رونے کی تیاری پکڑنے لگیں کہ باہر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔

"عصمی! آپ رات کو کہاں تھیں؟ میں آپ کو دیکھنے اوپر آیا تھا۔"

وہ دروازے میں کھڑے پوچھ رہے تھے۔ ان کے لمبے قد کی وجہ سے باہر سے آتی

مدھم روشنی کا رستہ بھی بند ہو گیا اور کچن میں صرف چولہے کی آگ کی روشنی رہ گئی تھی جس کا سایہ دیوار پر لرز رہا تھا۔

وہ آنسو واپس حلق میں اتارنے لگی۔

"آپ بیٹھی تھیں؟" وہ اس کے سامنے چوکی پر آ کر بیٹھ گئے۔

"جی۔" بمشکل اس نے کہا۔

"میں نے تو نہیں دیکھا۔" وہ اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ "اچھا یہ چائے بنائی تھی۔ لائٹ تو ہے نہیں، الیکٹرک کیٹل تو جواب دے گئی اس لیے۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑے ملک پیک اور پٹین کا پیک اس کے آگے رکھا۔ اس نے اٹھ کر پین میں پانی لے کر چولہے پر رکھ دیا۔

"اپنے لیے بھی بنا لیجیے گا۔ وہ توا کہاں ہے۔ یہ سلائس سینکنے ہیں۔ ٹوسٹر بھی بیکار ہو گیا لائٹ کی وجہ سے۔" انہوں نے کچھ شرمندہ لہجے میں کہہ کر توے کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ اس نے چولہے کے نیچے سے توا نکال کر دوسرے برنر پر رکھا۔

"انکل آفتاب میرے ابو کے بزنس پارٹنر تھے۔ امی سے شادی کے بعد پاکستان شفٹ ہونے کے بعد انہوں نے انکل سے ففٹی ففٹی لاس اینڈ پرافٹ کی بنیاد پر شراکت کی اور ان کے اچانک انتقال کے بعد صرف لاس ہی لاس ان کے حصے میں آیا اور پرافٹ۔"

اس نے ٹھنڈا سانس لیا۔ "انہوں نے مجھے اپنے پاس رکھا۔ مجھے تعلیم دلوائی زندگی کی ہر آسائش دی۔ اگرچہ مجھ پر کوئی احسان نہیں کیا۔ لیکن ان لوگوں کے خیال میں یہ احسان ہی تھا پھر انکل کے اصرار پر ایم ایس سی کرنے کے بعد سول سروس کا امتحان دینا پڑا انہیں کی خواہش پر میں نے اپنے انکم ٹیکس کے محکمے کا انتخاب کیا۔ اور پہلی فائل جو میری ٹیبل پر آئی وہ انہیں کی تھی اور میں ان کی پہلی فائل ہی اپروو نہ کر سکا۔ دس لاکھ کے انکم ٹیکس میں وہ صرف دس ہزار دینے کو تیار تھے۔ اور باقی۔" انہوں نے گہرا سانس لیا۔ "میرا دل پہلے ہی اس گورکھ دھندے میں الجھنے کا نہیں تھا سو میں نے جاب کرنے کے صرف تین ہفتے بعد ریزائن کر دیا۔"

"مگر نہیں اس سے تقریباً سال بھر پہلے انکل نے امی کی خواہش پر ایک بہت بڑے فنکشن میں میرا نکاح ماحیہ آفتاب سے کر دیا۔ میرے ریزائن پر سب سے زیادہ شور بھی

ماحی نے مچایا۔ اسے بھی مجھ سے زیادہ میرے عہدے سے دلچسپی تھی۔ جبکہ میں نے لیکچرشپ کے لیے کوالیفائی کرنے کے بعد اسے اپنے ساتھ چلنے کو کہا مگر اس نے مجھے "ٹٹ پونجیا" اور "ٹیچر بیچر" کہہ کر ساتھ چلنے سے انکار کر دیا۔ میں اسے سوچنے کے لیے کچھ وقت دے آیا لیکن۔"

اس نے چائے اور سلائس ان کے آگے رکھے۔

"بہر حال اب دیکھو۔" کہہ کر وہ خاموشی سے چائے پینے لگے۔

چائے پی کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ "اچھا میں چلتا ہوں۔" کہہ کر باہر نکل گئے اور وہ پھر وہیں بیٹھی تھی جہاں ان کے آنے سے پہلے تھی۔



سارا دن خاموشی سے گزر گیا۔ اس نے اسی ملک پیک کے بچے ہوئے دودھ سے دوبارہ چائے بنا کر پی۔ ساتھ بخار اور درد کی ٹیبلٹ لی اور کمرے میں لحاف اوڑھ کر سو گئی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو دو بج رہے تھے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"اتنا ٹائم ہو گیا ہے۔" اس نے بکھرے ہوئے بال سمیٹے اور اٹھ کر باہر آ گئی۔

ہلکی ہلکی دھوپ چھت پر ابھی بھی موجود تھی۔ اس نے منڈیر سے نیچے جھانکا۔ نیچے صحن میں کرسیاں بچھائے سب بیٹھے تھے۔ وہ جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔ کچھ دیر وہ پریشانی کے عالم میں کھڑی رہی پھر کچھ سوچ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

آخری سیڑھی کے پاس پہنچ کر رک گئی۔

"تو تم نہیں چلو گے ہمارے ساتھ۔" مہناز تیکھے انداز میں بول رہی تھی۔

"میرا خیال ہے، میں نے یہی کہا ہے۔" سرفروز کا بے نیاز لہجہ۔

"تم جیسے دو ٹکے کے لوگ جنہیں اوقات سے زیادہ مل جائے وہ یونہی چھلکنے لگتے ہیں" وہ مغرور لہجے میں بولیں۔

"بس بہت سن چکا ہوں کل سے یہ لغویات۔ کیا احسان کیا ہے آپ لوگوں نے مجھ پر۔ میری پرورش کی۔ یہی ناں مجھے تعلیم دلوائی۔ تو کیا مجھ پر احسان کیا۔ ایسا ہی نیکیاں کمانے کا شوق تھا آپ کی تو سگی بھتیجی کا خیال کیوں نہ آیا آپ کو۔ وہ بھی آپ کی توجہ کی مستحق تھی۔ ایک ۱۰ سال کی بچی کا ہاتھ پکڑ کر خالہ کے ہمراہ کیوں کر دیا۔ اور شہر میں بھی تو اتنے یتیم خانے ہیں

وہاں سے کسی یتیم کو لے کر کیوں یہ نیکی نہیں کمائی۔ یہ عنایت صرف مجھ ناچیز پر ہی کیوں کی گئی؟" ان کی دھاڑتی ہوئی آواز پر سب چپ تھے۔

"اس لیے کہ میرے باپ کے سرمائے پر قبضہ کیا تھا آپ نے، میرے گھر پر۔ سارے ڈاکومنٹس کی کاپیاں موجود ہیں میرے پاس۔ جو جو کچھ آپ نے ہڑپ کیا ہے۔ شکر کیوں نہیں کرتے کہ میں نے آپ سے کوئی حساب نہیں مانگا۔ کوئی باز پرس نہیں کی۔ آج میں سارے کھاتے کھول لوں تو آپ اپنی عزت کو قرقی ہونے سے نہ بچا سکیں۔ آپ جیسے احسان فراموش کسی پر کیا احسان کریں گے۔ جو خود یتیموں کی جائیدادیں ہڑپ کر چکے ہوں۔ کیا آپ بتائیں گے عصمی کے باپ کا گھر جو اب آپ کی دو کنال کوٹھی کا حصہ ہے۔ اس کی ادئیگی آپ نے کس کو کی ہے۔ احسان فراموش اور حرام تو آپ کھانے کے عادی ہیں۔ اب کوئی بات نہ سنوں میں یہ احسان اور عنایت کی ورنہ ساری عمر عدالتوں میں ایڑیاں رگڑتے رگڑتے گزر جائے گی آپ کی۔"

نوروز کی باتوں پر ایک لمحے کو خاموشی چھا گئی۔

"تو پھر جان چھوڑو ان کی؟" یہ جگنو کی آواز تھی۔ وہ حیرت زدہ رہ گئی۔ "اور تمہیں جو ہمدردی ہے نا اس یتیم و بیسر لڑکی سے تو اس کا حق ادا کرنے کا تمہیں پورا موقع دیا جا رہا ہے۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

"Shut up you opportunist."

(چپ کرو تم موقع پرست) تم ابھی اس جال میں نئے پھنسے ہو ابھی اس کی چمک سے آنکھوں کو خیرہ ہونے دو۔ جب روشنائی آنکھوں کی ختم ہو جائے گی تب رستے ٹٹولو گے۔" وہ غرائے۔

"بس نوروز! بڑا تماشا ہو گیا کل سے۔ جو فیصلہ کرنا ہے کرو۔ ہمارے گھر کا سکون برباد ہو گیا ہے۔" چھوٹی خالہ نے بیزاری سے کہا۔

"میں خود تنگ آ چکا ہوں۔ یہ بس میری طرف سے آپ لوگ ہر حساب سے آزاد ہو گئے۔" اس نے ذرا آگے ہو کر دیکھا وہ خاکی رنگ کا لفافہ مہناز کی طرف بڑھا رہے تھے۔

مہناز نے لفافہ جھپٹ کر پکڑ لیا اور کھول کر اس میں سے تہہ کیا ہوا کاغذ نکالا اور پڑھنے لگی۔

"یہ کیا بکواس ہے؟" اس نے کاغذ زمین پر پھینک دیا۔

نوروز نے جھک کر کاغذ اٹھایا۔ ایک نظر اس پر دوڑائی۔ "اوہ۔" کہہ کر ہاتھ دوبارہ جیب میں ڈالا اور دوسرا لفافہ نکال کر اسے تھمایا۔ اس نے پھر کاغذ نکال کر پڑھا اور جیسے مطمئن ہو گئی۔

"چلیں جی جان چھوٹی۔ ماں! آ جاؤ شام ہو رہی ہے۔" مہناز کے لہجے میں ایسا اطمینان تھا جیسے کسی کھلاڑی کو میچ جیتنے پر ہوتا ہے۔

"آنٹی! میں آپ لوگوں کے ساتھ چلتا ہوں۔" جگنو آگے بڑھا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں بلکہ رخشی بیٹا تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔ ایک دو دن رہ لیتا۔" مہناز خوش دلی سے بولی۔

"مہناز بہن! صبح چلی جائیے گا۔ اب شام ہونے والی ہے۔" چھوٹی خالہ خوش اخلاقی سے بولیں۔

"نہیں جمیلہ! ہم رات سے پہلے پہنچ جائیں گے، چلیں جی۔" وہ آفتاب سے بولیں تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"جگنو! تم آنٹی اور انکل کے ساتھ جاؤ۔" چھوٹی خالہ نے کہا تو جگنو آفتاب کے ساتھ چل پڑا۔

پھر خدا حافظ کہتے ہوئے ماں اور اس کے پیچھے مہناز بھی نکل گئی۔

اور چھوٹی خالہ انہیں الوداع کہنے دروازے تک گئیں اور مرسیڈیز کے روانہ ہونے تک وہیں کھڑی رہیں۔

"اب تمہارا کیا ارادہ ہے نوروز! کیونکہ کل سے اوپر والی منزل پر مزدور کام شروع کریں گے۔ مجھے وہاں کچھ کام کروانا ہے۔" وہ واپس آ کر سرد لہجے میں نوروز سے بولیں۔

"کیا کہہ رہی ہو، جمیلہ یہ اس وقت کہاں جائے گا۔" فرید چچا نے کچھ پریشانی سے کہا۔

"یہ اس کا دردِ سر ہے۔ آپ خواہ مخواہ ہراساں نہ ہوں۔" وہ بیگانگی سے بولیں تو نوروز نے "جی اچھا۔" کہہ کر سر ہلا دیا۔

اور پھر ٹھیک آدھے گھنٹے بعد وہ دونوں تانگے پر بیٹھے اسٹیشن کی طرف جا رہے تھے۔

نوروز کے کہنے پر پندرہ منٹ میں اس سے جو کچھ سمیٹا جا سکا تھا، سمیٹ کر چھوٹی خالہ اور چچا فرید کو الوداع سلام کر کے سر جھکائے وہ نوروز کے پیچھے باہر نکل آئی۔ رخشی سو رہی ہے۔ اس کے پوچھنے پر چھوٹی خالہ نے سرد لہجے میں کہا تو اس نے رخشی کے بند دروازے کو یاسیت سے دیکھا۔

صرف چند رتوں نے اس کی زندگی کا نقشہ کیسے بدل دیا جن کے ساتھ ایک زمانے کی رفاقتیں تھیں، وہ یکسر اجنبی بن گئے تھے اور ایک اجنبی ہمیشہ کے لیے رفیق بن گیا تھا۔ اس نے ساتھ بیٹھے نوروز کو دیکھ کر سوچا۔

آسمان بالکل صاف تھا، صرف سرد ہوا چل رہی تھی۔

"اگر ہمیں چار بجے والی گاڑی مل گئی تو ہم چھ سات بجے تک لاہور پہنچ جائیں گے۔" نوروز نے دونوں کے درمیان موجود اجنبی خاموشی کی دیوار پر پہلی ضرب لگائی۔ "شکر ہے ٹرانسفر لیٹر بھی آج ہی مل گیا اور میں وہ مہناز آنٹی کو دے بیٹھا۔ وہ آگ بگولہ ہو گئیں ٹرانسفر کی خبر پڑھ کر۔" اس نے ذرا سا مسکراتے ہوئے کہا۔

اب تانگہ قبرستان کے باہر سے گزر رہا تھا۔ چھوٹی سی دیوار سے آگے اندر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ ہر طرف خاک کے ڈھیر تھے۔

اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

"ہم اگلی دفعہ آئیں گے تو خالہ جان کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جائیں گے۔ آج تو رات کی بارش کی وجہ سے بڑی پھسلن ہے۔" نوروز نے اس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے جیسے اسے تسلی دی۔

تانگہ تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ قبرستان سے آگے کھلا میدان تھا۔ جہاں بچے کرکٹ کھیل رہے تھے۔

"یہ چچا امام دین بھی کتنا جھوٹ بولتا ہے کہ زمین انسانوں کے بوجھ سے پھٹ رہی ہے۔ ابھی تو اس کائنات میں اتنی جگہ خالی ہے۔ جب تک آسمان سے روحوں کی آمد کا سلسلہ جاری ہے اس زمین پر گنجائش رہے گی۔" اس نے نہر کے پانی پر ہلکورے کھاتی کشتی کو دیکھ کر

سکون کا سانس لیا۔

"ویسے میں ابھی تک حیران ہوں تم رات کو کہاں چلی گئی تھیں۔ میں اوپر تک تمہیں دیکھنے گیا تھا۔ نیچے اس لیے نہ گیا کہ وہ لوگ پھر کوئی افسانہ نہ گھڑ لیں۔ ویسے تم رات کو کہاں تھیں؟" وہ حیرت سے پوچھ رہے تھے اسے ہنسی آ گئی۔

"یہ میں آپ کو کبھی نہیں بتاؤں گی۔ کہ میں رات کہاں تھی۔" اس نے حجاب آلود لہجے میں کہا۔

"نہ بتاؤ۔ مجھے پتا چل گیا تھا۔ صبح جب تم آہستگی سے بلی کی طرح دروازہ کھول کر میرے کمرے سے باہر گئی تھیں تو میں نے چانس مس ہونے پر بڑا افسوس کیا تھا۔" ان کی بات پر وہ اچھل ہی پڑی۔

"کیا آپ کو پتا تھا کہ میں آپ کے پلنگ کے نیچے۔" اس نے زبان دانتوں تلے دبالی۔

"بتایا تو ہے صبح پتا چلا جب موقع ہاتھ سے نکل گیا تھا۔" انہوں نے ہنستے ہوئے کہا تو اس نے گردن گھما کر انہیں دیکھا۔ پہلی بار انہیں ہنستے دیکھ کر وہ بھی ہنس پڑی۔

اتنے دنوں بعد تو آج آسمان صاف ہوا تھا اور اب موسم کیسا بھی کیوں نہ ہو جائے اسے کوئی ڈر نہیں تھا۔ تقدیر نے اتنا مہربان سائبان جو اس کے سر پر تان دیا تھا۔



تمہیں دل نے پکارا ہے

''وہ بالشت بھر کی لڑکی دن دہاڑے میری آنکھوں میں دھول جھونک گئی۔ ارے عقل، ہوش وحواس سب کے ہوتے وہ مجھے پاگل بنا گئی۔ سب کچھ لے جاتی کمبخت مگر کرموں جلی اس گھر کی عزت کو یوں برباد نہ کر جاتی۔ ہائے، ہم لوگوں کو کیا منہ دکھائیں گے شفق کے پاپا! ہم کس کس کو جواب دیں گے۔ ارے مرنے والے تو مر گئے، یہ باپ کی گٹھریاں ہمارے سینوں پر دھر گئے۔ لو، جیو بھی اور مرو بھی! اور یہ نامراد تو سمجھو ہمیں مار ہی گئی۔ شکل سے کیسی بھولی بھالی کہ کوئی یقین نہ کرے کہ اسے بولنا بھی آتا ہوگا اور گن دیکھیے، کالک مل گئی سب کے مونہوں پر کلموہی۔ سارا زیور بھی لے گئی۔ اور اس حرام زادے کو دیکھو، نمک حرام! جس تھالی میں کھایا اس میں چھید کیا۔ میں مر کیوں نہ گئی، یہ دن دیکھنے سے پہلے۔ اے لوگ تو ہمارا ہی گریبان پکڑیں گے نا۔ اذیت سہنے کو بھی ہم اور جواب دہی کو بھی ہم۔ میری بچیوں کی بھی شہرت خراب ہوگئی۔ ارے کون اس دہلیز پر آئے گا۔ میری معصوم بچیاں، مجھے کیا پتا تھا جس آستین کے سانپ کو دودھ پلا پلا کر بڑا کر رہی ہوں جوان ہوتے ہی ایسا ڈسے گا، میں تو ہائے......''

تائی امی نے سینے پر دو ہتڑ مارے۔ مسلسل بولتے بولتے ان کا گلا خشک ہو گیا تھا۔

فاطمہ بی نے جلدی سے پانی کا گلاس کچن کے کاؤنٹر سے اٹھا کر ان کے خشک لبوں سے لگایا۔ وہ غٹاغٹ ایک ہی سانس میں سارا گلاس چڑھا گئیں۔ پانی پی کر گلاس پرے جھٹکا اور پھر سے رقت پکڑنے لگیں۔ باقی سب خاموشی سے ان کی فی البدیہہ تقریر سن رہے تھے۔

''میں تو کہتی ہوں شفق کے پاپا! تھانے رپٹ کراؤ تاکہ لوگوں کو سچ کا تو پتا چلے گا۔ ہم تو بدنام ہونے سے بچ جائیں گے۔'' انہیں نیا نکتہ سوجھا۔

''بس کرو طاہرہ! میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے اور رپٹ لکھوانے سے کچھ فائدہ نہیں، جو ہونا تھا ہو گیا۔ بس اب مرتے دم تک اس کی شکل نہیں دیکھوں گا، مر گئی وہ ہمارے لیے اور ہم اس کے لیے۔ اور جب خیال رکھنے کا ٹائم تھا، تب تمہیں ہوش نہ تھا تو اب رپٹ لکھوانے کی کیا ضرورت ہے، جو عزت بچی ہے، وہ بھی مٹی میں ملا دیں۔''

آخری فقرے انہوں نے دبی زبان میں کہا مگر تائی امی کے تیز کانوں نے سن لیے۔

''میں مر جاؤں، میں ہی مر جاتی تو اچھا ہوتا۔ سب کو سکون مل جاتا۔ مجھے اپنا ہوش کہاں تھا۔ ہائے اس منحوس بلڈ پریشر نے مجھے ہوش وحواس سے بیگانہ کر دیا تھا اور وہ نمک حرام، جہنم جلی مجھے بے ہوشی ہی میں چھوڑ چھاڑ کر چلی گئی اور فاطمہ بی کو میری دوائیں لینے بھیج دیا۔ مجھے کہیں دو گھنٹوں بعد ہوش آیا پوچھیں فاطمہ بے چاری کیسے کیسے ہلکار ہوئی، مجھے ہوش میں لانے کے لیے۔ میں آپ کو کہاں سے خبر کرتی، آپ کو تو دوست کے شادیانوں کی فکر تھی۔ سارا کنبہ اٹھا کر چل پڑے۔ جانا تھا تو اس عزت کے تاج کو بھی ہمراہ لے جاتے۔ یہ تہمت ساری عمر کو میرے سر تو نہ آتی'' وہ نئے سرے سے چلانے لگیں۔

''اچھا، اب بس کرو، باہر سڑک پر لوگ اکٹھے ہونا شروع ہو جائیں گے۔ تمہاری چیخ و پکار سن کر۔'' تایا ابو بیزاری سے بولے۔ ''صبح سے آ کر ایک پل کو چین سے نہیں بیٹھا۔ کل وہاں شادی کی بے آرامی اور گھر آتے ہی منحوس واقعہ۔ مجھے تو بخار ہو گیا ہے۔'' وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

''آپ کے بخار کا تو علاج ہے، جو بخار ہماری عزت کو لاحق ہو رہے ہیں اس کی دوا کہاں سے ڈھونڈیں گے۔'' تائی امی نے ایک طویل سرد آہ بھر کر کہا۔

''اسی سوچ نے تو پاگل کر دیا ہے۔ ایسا کیسے کر سکتی ہے۔ وہ ایسی تو نہ تھی۔ اس نے ی کا بھی کچھ خیال نہ کیا۔ وہ تو سارے گھر کی خدمت گزار تھی اور وہ احمر کا بچہ میں نے ے کیا سمجھا تھا۔ چند ہی ماہ میں اسے اتنی عزت دے ڈالی۔ گھر کے فرد ہی کی طرح سمجھنے گے۔ کبھی غیر نہ جانا اور اس احسان فراموش نے یہ صلہ دیا۔ میں سوچتا ہوں تو میرا دماغ پھٹنے

لگتا ہے۔" تایا ابو کی آواز بہت مدھم تھی۔ اسے بہت مشکل سے سنائی دے رہی تھی۔

"منع کرتی تھی اس موئے کو یوں منہ اٹھا کر گھر کے اندر مت آنے دیا کریں۔ بچیوں والا گھر ہے، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ وہی سب کچھ ہو گیا۔" وہ غصے سے غبار لہجے میں گویا تکور کرتے ہوئے بولیں۔

"شہیر کہاں ہے؟"

"اپنے کمرے میں منہ چھپا کر پڑا ہے۔ میرے بچوں کا کیا قصور۔ یہ بدنامی تو مفت میں ان کے حصے میں آ گئی۔ ہائے میرے معصوم بچے!" تائی امی شاید بول بول کر تھک گئی تھیں، اس لیے اب بہت مختصر جملے بول رہی تھیں، ورنہ آگ تو ان کے اندر ابھی بھی بہت بھڑکی ہوئی تھی۔

"اس کی ساری دوستوں کے ہاں پتا کر لیا، سب جاننے والوں کو بہانے بہانے سے فون کر کے کر دیا۔ پتا نہیں کدھر دفعان ہوئی وہ۔" تایا ابو مایوسی سے بولے۔

"اے لو!" تائی امی زور سے تالی مار کر ہنسیں۔ "کیسے بھولے ہیں ہمارے میاں فاطمہ بی! پتا نشان چھوڑ تا ہوتا تو وہ گھر سے بھاگتی کیوں۔"

تائی امی کا بلڈ پریشر اب بالکل نارمل تھا۔ کل رات کے شدید دورے کی کوئی بھی علامت نہ ان کے چہرے پر نظر آتی تھی۔

"اس نامراد کے گاؤں میں پتا کروانا تھا۔"

"گاؤں میں اس کا کون تھا، ایک سوتیلا چچا۔ معلوم کروایا ہے میں نے وہاں نہیں گیا وہ۔" تایا ابو جھک کر بولے۔

"منع کیا تھا نا میں نے شفق کے پاپا! یہ اتنی نازک ذمہ داریاں اپنے کندھوں پر نہ لیں۔ ہمارے اپنے بھی تو تین بچے تھے۔ پر آپ کو تو بھائی کی محبت کا جوش ہی مارے جا رہا تھا۔ کروڑ پتی ہیں ان کی بہن صاحب، اس نے تو ایک بار بھی نہیں کہا کہ میں لے جاتی ہوں اپنے گھر۔ آخر کو اس کا بھی تو بھائی تھا مرنے والا۔ وہ تو آپ کو ہی بیماری ہے خدمت خلق......"

"راحیل بھائی کا علم ہے نا تمہیں، وہ کب گوارا کرتے اس بات کو۔" تایا ابو تنگی سے بولے۔

"تو پھر کیا صلہ ملا ان پانچ سالوں کی جان ماری کا اور ہاتھ آئی یہ مفت کی بدنامی اور ذلت کا ہار، اور اب کیا جواب دیں گے اپنی اس بہن کو جو سنتے ہی محبت و ہمدردی کے ڈرامے رچائے گی۔ بھائی کی نشانی تھی، خود لے جاتی مگر ضرورت کے وقت وہ ہمیشہ راحیل کی ڈھال آگے کر لیتی ہے۔ فون کیا ثمینہ کو آپ نے؟" انہیں خیال آیا تو رک کر بولیں۔

"یہ کون سی خوشی کی خبر ہے جو میں اسے فون کھڑکاؤں۔ چار دن بعد اس کی نند کی بچی کی شادی ہے، کل تک اس کو آہی جانا ہے، خود ہی معلوم ہو جائے گا۔" وہ اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹیک چکے تھے۔

"فاطمہ بی! اٹھ کر کھانا لگواؤ، سب کو کھانے کے لیے بلاؤ۔ آخر بچوں کو کس بات کی سزا۔ صبح سے بھوکے پیٹ اس منحوس کی تلاش میں خوار ہو رہے ہیں۔ کسی نے کچھ بھی نہیں کھایا۔ میں بھی کچھ کھاؤں تو دوا لوں۔ آپ بھی کھانا کھا کر آرام کریں۔ بہتر ہے نیند کی کوئی گولی لے لیں۔ ذرا سکون سے سو جائیں گے۔" وہ ہمدرد لہجے میں شوہر سے بولیں۔

"سکون آ سکتا ہے؟ جو بے سکونی وہ مجھے دی گئی ہے۔" تایا ابو سر اٹھا کر کوفت بھرے لہجے میں بولے۔

"اے تو خدا ہی سمجھے۔ وہ تو ہمیں عمر بھر کا داغ دے گئی۔ میں نے ایک دو سے اس نحوس رشتے کے لیے بھی کہہ رکھا تھا کہ بھئی! چلو پڑھائی کا شغل نہیں رہا تو شادی کیے دیتے ہیں۔ یہ فرض بھی تو آخر کار ہم کو ہی نبھانا ہے......"

"تو جب میں نے کہا تھا کہ شہیر سے کر دو، کیا حرج تھا۔ گھر کی عزت گھر ہی میں رہتی۔ آج یہ دن تو نہ دیکھنا پڑتا۔" تایا ابو چیخ کر بولے۔

"پاگل نہیں تھی میں۔" وہ جواباً گرجیں مگر پھر تایا ابو کے غصیلے تیور دیکھ کر مدھم پڑ گئیں۔

"کب مان رہا تھا شہیر؟ اس کے سر پر تو ایک ہی بھوت سوار ہے، امریکا کا۔ وہاں جائے گا تو اسے چین آئے گا۔ اس کی بھی ضد ہے، ایم بی اے کی ڈگری وہیں سے لینی ہے۔ سارے دوست اس کے ادھر ہی پڑھنے گئے ہیں تو کیوں نہیں آپ اس کو بھیج دیتے۔" وہ لجاجت سے بیٹے کی وکالت کرتے ہوئے بولیں۔

"تمہیں کیا نظر آتا ہے طاہرہ بیگم! میں بہت جوان ہوں؟ بہت تندرست ہوں؟ بچیوں کی ذمہ داریاں ہیں، بزنس کا بوجھ سارا مجھ اکیلے پر ہے۔ فیکٹری وہ نہیں جاتا، آفس وہ نہیں آتا۔ اس بدبخت احمر نے میرا آدھا بوجھ بانٹ لیا تھا۔ اولاد کو تو اتنا خیال بھی نہیں آتا۔ اسے باہر بھیج دیا تو پھر اس کی واپسی کا راستہ دیکھو گی، تم میری یہ بات بھی لکھ لو۔ پڑھنے کا تو صرف بہانہ ہے، جتنا میں اسے جانتا ہوں، تم اسے نہیں جانتیں۔" تایا ابو تلخی سے بولے۔ فاطمہ بی ڈائننگ ٹیبل پر برتن لگانے کے بعد اب سالن کے ڈونگے رکھ رہی تھیں۔

"بیگم صاحبہ! کھانا لگ گیا ہے..........." اس نے اطلاع دی۔

"میں نے آپ کو بتا دیا، شہیر کو شوق ہے، وہ ضرور جائے گا۔ ایک ہی تو میرا بچہ ہے۔ کون سے دس ہیں۔ تین چار سال کی تو بات ہے پھر آ کر سب کچھ اسی کو تو سنبھالنا ہے۔" وہ دوٹوک انداز میں بولیں۔

"اگر کچھ بچا تو؟" وہ بڑبڑائے۔ "بہرحال اس وقت میں اس فضول ٹاپک پر بحث نہیں کرنا چاہتا۔ تم سب کو کھانے کے لیے بلاؤ، رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔" تایا ابو اٹھ کر ڈائننگ ٹیبل کی طرف بڑھ گئے۔

"فاطمہ بی! شفق، عاشو اور شہیر کو بلاؤ۔ کھانا کھا لیں آ کر۔" تائی امی اٹھتے ہوئے بولیں۔

"اور ہاں، اس منحوس کو مت بلانا۔ میں اس کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی۔ اس کا فیصلہ تو اب کل صبح ہی ہوگا۔ پہلے ماتم سے فرصت مل جائے تو میں اس کا قصہ نپٹاؤں گی۔ بس بہت نیکیاں کما لیں ہم نے۔ اب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" وہ با آواز بلند کہتے ہوئے ڈائننگ ٹیبل کی طرف بڑھیں کہ سب سن لیں۔ شہیر، عاشو اور شفق بھی اپنے کمروں سے نکل آئے۔ سب ہی کو بھوک لگی ہوئی تھی۔ تائی امی کی "للکار" پر کسی نے دھیان نہیں دیا۔ سب خاموشی سے کھانے پر ٹوٹ پڑے۔

اور وہ بے بسی سے کمرے میں بیٹھی چمچوں، پلیٹوں اور کانٹوں کے کھنکنے اور بجنے کی آوازیں سنتی رہی۔ بھوک سے اس کا بھی برا حال تھا۔ اس نے تو رات کو شادی میں بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ جب تایا ابو نے تبین کے گھر سے بھاگ جانے کی خبر سنتے ہی واپسی کا قصد کیا

تھا۔ اس نے ابھی چاول اپنی پلیٹ میں نکالے ہی تھے جب شفق نے آ کر اس کے کان میں منحوس خبر سنائی تھی۔ اس کے ہاتھ سے پلیٹ ہی چھوٹ کر ٹیبل پر گر گئی اور اب تو کل کی رات کو بیتے بھی چوبیس گھنٹے ہونے کو آئے تھے اور اس دوران اس نے سوائے پانی کے کچھ نہ چکھا تھا اور اب بھی سب مزے سے کھانے میں مشغول ہو گئے تھے، اس کی پروا کیے بغیر۔ بے بسی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اور کچھ دن دھندلے دھندلے منظر ان آنسوؤں میں ڈولنے لگے۔



کبھی کبھی زندگی میں صرف چند لمحے، چند گھنٹے یا چوبیس گھنٹوں پر مشتمل ایک دن انسان کی زندگی کی کایا پلٹ دیتا ہے۔ یوں کہ اگر وہ سوچنے بیٹھے تو اسے لگے کہ ان بیتے چند لمحوں یا چند گھنٹوں بعد ایک نئے انسان نے جنم لیا ہے۔

ارتضیٰ احمد کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ بی کام کے ایگزام کیا تمام ہوئے اسے لگا راوی ہر طرف چین ہی چین لکھتا ہے۔ خوب فراغت میسر ہو گئی۔ دوستوں کا حلقہ کچھ اتنا وسیع نہ تھا کہ بہت زیادہ وقت ان کے ساتھ گزر جاتا۔ ہاں ایک عادت بہت سالوں سے پختہ ہو چکی تھی۔ شہر کی خوبصورت ویران سڑکوں پر رات گئے تک سڑگشت کرنا، اگر ایک دو دوست ساتھ ہوتے تو بھی مزہ آتا ورنہ اسے تنہائی کو انجوائے کرنا بھی اچھا لگتا تھا۔ والدہ کی وفات کے بعد اس کا گھر میں کم ہی دل لگتا تھا۔ ڈیڈی مصروف بہت تھے۔ وہ اکثر ہی رات کو دیر سے لوٹتا مرتضیٰ بھائی کی شادی کے بعد طاہرہ بھابھی کیا گھر میں آئیں، ان کی دلچسپی گھر کے معاملوں میں صفر ہو کر رہ گئی۔ انہوں نے گھر کے سیاہ و سفید کی مالک طاہرہ بھابھی کو بنا دیا تھا۔ کچھ تو وہ ان کی بھانجی تھیں، کچھ طاہرہ بھابھی نے اس طرح انہیں اپنے سلوک اور رویے سے شیشے میں اتارا کہ وہ ان پر اندھا اعتماد کرنے لگے تھے۔ مرتضیٰ بھائی بھی ڈیڈی کی طرح تھے۔ ڈیڈی کی گڈبکس میں رہنے کے لیے ہر وقت بزنس کی گتھیاں سلجھاتے نظر آتے۔ ڈیڈی کے ساتھ ہی آفس جاتے اور عموماً ان کے ساتھ ہی واپس آتے گھر میں کیا ہو رہا ہے کیوں ہو رہا ہے، ڈیڈی کو اور مرتضیٰ بھائی کو ارتضیٰ احمد کی آوارہ گردی بہت بری طرح سے کھٹکنے لگی تھی۔

وہ دونوں آفس چلے جاتے تو ارتضیٰ کا گھر میں بالکل دل نہ لگتا۔ پہلے موٹر بائیک

تھی، اس آوارہ گردی میں اس کی ساتھی اور اب کچھ عرصے سے اس نے ڈرائیونگ سیکھنا شروع کر دی تھی۔ اصل میں ڈرائیونگ تو اس نے میٹرک ہی میں سیکھ لی تھی مگر پہلے ہی ٹرائل میں ڈیڈی کی سات لاکھ کی نئی گاڑی ایک جمبو سائز ٹرک کے ساتھ اس طرح سے ٹکرائی کہ سات لاکھ کی گاڑی کا ڈھانچہ کوئی کباڑیا سات ہزار میں بھی لینے کو تیار نہ تھا۔ بس اس دن سے اس کے لیے گاڑی ''شجر ممنوعہ'' تھی، مگر اب بی کام کے بعد پھر سے اس کے دل میں شوق چرایا تھا۔

''پتا نہیں یہ طاہرہ بی بی کیا ڈیڈی کے کان بھرتی رہتی ہیں۔ کہ ڈیڈی ہر وقت مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے رہتے ہیں۔'' اس نے ڈیڈی کا سامنا کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ طاہرہ اس کے لیے سازش کا کیسا گھناؤنا جال بننے میں مصروف ہیں، وہ تو ڈیڈی کی لعن طعن کو معمول کا حصہ سمجھتا تھا۔ ابھی تو ایگزام ختم ہوئے تھے، وہ بزنس کے جھنجٹ میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔

''دیکھو ارتضیٰ! جب تک تمہیں اچھی طرح ڈرائیونگ نہیں آ جاتی، یوں گاڑی لے کر مت نکلو۔ ڈیڈی ویسے ہی تم سے آج کل بہت خفا رہتے ہیں۔ انہوں نے تو مجھے سختی سے منع کر رکھا ہے تمہیں گاڑی دینے سے۔'' صبح اس نے مرتضیٰ بھائی سے گاڑی کی چابی مانگی تو ان کا لیکچر شروع ہو گیا۔ اسے سخت الجھن ہونے لگی۔

''ڈیڈی تو یوں بھی مجھ سے خفا ہی رہتے ہیں۔ پتا نہیں انہیں میری شکل پر کیا نظر آتا ہے اور ویسے بھی آپ کو وہم ہو گیا ہے کہ میں ڈرائیونگ نہیں کر سکتا۔'' اس نے چابی ان کے ہاتھ سے جھپٹ لی۔ ''پرامس، رات کو چابی گاڑی سمیت آپ کو بحفاظت لوٹا دوں گا۔'' وہ اپنے کمرے میں جانے لگا۔ ''اور رات تک میں کیا کروں گا؟'' وہ بے بسی سے بولے۔

''ڈیڈی کی گاڑی پر گزارا۔ کہہ دیجیے گا آپ کی گاڑی ورکشاپ میں ہے۔'' اس نے لاپروائی سے مشورہ دیا۔

''ڈیڈی کا آفس سے فون آیا ہے کہ آپ ابھی تک نکلے یا نہیں۔'' طاہرہ بھابھی نے ارتضیٰ کو سرد نگاہوں سے دیکھتے ہوئے شوہر کا پیغام دیا۔

''سن لیا۔ تم آج پٹواؤ گے ڈیڈی سے مجھے۔ چلو آفس ڈراپ کر آؤ مجھے۔''

''او کے، اللہ کسی کا محتاج نہ کرے۔ کیسے ماتھے پر آنکھیں رکھی ہوئی ہیں آپ نے۔'' وہ کچھ ناراضی سے باہر کی طرف بڑھا۔

راستے میں انہیں چونکہ جلدی تھی اور ارتضیٰ بہت احتیاط سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

''تم آؤ ادھر اور مجھے گاڑی چلانے دو۔ تم شام کو مجھے آفس پہنچاؤ گے۔'' تھوڑی دور جا کر انہوں نے اسے ڈرائیونگ سیٹ سے اٹھا دیا۔

آفس کے آگے اتر کر انہوں نے چابی ارتضیٰ کے حوالے کی۔

''بہت احتیاط سے چلانا سنا تم نے اور زیادہ رش والے روڈز پر جانے کی ضرورت نہیں۔ شاید مجھے آج اسلام آباد بھی جانا پڑے، بزنس سیمینار ہے۔ ڈیڈی نہ گئے تو پھر شاید میں جاؤں۔ تم شام کو جلدی گھر آ جانا اور اگر ہو سکے تو آفس کا بھی ایک چکر لگا جانا۔''

''اچھا بھائی! خدا حافظ۔''

ان کی نصیحتوں کی پٹاری بند نہ ہوتے دیکھ کر اس نے جلدی سے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

''ننھا بچہ سمجھ رکھا ہے مجھے۔ بس دو چار بار ہی ذرا لیٹ آیا ہوں، ڈیڈی تو خواہ مخواہ خار کھائے بیٹھے ہیں۔ اب تو گاڑی چلانے میں بھی پرفیکٹ ہو گیا ہوں۔'' اپنی پسند کی کیسٹ لگا کر اس نے گاڑی کا رخ فرحان کے گھر کی طرف موڑ دیا۔

''اس کو بھی ساتھ لیتا ہوں، آج ذرا عیش کریں گے۔ گاڑی میں پیٹرول بھی بہت ہے۔'' اس نے میٹر پر نظر ڈالی۔

فرحان کے گھر کے راستے میں گرلز کالج بھی آتا تھا اور وہی شارٹ کٹ بھی تھا۔

''ادھر ہی سے چلتا ہوں۔ ابھی کون سا رش ہے۔ چھٹی ہونے میں ابھی گھنٹہ بھر تو ہے۔''

اس نے گھڑی دیکھی، سوا گیارہ بج رہے تھے۔ سڑک پر واقعی رش کم تھا۔

''موسم تو اچھا ہو رہا ہے۔'' اس نے آسمان پر نگاہ جمائی۔ آسمان پر کافی گہرے بادل تھے اور دوسرا لمحہ اس کا حواس باختہ کر دینے والا تھا۔

گاڑی میں میوزک کا تیز شور اور گھبراہٹ میں اسپیڈ پر رکھا پاؤں دبتا ہی چلا گیا اور

بالکل سامنے دو لڑکیاں شاید خود بخود گاڑی کے بونٹ پر چڑھی آ رہی تھیں۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ ہارن بجا کر انہیں روکنا چاہتا تھا مگر افسوس ہارن کا موقع ان بے وقوف لڑکیوں نے دیا ہی نہیں اور دونوں ایک زوردار دھماکے سے گاڑی سے ٹکرا گئیں۔ ان دونوں کی تیز چیخوں کی آواز میں اس کی اپنی بھی چیخ شامل تھی۔

اس نے بریک پر رکھا پاؤں پوری طاقت سے دبایا۔ گاڑی زوردار جھٹکے سے رک گئی۔ اس کا سر اسٹیرنگ سے اس زور سے ٹکرایا کہ اسے دن میں تارے نظر آ گئے۔

اس نے اپنے حواس بحال کرنے کی کوشش کی اور سر اٹھا کر باہر کی صورت حال کا جائزہ لیا۔ اس کے اپنے ماتھے پر بڑا سا گومڑا ابھر آیا تھا۔ لوگ ان کے گرد اکٹھے ہو رہے تھے۔ وہ ان کے غصے اور ناراضی کی پروا کیے بغیر دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

''اندھے ہو گیا، دکھائی نہیں دیتا۔ دن دیہاڑے پاگلوں کی طرح گاڑی ٹکراتے پھر رہے ہو۔ دیکھو کیسے خون بہہ رہا ہے دونوں کا۔'' ایک نے اسے گریبان سے پکڑ کر جھنجوڑا۔

''ارے انہیں ہاسپٹل لے کر جاؤ۔'' دوسرا چلایا۔ دونوں لڑکیوں کے سروں سے خون بہہ رہا تھا۔ دونوں ہی شاید بے ہوش ہو چکی تھی۔

پھر پولیس کیس کے خوف سے کوئی بھی گاڑی والا آگے نہ بڑھا تو مجبوراً اسے دونوں کو اپنی گاڑی میں ''لادنا'' پڑا۔ احتیاط کے طور پر ایک شخص اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

اور یہ اللہ کا شکر ہوا کہ ہاسپٹل تک اس نے بالکل ٹھیک ڈرائیونگ کی اور کہیں سے بھی ساتھ بیٹھے شخص پر ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ ایک اناڑی ڈرائیور ہے۔

ایک لڑکی کو تو معمولی چوٹیں آئی تھیں، دوسری البتہ زیادہ زخمی تھی۔

دونوں کی مرہم پٹی کر کے انہیں ایک روم میں شفٹ کر دیا گیا، وہ ان دونوں کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ دوبار وہ مرتضیٰ بھائی کو فون کر چکا تھا، وہ آفس میں ہی نہیں تھے۔ ڈیڈی سے وہ اپنی یہ حماقت بیان نہیں کر سکتا تھا۔

پہلی لڑکی جسے معمولی چوٹیں آئی تھیں اسے چار بجے تک ہوش آ چکا تھا۔ وہ کمرے کے باہر مستقل ٹہل رہا تھا۔ گہرے بادل چھا چکے تھے۔ ہر طرف اندھیرا سا ہو رہا تھا۔ شاید ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی شروع ہو چکی تھی۔ ہاسپٹل کی لائٹیں بھی آن ہو چکی تھیں، جب نرس نے

اس لڑکی کے ہوش میں آنے کا بتایا۔

''میں، میں یہاں کیسے آئی؟'' وہ حیران نظروں سے اپنے اردگرد دیکھ رہی تھی۔ ارتضیٰ پر نظر پڑتے ہی بولی۔

''اڑ کر یا شاید کالے علم کے زور سے۔'' دوسری لڑکی ابھی بھی بے ہوش تھی۔ ''اور آپ کی یہ دوست بھی۔'' ارتضیٰ نے دوسری بیڈ کی طرف اشارہ کیا۔

''فائقہ... یہ فائقہ بھی میرے ساتھ۔'' وہ حیران ہی رہ گئی پھر جیسے اسے سب کچھ یاد آ گیا۔

''وہ... وہ ہم دونوں سے کوئی گاڑی ٹکرائی تھی۔ ہم کالج سے نکلے ہی تھے۔'' وہ یاد کر کے بولی۔ ''کہیں وہ آپ تو نہیں تھے، جنہوں نے ہمیں ٹکر ماری تھی؟'' وہ اسے گھور کر بولی۔

''ٹھیک گاڈ! آپ کی یادداشت قائم ہے، ورنہ شاید ایک بار پھر آپ کو ٹکر مارنی پڑتی۔ ویسے محترمہ گاڑی آپ دونوں سے نہیں ٹکرائی تھی، آپ دونوں نے اسے ٹکر ماری تھی۔''

''آپ کا دماغ ٹھیک ہے، ہم نے بھی گاڑی نہیں دیکھی تھی یا ہم اندھے تھے جو یونہی آپ کی گاڑی سے ٹکرتے پھرتے۔'' وہ غصے سے بولی اور بیڈ سے اتر کر کھڑی ہو گئی۔

''میں تو یہی سمجھا تھا۔'' وہ کندھے اچکا کر بولا۔

''کیا؟'' وہ آنکھیں نکال کر بولی۔

''کچھ نہیں پولیس خود باہر موجود ہے آپ دونوں کا بیان لینے کے لیے کہ آپ یوں اس طرح میری گاڑی سے ٹکرائیں میری گاڑی کا آپ دونوں نے بیس پچیس ہزار کا نقصان کر دیا ہے وہ کون بھرے گا۔'' وہ سنجیدگی سے بولا تو وہ آہستہ سے جا کر فائقہ کے پاس بیٹھ گئی۔ پولیس کی دھمکی کام دکھا گئی تھی، وہ کچھ دیر بیٹھی فائقہ کا جائزہ لیتی رہی۔

''دیکھیں، یہ کوئی شرافت نہیں۔ ایک تو ہمیں اس طرح زخمی کیا، دوسرے آپ ہمیں دھمکا رہے ہیں۔'' کچھ دیر بعد وہ مظلوم لہجے میں بولی۔

''میں کب دھمکا رہا ہوں، آپ کو سچ بتا رہا ہوں۔ اچھا آپ یہ جوس پئیں۔ میں

پولیس کو باہر جا کر فارغ کر کے آتا ہوں۔ اب جو نقصان میرا ہوا ہے، وہ تو سہنا ہی پڑے گا نا۔ انسانیت بھی کوئی چیز ہے۔'' اس نے جوس کا گلاس اس کی طرف بڑھایا اور احسان جتاتے ہوئے باہر نکل آیا۔

باہر موسم کے تیور اچھے خاصے بگڑ چکے تھے۔ بارش شروع ہو چکی تھی۔ اس نے ایک بار پھر مرتضیٰ بھائی کو فون کیا، تو پتہ چلا وہ دوپہر ایک بجے ہی اسلام آباد جا چکے ہیں۔ مایوسی نے اس کا گھیرا کیا۔

''اگر ڈیڈی کو علم ہو گیا تو۔'' اس سے آگے وہ کچھ نہیں سوچ سکا اور دوبارہ کمرے میں آ گیا۔

''مجھے اپنے گھر فون کرنا ہے، ٹائم کیا ہوا ہے۔'' وہ صبح سے میں بھی ادھر بندھا بیٹھا ہوں۔ اچھی مصیبت ہے۔'' وہ جھنجلا کر بولا۔

''او مائی گاڈ! شام ہو گئی اور...... اور ہمارے گھر والوں کو کسی نے اطلاع نہیں دی۔''

وہ صدمے سے گنگ رہ گئی۔

''کیسے اطلاع دیتے، اب ہمیں علم نجوم تو آتا نہیں کہ معلوم کرتے آپ دونوں کا محل وقوع کہاں ہے۔'' وہ جل کر بولا۔

''عجیب پاگل شخص ہیں آپ!'' وہ چڑ کر بولی۔ ''کسی بات کا صحیح جواب نہیں دے رہے۔ مجھے باہر جانے دیں، میں اپنے گھر فون تو کروں۔'' وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی۔

''اپنی اس زخمی دوست کے گھر بھی فون کر آئیں یا کب تک میں اس کی تیمارداری کو بیٹھا رہوں، پہلے ہی صبح سے نیکی کما رہا ہوں۔'' وہ پیچھے سے تڑخ کر بولا۔

''اوہ، اس کے گھر والے۔'' وہ ٹھٹک کر رک گئی۔

''کیوں، یہ کیا کسی درخت پر رہتی ہے یا زمین سے اگی ہے جو اس کے گھر والوں کا سن کر آپ کو سکتہ ہو چلا ہے۔'' وہ سخت تپا ہوا تھا۔

''گھر ہے تو سہی۔'' وہ ایک دم سے خاموش ہو گئی۔ ''میں فون کر کے آتی ہوں۔''

وہ جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ وہ بھی اس کے پیچھے باہر نکل گیا۔

وہ ریسپشن پر کھڑی نمبر ڈائل کر رہی تھی۔

''جی امی! میں ہوں درخشاں۔!'' وہ کہہ رہی تھی۔ ''سوری امی! میں ہاسپٹل سے بول رہی ہوں۔'' اس نے ریسپشن پر لکھا ہاسپٹل کا نام پڑھ کر بتایا۔

''امی! میں تفصیل آپ کو گھر آ کر بتاؤں گی۔ آپ یاسر کو بھیج دیں، میں انتظار کر رہی ہوں۔''

''جی سب کچھ گھر آ کر بتاؤں گی۔ ابو تو نہیں آئے ابھی۔''

''او کے امی! اللہ حافظ۔'' وہ ریسیور رکھ کر مڑی۔

''مس درخشاں پلیز! وہ ان محترمہ کے گھر بھی فون کر دیں کہ انہیں کوئی آ کر لے جائے تاکہ میں بھی اپنے گھر جا سکوں۔ دیکھیں تو موسم کا حال۔'' وہ لجاجت سے بولا۔

''مسٹر! میں اس کے گھر فون نہیں کر سکتی، توبہ......'' اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

''بے چاری کا اللہ جانے اب کیا حشر کریں۔''

''کیا مطلب؟'' وہ حیران ہو کر بولا۔

''میں ان کے گھر کا نمبر ملا دیتی ہوں، آپ خود بات کر لیں۔'' اس نے جواب دینے کے بجائے نمبر ملانا شروع کر دیا۔

''ہیلو السلام علیکم آنٹی! میں درخشاں ہوں، فائقہ کی دوست۔ آنٹی فائقہ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ آپ آ جائیں یا انکل کو بھیج دیں۔'' وہ جلدی جلدی ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گئی۔

''دیکھو بی بی! یہاں کوئی فائقہ نام کی منحوس لڑکی نہیں رہتی۔ وہ کل رات کو گھر سے بھاگ چکی ہے۔ اپنے کسی نکھٹو کے ساتھ، کل رات کو اس کا باپ گھر پر نہیں تھا۔ اس نے باپ کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھایا اور گھر سے زیور اور نقدی سمیٹ کر اپنے کسی یار کے ساتھ بھاگ گئی۔

''حرام خور سارا میرا زیور، میری جمع پونجی پر ہاتھ صاف کر گئی۔ میں اسے بخش دوں گی، کبھی نہیں اور اب ادھر فون مت کرنا، ادھر کوئی اس کا سگا نہیں بیٹھا جو ان کے ڈھکوسلوں پر یقین کرے گا۔'' کہہ کر انہوں نے کھٹاک سے فون بند کر دیا۔

''کیا ہوا؟'' ارتضیٰ نے بے تابی سے پوچھا۔

درخشاں ریسپشن سے ہٹ کر برآمدے کی طرف بڑھی۔

''فائقہ کی ماں سوتیلی ہے اور باپ بھی سوتیلا ہی سمجھیں۔ فائقہ کی سگی ماں تو اسے جنم دیتے ہی مر گئی تھی۔ فائقہ کے فادر نے دوسری شادی کر لی۔ چند برسوں بعد ہی ان کی بھی ڈیتھ ہو گئی تو فائقہ کے چچا نے اس کی سوتیلی ماں سے نکاح کر لیا، جبکہ اس کی اسٹیپ مدر فائقہ سے اس قدر نفرت کرتی ہے کہ اگر اس کا بس چلے تو وہ اسے زہر ہی دے ڈالے مگر زہر سے تو بندہ ایک ہی دفعہ میں مر جاتا ہے، وہ اسے روز مارتی ہے اور اس کے چچا، بیوی کے بے دام کے غلام ہیں۔ شروع میں انہوں نے فائقہ ہی کی وجہ سے اس عورت سے نکاح کیا تھا مگر بعد میں فائقہ ہی کو نظر انداز کر دیا۔''

''اوہ!'' ارتضیٰ کی سمجھ میں نہ آیا کہ کس طرح اظہار افسوس کرے۔

''اس کے چچا شہر سے باہر کسی قصبے میں نوکری کرتے ہیں۔ ویسے بھی ان کی جاب مارکیٹنگ کی ہے۔ رات وہ گھر ہی نہیں آئے تھے۔ فائقہ مجھے بتا رہی تھی کہ اس کی ماں نے اپنے کسی اوباش بھانجے کو بلا رکھا تھا اسی لیے فائقہ نے خود کو رات بھر کمرے میں بند رکھا اور صبح وہ تیار ہو کر پچھلے دروازے سے کالج کے لیے آ گئی۔ آج کل تو اس کی ماں اس کی جی بھر کی دشمن ہو رہی ہے۔ کئی بار اسے چچا کی نظروں سے گرانے کی کوشش کر چکی ہے۔ اس کے چچا بھی اس سے اب بہت بیزار ہو چکے ہیں اور وہ اس کی شادی اس کی ماں کے اسی اوباش بھانجے سے کرنے والے ہیں۔ صبح وہ روتے روتے مجھے یہی تو بتا رہی تھی کہ آپ کی گاڑی نے ہمیں ٹکر مار دی۔ اب اگر وہ گھر گئی بھی تو اس کے چچا نے اسے گھر میں نہیں رکھنا۔ اس سے تو بہتر ہے وہ دارالامان چلی جائے۔'' وہ افسردہ لہجے میں کہہ رہی تھی اور ارتضیٰ بس اس کا پریشان چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔

''آپ کو معلوم ہے دارالامان کیسی جگہ ہے؟'' وہ کچھ دیر بعد بولا۔

''معلوم ہے، مگر اس کے علاوہ اس کے پاس اور کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے، میں اسے کئی سالوں سے جانتی ہوں۔ وہ صرف گھر میں رہنے اور پڑھنے کے عوض اپنی ماضی کی ساری زیادتیاں خاموشی سے سہتی آ رہی ہے۔ مگر اس نے اپنے چچا کو بھی کچھ نہیں بتایا۔ ویسے بھی دو چار ماہ میں یہ ملک چھوڑ کر سعودیہ جا رہے ہیں ہمیشہ کے لیے فائقہ کو اس بدمعاش ندیم کے ساتھ بیاہ کر۔ انہیں وہاں اچھی ملازمت مل گئی ہے، فائقہ دن رات روتی رہتی ہے کہ کیا کرے۔ گھر سے بھاگ جائے یا شادی سے انکار کر دے تو بھی کسی نے انکار کو نہیں سننا۔ اس لیے وہ چاہتی تھی کہ وہ گریجویشن کر لے، شاید اسے کہیں چھوٹی موٹی نوکری مل جائے۔ وہ کچھ اپنا بوجھ اٹھانے کے قابل ہو جائے مگر وہ نہیں جانتی اس معاشرے میں اکیلی لڑکی کیسے رہ سکتی ہے اور افسوس، میں بھی اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔ میں بھی تو ایک لڑکی ہوں۔'' اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

''آپ کا نام کیا ہے؟'' آنکھیں پونچھتے ہوئے اسے ایک دم سے خیال آیا تو پوچھ بیٹھی۔

''ارتضیٰ! اب میں کیا کروں؟'' وہ بے بسی سے بولا۔

''کیا آپ اس کے لیے کچھ کر سکتے ہیں۔'' اس نے ایک آس سے پوچھا۔

''محترمہ! میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں تو خود ابھی اپنے والد صاحب پر ڈیپینڈ کرتا ہوں۔ نہ میرا کوئی اپنا گھر ہے، نہ دفتر اور نہ کوئی ایسا ادارہ جہاں ایسی مظلوم و بے سہارا لڑکیوں کو رکھا جاتا ہے۔'' وہ چڑ کر بولا۔

''اوہ، میرا بھائی آ گیا؟'' وہ ایک دم سے الرٹ ہو گئی۔ ایک لڑکا گلاس ڈور دھکیل کر اندر داخل ہو رہا تھا۔ بارش کی وجہ سے ہاسپٹل میں بھی رش کم تھا اور سڑک پر بھی۔

''یہ کیا ہوا تمہیں؟'' وہ درخشاں کے ماتھے پر لگی بینڈ ایج کو دیکھ کر پریشانی سے بولا۔

''معمولی سا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا ان کی گاڑی سے۔ اب میں ٹھیک ہوں۔'' وہ بھائی کو تسلی دیتے ہوئے بولی۔

''کیا یہ اندھے ہو کر گاڑی چلا رہے تھے۔'' لڑکا بہن کی محبت میں کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا۔

''زبان سنبھال کر مسٹر!'' ارتضیٰ کو بھی غصہ آ گیا۔

''بھائی! ان کا قصور نہیں وہ میں اور فائقہ باتوں میں مگن تھے۔ ہمیں ان کا ہارن سنائی ہی نہیں دیا۔'' درخشاں جلدی سے ارتضیٰ کی صفائی میں بولی۔

''فائقہ بھی تمہارے ساتھ تھی۔''

''ہاں، اسے تو کافی چوٹیں آئی ہیں۔ ابھی ہوش بھی نہیں آیا۔ کمرے میں ہے۔'' وہ فوراً بولی۔

''اب تمہارا کیا پروگرام ہے، چلیں؟'' وہ جانے کو تیار ہوا۔

''ہاں چلیں۔'' وہ بھی فوراً تیار ہو گئی۔

''سنیں محترمہ! میں بھی جا رہا ہوں۔ میں نے کوئی ٹھیکہ نہیں لے رکھا انسانی ہمدردی کا۔ جتنا جرم کیا تھا، اس کی کافی سزا بھگت چکا ہوں۔ آپ سے پہلے میں جا رہا ہوں۔'' وہ تیزی سے باہر جانے لگا۔

''ارے سنیں تو رکیں ذرا۔ میں ادھر ہی ہوں ابھی۔'' درخشاں نے مختصراً بھائی کو ساری بات بتائی۔

''اوہ، یہ تو بہت گڑبڑ ہو گئی ہے، اب کیا کریں؟'' وہ بھی تشویش سے بولا۔ ''بارش تیز ہوتی جا رہی ہے اور ابو بھی آنے والے ہیں، انہیں پتا چل گیا تو ...... تمہیں معلوم ہے نا۔'' وہ ڈر کر بولا۔

''مگر میں اسے اس طرح بھی تو چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ تھوڑی سی دیر اور......'' وہ منت سے بولی۔ ''بس فائقہ کو ہوش آ جائے پھر چلتے ہیں۔''

''چلو دیکھتے ہیں اسے۔'' وہ کچھ بیزاری سے آگے بڑھا تو درخشاں تیزی سے اس کے کمرے کی طرف بڑھی، جہاں فائقہ زیر علاج تھی۔

''اوہ اسے تو ہوش آ گیا ہے۔'' فائقہ تکیے کے سہارے بیٹھی تھی اور نرس اس کا بی پی چیک کر رہی تھی۔ فائقہ کی درخشاں پر نظر پڑی۔

''درخشاں!'' وہ فوراً بولی۔

''فائقہ! تم ٹھیک ہو نا اب۔'' درخشاں ہمدردی سے دوست کی طرف بڑھی اور اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔

''آپ انہیں گھر لے جانا چاہیں تو لے جا سکتے ہیں۔ کل آ کر دوبارہ بینڈیج کرا لیجیے گا۔ خوف سے بے ہوش ہو گئی تھیں۔ ویسے اب یہ بالکل ٹھیک ہیں۔'' نرس نے بی پی

آپریٹس سمیٹتے ہوئے کہا اور باہر نکل گئی۔

''درخشاں! میں یہاں کیسے؟'' وہ نقاہت سے بولی۔

''یہ ارتضیٰ صاحب ہیں، ہم ان کی گاڑی سے ٹکرائے تھے پھر بھی دیکھو، ان کی مہربانی یہ ہمیں ہاسپٹل لے کر آئے اور ابھی بھی یہاں ہیں فرار نہیں ہوئے شام ہونے کے باوجود۔'' درخشاں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

''کیا شام ہو گئی، او مائی گاڈ۔ درخشاں میں ...... میں یہاں گھر ...... تمہیں پتا ہے نا۔ درخشاں! میرے گھر اطلاع کی؟'' اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہوئے۔

''ہاں کی ہے۔''

''پھر پاپا تھے۔'' وہ بڑی امید سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

''نہیں، وہ ابھی نہیں آئے تھے۔''

''اوہ، اب کیا ہوگا۔ امی تو پہلے ہی ......'' وہ رو دینے کو تھی۔

''دیکھیں محترمہ! میرے خیال میں اور ڈاکٹر کے خیال کے مطابق اب آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ میرا خیال ہے، آپ ہمت کریں تو ہم آپ کو آپ کے گھر چھوڑ دیتے ہیں۔'' ارتضیٰ نے آگے بڑھ کر کچھ روکھے انداز سے کہا۔

''ہاں فائقہ! میرا خیال ہے چلنا چاہیے۔ بہت دیر ہو رہی ہے۔ میرے ابو بھی آ گئے ہوں گے۔'' درخشاں بولی تو فائقہ نے ہولے سے سر ہلا دیا اور دوپٹہ اچھی طرح سر پر اوڑھنے لگی۔

''چلیں۔'' وہ آہستگی سے کہہ کر بیڈ سے نیچے اتری۔

''آپ لوگ باہر آئیں۔ میں ریسپشن پر بل وغیرہ دیکھ لوں۔'' کہہ کر ارتضیٰ باہر نکل گیا تو یاسر بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔

جب وہ ہاسپٹل سے نکل کر گاڑی میں بیٹھے تو بارش اسی رفتار سے جاری تھی۔ سردی میں بھی اضافہ ہو چکا تھا اور بارش کی وجہ سے لوگ جلدی گھروں میں چلے گئے تھے اس لیے سڑکوں پر رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ مارکیٹیں بھی بند ہو رہی تھیں۔ جوں جوں فائقہ کا گھر نزدیک آتا جا رہا تھا اس کا رنگ اڑتا جا رہا تھا۔

"درخشاں! امی مجھے کبھی بھی گھر میں داخل نہیں ہونے دیں گی۔ مجھے پتا ہے۔"
اندر کے خدشات سے گھبرا کر وہ درخشاں کے کان میں بولی۔

"اللہ سے دعا کرو، میں بھی کرتی ہوں۔ اللہ ان کے دل میں رحم ڈال دے۔"
درخشاں نے اسے تسلی دی۔

"تمہارے چچا آ گئے ہوں اللہ کرے۔"

"وہ کیا کریں گے، وہ تو پہلے ہی ......" وہ بے آواز آنسوؤں سے رونے لگی۔ ارتضٰی کو اس کی حالت پر بڑا ترس آیا۔

گاڑی اس نے یاسر کے بتائے ہوئے رستے کی طرف موڑ دی۔ اس ذیلی سڑک پر تیسرا گھر فائقہ کا تھا۔ گھر کی تمام لائٹیں آن تھیں۔ گیٹ البتہ اندر سے بند تھا۔ اس کا گھر تقریباً شہر سے باہر تھا۔ کچھ بارش کی وجہ سے گاڑی آہستہ چلانا پڑی، پہنچتے پہنچتے ہی گھنٹہ اور ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا۔

یاسر نے نیچے اتر کر بیل دی۔ فائقہ پچھلا دروازہ کھول کر سست قدموں سے گیٹ کی طرف بڑھی۔ درخشاں بھی کچھ دیر بعد اس کے پیچھے اتر گئی۔ گیٹ کچھ دیر بعد کھل گیا۔ ادھیڑ عمر کا فربہی مائل آدمی گیٹ پر ڈٹا کھڑا تھا۔ اس کے تیور دور ہی سے بہت بگڑے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے کندھوں کے پیچھے سے ایک عورت کا چہرہ نمودار ہوا۔

"کیا بات ہے۔" اس کی آواز کی کڑک نے ایک لمحے کو ارتضٰی کا بھی دل دھڑکا دیا۔

"السلام علیکم انکل!" یاسر گڑبڑا کر بولا۔ "یہ فائقہ! ہم اسے چھوڑنے آئے ہیں۔"

"ہم اس کو نہیں جانتے یہ کون ہے۔" سرد لہجے میں پھنکارا۔ "اس سے کہو، جہاں سے آئی ہے، وہیں دفع ہو جائے۔" وہ انتہائی نفرت سے فائقہ کی طرف دیکھ کر بولے۔ ارتضٰی نے گاڑی بند کی اور اتر کر گیٹ کی طرف بڑھا۔

"انکل! ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا تو یہ ہاسپٹل ......" یاسر نے جلدی سے سارا ماجرا سنانا چاہا۔

"دیکھو لڑکے! میں تمہیں نہیں جانتا۔ جسے جانتا تھا اس نے ہی ایک رات میں میری

عزت مٹی میں ملا دی تو اب کیا میں غیروں کے منہ سے صفائیاں سنوں گا۔ اس سے کہو، یہاں سے دفع ہو جائے۔ جہاں رات اور سارا دن گزارا کر آئی ہے وہیں چلی جائے۔ اس گھر میں اب اس کے لیے کوئی جگہ نہیں۔" وہ گیٹ بند کرنے کو تھے۔

"پاپا پلیز پاپا! میری بات سنیں۔ میں رات کو تو کہیں نہیں گئی تھی۔ میں تو صبح کالج ......" فائقہ تڑپ کر آگے بڑھی اور باپ کے سامنے گڑگڑا کر بولی۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" اس کے پاپا نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی ارتضٰی سے جا ٹکرائی۔

"انکل! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ تو صبح کالج میں تھی میرے ساتھ۔" درخشاں نے صفائی دینی چاہی۔

"جیسی یہ آوارہ خود، ویسی اس کی دوستیاں۔" پیچھے کھڑی عورت تنفر سے بولی۔

"منہ سنبھال کر بات کریں آپ خاتون! میری بہن کو کچھ کہنے سے پہلے سوچ لیں۔ اس کے وارث ابھی آپ لوگوں کی طرح بے غیرت نہیں ہوئے۔"

یاسر اس تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھا، گویا اس عورت کا منہ ہی نوچ لے گا۔

"تو لے جاؤ غیرت کے ان نمونوں کو اٹھا کر یہاں سے پھر ہمارے پاس منتیں کرنے کیوں آئے ہو۔" وہ بھی جواباً چیخ کر بولی۔

"دیکھیں! آپ بات کو خواہ مخواہ بڑھا رہے ہیں۔ بات کچھ بھی نہیں ہے۔ صبح ان دونوں کا اپنے کالج کی سڑک پر میری گاڑی سے ایکسیڈنٹ ہوا۔ دونوں بے ہوش ہو کر گر گئیں۔ میں انہیں ہاسپٹل لے گیا اور ابھی ہم ہاسپٹل ہی سے آ رہے ہیں اور آپ خواہ مخواہ بات کو نہ جانے کدھر لے کر جا رہے ہیں۔ یہ دیکھیں ہاسپٹل کے چارجز کی رسید ہے۔" ارتضٰی سے زیادہ برداشت نہ ہوا تو آگے بڑھ کر بولا۔ جیب سے رسید نکال کر ان کی طرف بڑھائی جس کی طرف اس نے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ بارش اسی رفتار سے ہو رہی تھی۔

"اے مسٹر! تم نے اسے جہاں سڑک سے اٹھایا، وہیں جا کر کسی گٹر میں گرا آؤ۔ ہمارا اب اس سے کوئی تعلق نہیں، کوئی واسطہ نہیں۔ میں تو پہلے ہی اس کی حرکتوں سے عاجز آ چکا ہوں۔ یہ تو اس کی ماں کی شرافت تھی جو اس کی حرکتوں پر پردے ڈالے رکھتی تھی مگر اب کی بار تو

اس نے حد ہی کر دی۔

"چلی جاؤ یہاں سے اور دوبارہ کبھی ادھر کا رخ نہ کرنا۔" چیخنے چلانے کی آواز پر ارد گرد کے گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں کھلنی شروع ہو گئیں۔

"یہ جھوٹ ہے، بہتان ہے۔ میں یہیں تھی رات بھر صبح بھی..... " وہ روتے روتے چچا کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ "مجھے آپ کی قسم..... میں رات کو یہیں تھی گھر پر۔ امی نے مجھ پر غلط الزام....."

"چلی جاؤ یہاں سے دور ہو جاؤ، اتنی قربانیاں دے کر پالنے والی ماں پر الزام دھر رہی ہو احسان فراموش۔ میں تمہاری صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔" انہوں نے فائقہ کو پرے دھکیلتے ہوئے مڑ کر گیٹ بند کر دیا۔

وہ تینوں ہکا بکا رہ گئے تھے۔

"فائقہ! اٹھو پلیز۔" درخشاں نے جھک کر اسے اٹھایا، وہ بہت مشکل سے اٹھی۔ بے ساختہ اس کا ہاتھ اپنے سر پر بندھی پٹی کی طرف گیا۔ شاید اسے درد ہو رہا تھا۔ ابھی زخم بھی تو بالکل تازہ تھے، اوپر سے یہ افتاد۔

"میں نے تو ایسے سنگدل گھر والے کہیں نہیں دیکھے۔ مجھے تو یہ صاحب پاگل لگتے ہیں۔ کوئی اس طرح کرتا ہے بھلا۔" ارتضیٰ نے غصے سے کہا۔

"یہ واقعی پاگل ہیں، بیوی کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔" یاسر جیسے کڑھ کر بولا۔

"چلو درخشاں! بہت دیر ہو گئی، ابو آ گئے ہوں گے۔ تمہاری یہ حالت دیکھ کر وہ نہ جانے کیا سمجھیں، چلو اب۔" یاسر نے پلٹ کر درخشاں سے کہا۔ فائقہ کی سسکیاں تیز ہو گئیں۔

"بھائی..... بھائی!" درخشاں کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

"ہم فائقہ کو ساتھ لے جائیں، اب یہ کہاں جائے گی؟" وہ آس بھرے لہجے میں بولی۔

"ابو سے کیا کہو گی، ساری بات بتا پاؤ گی۔" وہ تیکھے لہجے میں بولا۔

"بھائی، یہ کہاں جائے گی اس وقت؟" درخشاں جیسے خود رو دینے کو تھی۔

"یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے، بس چلو تم۔" یاسر نے بے حسی سے اس کا بازو کھینچ کر اسے

فائقہ سے الگ کیا اور خود سڑک کی طرف قدم بڑھا دیے۔

"فائقہ! آئی ایم سوری، میں مجبور ہوں۔" وہ جاتے جاتے بے بسی سے بولی۔

اب وہ دونوں بھیگتی بارش میں کھڑے تھے۔ ارتضیٰ حیران پریشان اور وہ منہ چھپائے روئے جا رہی تھی۔

"میں بھی جا رہا ہوں، اس سے زیادہ میں اور کیا کر سکتا ہوں۔" کہہ کر وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھا تو جیسے فائقہ کو ہوش آ گیا۔ اس نے رونا بند کر کے چہرے سے ہاتھ ہٹائے۔ ارتضیٰ گاڑی کا دروازہ کھول رہا تھا۔ گھر کا گیٹ بند تھا۔ سردی بھی بڑھ چکی تھی، کپڑے اس کے سارے بھیگ چکے تھے اور سڑک بالکل سنسان تھی۔

"اگر یہ بھی چلے گئے تو..... " ہولناک خیال اس کے دل میں جاگا۔

"پلیز تھوڑی دیر ٹھہر جائیں۔" اس نے ایک نظر بند گیٹ کی طرف اور دوسری نظر گاڑی میں بیٹھے ارتضیٰ کی طرف کی۔

"کیا کروں ٹھہر کر، بارش میں بھیگ کر نمونیہ کرا لوں۔" وہ چڑ کر بولا۔ اس کے دانت بج رہے تھے۔ وہ کچھ نہ بولی اور آگے بڑھ کر ڈور بیل بجانے لگی۔

پھر پانچ منٹ تک وقفے وقفے سے بجاتی رہی، مگر اندر سے کوئی نہیں آیا۔

"تم ساری زندگی بھی ادھر کھڑی رہو گی تو یہ دروازہ اب تم پر نہیں کھلے گا۔ چلی جاؤ یہاں سے، اس گھر میں تمہارے لیے اب کوئی جگہ نہیں۔"

ساتویں منٹ میں اس کی شقی القلب ماں نے برآمدے میں کھڑے ہو کر چلاتے ہوئے کہا اور زور سے اندرونی دروازہ بند کر کے چلی گئی۔

"محترمہ! اب میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"مجھے دارالامان چھوڑ دیں پلیز۔" وہ روتے ہوئے اس کے پاس آ کر بولی۔

"مگر مجھے تو دارالامان کا پتا نہیں۔" دونوں چپ ہو گئے۔

"آپ کا کوئی رشتہ دار، کوئی اور جاننے والا؟" ارتضیٰ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"آئیں میرے ساتھ، یہاں کھڑے کھڑے تو فریز نہیں ہونا۔" اس نے فرنٹ

ڈور اس کے لیے کھولا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"گھر لے جاتا ہوں، صبح دیکھا جائے گا کہ دارالامان کدھر ہے۔" اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔

ایک تو وہ مشاق ڈرائیور نہیں تھا۔ دوسرا سفر شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک کا تھا، تیسرے موسم کی خرابی اور تاریک رات اسے گھر پہنچتے پہنچتے ڈیڑھ گھنٹہ مزید لگ گیا۔

اور یہ ارتضیٰ کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ دنیا اس کے لیے بھی بدل چکی ہے۔ ڈیڈی جو اس کی "آوارہ گردیوں" کو کسی اور ہی رنگ میں لے چکے تھے، رات کے پونے بارہ بجے کے قریب اسے ایک لڑکی کے ساتھ گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر بالکل ہی بھڑک اٹھیں گے۔

"چپ کر کے جدھر سارا دن گزار کر آئے ہو اور یہ گند سمیٹ کر لائے ہو، واپس ادھر ہی چلے جاؤ۔ تمہارے جیسے آوارہ گرد کے لیے اس گھر میں کوئی جگہ نہیں۔" وہ غصے سے آگ بگولہ ہونے لگے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا اسے گولی ہی مار دیں۔

پھر اس کی منت سماجت معافی تلافی کچھ بھی کام نہ آ سکی۔

"نکل جاؤ میرے گھر سے، میں تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔" چلے جاؤ یہاں سے۔" وہ بری طرح اس پر چیخنے لگے۔

"بہت دنوں سے مجھے تمہاری رپورٹس مل رہی تھیں۔ رات رات بھر ان آوارگیوں کے چکر میں گھر نہیں آتے۔ ڈرنک تم کرتے ہو، ابھی تلاشی لے کر آیا ہوں تمہارے کمرے کی۔ یہ تینوں خالی بوتلیں مجھے سب ثبوت فراہم کرنے کو کافی ہیں۔"

انہوں نے تین خالی بوتلیں اپنے عقب سے نکال کر گیٹ پر دے ماریں۔ یہ بوتلیں اس کے کمرے میں کہاں سے آ گئیں، اس کا دماغ چکرانے لگا۔

"ارتضیٰ! تم میرے لیے جیتے جی مر گئے، ایسا بدقماش بیٹا ہوگا میرا میں یہ دن دیکھنے سے پہلے مر کیوں نہ گیا۔" ڈیڈی گیٹ بند کر کے جانے لگے تو سامنے کاریڈور سے غائب ہوتا طاہرہ بھابی کا چہرہ جس پر بہت جاندار مسکراہٹ تھی۔ اسے سارا کھیل سمجھ آ گیا۔

آدھے گھنٹے کی بے سود دہائی اور چیخ و پکار کے بعد وہ خود ہی گیٹ سے باہر نکل آیا۔

دونوں چپ چاپ گاڑی میں جا بیٹھے۔ ڈیڈی نے چوکیدار سے گیٹ پر تالا ڈلوا دیا۔ تالا اگر نہ بھی ہوتا تو بھی اب اسے پلٹنا نہیں تھا پھر وہ فرحان کے دروازے پر گیا۔

اس کے والدین گھر پر نہیں تھے۔ ساری کتھا سن کر وہ بھی حیران رہ گیا۔

"یار! یہ تو کوئی فلمی کہانی لگتی ہے بلکہ دو کہانیاں، ناقابل یقین۔"

وہ رات بڑی قیامت خیز تھی۔ اس رات نے اس پر زندگی کے بہت سے راز منکشف کیے تھے۔ دن کل بھی آیا تو کیا اس ذلت کے داغ کو دھو سکے گا جو رات کی سیاہی نے اس کے منہ پر لگائے تھے۔ کردار صرف عورت کا نہیں مرد کا بھی ہوتا ہے۔ اس کے اپنے سگے باپ نے اس پر بدکرداری کی تہمت لگائی تھی۔

"میں تو مرد ہوں، کہیں نہ کہیں ٹھکانہ کر لوں گا مگر اب اس گھر میں نہیں جاؤں گا اور یہ مظلوم لڑکی، یہ کہاں جائے گی۔"

اور صبح اس کی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ اپنے دامن میں لے کر طلوع ہوئی۔ اس نے فرحان کے ساتھ کورٹ میں جا کر فائقہ سے کورٹ میرج کر لی۔ اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس لڑکی کا دکھ اسے اپنے سے بھی بڑا لگ رہا تھا۔

"فائقہ! ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ زندگی نے جو کچھ میرے ساتھ کیا، مجھے اس کا گمان تک نہیں تھا اور اب مجھے ایسا لگتا ہے، میں کسی اندھیری گلی میں کھڑا ہوں۔ یہ گلی کدھر جائے گی، یہ اندھیرا کب چھٹے گا، مجھے اس کا کچھ علم نہیں۔ بس قدرت نے ہمیں اس طرح سے ایک کرنا تھا۔ تم میرے بارے میں نہیں جانتیں اور میں تمہارے بارے میں۔ ہم جو کچھ جانتے ہیں ایک دوسرے کے بارے میں اپنے گھر والوں کے القابات سے۔" وہ کھوکھلی ہنسی ہنسا۔

"ایک معمولی سے حادثے نے ہمیں ہمیشہ کے لیے ایک زندگی کا ہمسفر بنا دیا ہے۔ اس زندگی کا جس کی الجھی ہوئی تاریں میں اکیلا نہیں سلجھا سکتا اس کے لیے مجھے تمہاری محبت بھری رفاقت کی ضرورت ہوگی۔ میں کہہ رہا ہوں، کیا کہنا چاہ رہا ہوں، تم سمجھ رہی ہو نا؟" یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا تھا کہ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ملن کی ان اولین ساعتوں میں کیا کہا جائے۔

فائقہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پھر زندگی کا ایک کٹھن ترین اور مشکل ترین دور تھا جو دونوں نے ایک دوسرے کی محبت بھری رفاقت میں بڑے سہل انداز میں کاٹا تھا۔ بعد میں مرتضیٰ بھائی نے خفیہ طور پر اس کی مدد کرنا چاہی مگر اس نے انکار کر دیا۔

''بھائی جان! مجھے کچھ بھی نہیں چاہیے۔ اس مشکل ترین اور کٹھن رات کے بعد اب کچھ بھی دشوار اور تکلیف دہ نہیں لگتا۔ آپ بس ڈیڈی سے کہیں وہ مجھے معاف کر دیں۔ ان کی خفگی کا بوجھ مجھ سے نہیں سہا جاتا۔''

ڈیڈی نے اسے معاف بھی کیا تو اس لمحے جب ان کی سانسیں سینے میں اٹک رہی تھیں۔

''ارتضیٰ! میں نے تمہیں معاف کیا، سچ پوچھو زندگی کے اختصار کی ایک وجہ تمہاری جدائی بھی رہی ہے اولاد دکھی ہو تو ماں باپ چین کی زندگی نہیں گزار سکتے۔ میں نے تمہیں عاق نہیں کیا، یہ گھر جس سے میں نے تمہیں رات کے اندھیرے میں دھکے دے کر نکالا تھا، میں نے تمہیں، تمہاری دلہن کو اس گھر کا تنہا وارث بنا دیا ہے اور فائقہ کے لیے یہ زیورات بھی جو آدھے سے زیادہ تمہاری ماں کے ہیں۔'' وہ سانس لینے کو رکے۔

''طاہرہ نے جو کچھ تمہارے اور میرے ساتھ کیا، اس کا مداوا نہ میں کر سکتا ہوں نہ وقت۔ یہ گھاؤ شاید کبھی نہ بھرے۔ مجھے طاہرہ کی گندی ذہنیت کا علم ہوا تو کب، جب سانسیں اکھڑ رہی ہیں۔ اس نے جائیداد کے رستے میں تمہارا کانٹا دور کرنے کے لیے یہ جال بچھایا تھا۔ وہ روز مجھے بریف کرتی کہ تم رات بھر غائب رہتے ہو، گھر سے زیورات چرا کر لے جاتے ہو اور نشہ کرتے ہو، میں آنکھوں اور عقل کا اندھا ''

ان کی سانسیں اکھڑنے لگیں۔ انہوں نے بے ساختہ اپنے دونوں ہاتھ اس کے آگے جوڑ دیے۔ اس نے ان ناتواں لرزتے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ اب اسے کچھ نہیں چاہیے تھا۔

''بزنس سارا مرتضیٰ کے پاس رہے گا اور گھر تمہارے نام۔ دونوں کی مالیت برابر ہے۔ تم اب اپنی بیوی کو لے کر گھر آ جاؤ مجھے خوشی ''اور جملہ پورا کرنے کی انہیں قدرت کی

طرف سے مہلت ہی نہ مل سکی۔

وہ دونوں میاں بیوی تین کے ساتھ ڈیڈی کے سوئم سے اگلے دن تک رہے اور جب شام کو جانے لگے تو مرتضیٰ نے ایک بار بھی نہ روکا اور طاہرہ بھابھی نے تو اس دوران ان سے ڈھنگ سے بات بھی نہ کی تھی۔ فائقہ اسی لیے جلد ادھر سے جانا چاہ رہی تھی۔ ارتضیٰ منتظر ہی رہا کہ وہ اسے ڈیڈی کی آخری خواہش یاد دلا کر روکنے کی کوشش کریں گے۔ مگر وہ انجان بنے رہے۔



چالیسواں بھی ہو گیا اور گھر آنے کی دعوت انہیں نہ ملی اور اپنے اندر ارتضیٰ نے حوصلہ نہ پایا کہ اپنا حق جتا سکے۔ دونوں میاں بیوی کسمپرسی کے عالم میں کرائے کے گھر میں رہے۔ ارتضیٰ کی جاب میں بمشکل گزارا ہوتا تھا اور دو کمروں کے کرائے کے گھر میں سہولتوں کا بھی فقدان تھا۔

''ارتضیٰ! تم کوئی اچھا گھر لے لو، یہاں تو دم گھٹتا ہے۔ پھر فائقہ اس حال سے ہے، پانی بھرنے کے لیے اسے بار بار نیچے جانا پڑتا ہے۔'' ثمینہ دوسری بار ان کے گھر آئیں تو رہنے لگیں۔ ثمینہ بھی شاید باپ کی وصیت نامے سے بے خبر تھیں۔

''اچھا آپی! کوشش کروں گا۔'' ارتضیٰ نے نیچی نظروں سے کہا۔

اور وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔

فائقہ بہت سنبھل سنبھل کر سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ اوپر سے تین روئے جا رہی تھی۔ پانی کی چھوٹی بالٹی لے کر وہ جونہی چوتھی سیڑھی پر پہنچی تین کی زوردار چیخ پر اس کے ہاتھ سے بالٹی چھوٹ کر پھسل گئی اور ساتھ ہی اس کا قدم بھی۔

پھر ڈاکٹروں نے بہت کوشش کی مگر وہ صرف بچی کو ہی بچا سکے۔ فائقہ بچی کو دیکھ بھی نہ سکی۔

ارتضیٰ کے بے تحاشا بہتے خاموش آنسوؤں اور تین کی ''ماما، ماما'' کی چیخ و پکار بھی اسے نہ اٹھا سکی۔

اب تزئین کو کون پالے گا؟ ہمسائی کی گود میں آنکھیں موند کر سوتی تزئین سب کے

لیے سوالیہ نشان بن گئی۔

زندگی پہلے ہی کون سی آسان تھی، اب تو جیسے مشکل ترین ہو گئی تھی۔ ارتضیٰ نے ایک کل وقتی آیا رکھ لی جو اضافی پیسے بچتے وہ اس کی تنخواہ میں نکل جاتے۔

دن بہت لمبے ہو گئے تھے اور راتیں طویل ترین۔

ان تلخیوں اور بے تحاشا ضبط کا نتیجہ سنگین بیماری کی شکل میں نکلا۔

سبین میٹرک میں تھی اور تزئین سیونتھ میں، جب ثمینہ تقریباً چار سال بعد آئی تھی وہ چھوٹے بھائی کی حالت دیکھ کر رو ہی پڑی۔

''ارتضیٰ یہ تم نے اپنا کیا حال کر لیا ہے؟''

''کیا کر لیا ہے آپا! بھلا چنگا ہو چکا ہوں۔'' وہ پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولے۔

ان کا رنگ کالا سیاہ ہو چکا تھا اور جسم جیسے ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا تھا۔

''علاج نہیں کروا رہے؟'' وہ ان کے دونوں ہاتھ تھام کر دل گرفتی سے بولیں۔

''کروا رہا ہوں آپا! جتنی بساط ہے۔'' وہ لاپروائی سے بولے۔

''مرتضیٰ بھائی سے مدد کیوں نہیں لیتے۔ وہ اس شہر میں رہتے ہیں، انہیں خیال نہیں۔ ڈیڈی تمہیں عاق کر کے تمہارے ساتھ کتنی زیادتی کر گئے۔''

''بھائی کے اپنے مسائل ہیں بچے ہیں، گھر داری ہے، مہینے دو مہینے بعد آ تو جاتے ہیں خیریت پوچھنے یہ کیا کم ہے۔'' پتا نہیں اس کے اندر اتنا صبر کہاں سے آ گیا تھا۔

''بچیاں بھی بہت کمزور ہو رہی تھی۔'' دونوں سامنے برآمدے میں بیٹھی پڑھ رہی تھیں۔

''بڑی ہو رہی ہیں۔ آپ نے دنوں بعد دیکھا ہے، اس لیے آپ کو لگ رہا ہے۔''

''ارتضیٰ! ماشاء اللہ تزئین تو بہت پیاری ہو گئی ہے۔'' وہ نظروں میں پیار بھر کر تزئین کو دیکھ رہی تھیں۔

''سبین پیاری نہیں؟ مجھے تو دونوں ایک جیسی لگتی ہیں۔'' ارتضیٰ نے جواب دیا۔

''باپ ہوں نا شاید اس لیے۔''

''ارتضیٰ! اگر تم اس رات ڈیڈی کو اس طرح خفا نہ کرتے تو شاید زندگی کا یہ نقشہ نہ

ہوتا۔'' وہ افسردگی سے گھر کے در و دیوار پر نگاہ ڈال کر بولیں۔

''تب بھی یہی کچھ ہوتا آپا! ہر انسان کے مقدر میں جو کچھ لکھا ہوتا ہے، وہ ہو کر ہی رہتا ہے۔ وجہ خواہ کچھ بھی بنے، یہ لیجیے مرتضیٰ بھائی بھی آ گئے۔''

اسی وقت مرتضیٰ اپنی بیوی کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ طاہرہ یہاں دوسری دفعہ آئی تھیں۔ ان کے ساتھ ثمینہ کا اکلوتا بیٹا سعید تھا۔ اونچا، لمبا، چٹا دبلا خوبصورت سا لڑکا اور ارتضیٰ نے تو اسے بہت دنوں بعد دیکھا تھا۔

''آپا! یہ سعد ہے ماشاء اللہ۔'' وہ اٹھ کر اس سے گلے ملے۔

''ہاں، بڑا ہو گیا ہے نا۔'' ثمینہ نے ارتضیٰ کی تائید چاہی۔ سبین اور تزئین بھی اپنا ہوم ورک چھوڑ کر دلچسپی سے سعد کو دیکھنے لگیں۔''

''بھائی جان! پتا ہے میں ارتضیٰ سے کیا کہہ رہی تھی۔'' ثمینہ کو جیسے کچھ یاد آیا۔

''کیا؟'' طاہرہ بھابھی ایک دم سے متجسس ہو کر بولیں۔

''تزئین کتنی پیاری ہو گئی ہے۔'' وہ آگے بڑھ کر تزئین کو گلے لگا کر بولیں۔

''ہاں ... اچھا!'' طاہرہ بھابھی نے آنکھیں سکوڑ کر تزئین کو دیکھا کہ وہ کہاں سے پیاری لگ رہی ہے۔

''سعد! تزئین تمہاری دلہن بن کر اور بھی پیاری لگے گی نا۔'' ثمینہ ایک دم سے بہت شوخ ہو گئیں۔ سعد نے کچھ شرما کر تزئین کو دیکھا جس سے ثمینہ نے سینے میں منہ چھپا لیا۔ ارتضیٰ اور سبین مسکرانے لگے۔ مرتضیٰ کچھ سوچنے لگے تھے اور طاہرہ کو غصہ آنے لگا۔

''ابھی بھلا ان کی عمریں ہیں یہ باتیں دماغ میں ڈالنے کی۔'' طاہرہ ناگواری سے بولیں۔

''بھئی ارتضیٰ! آج سے تزئین تو ہوئی میرے سعد کی۔ کیوں۔ سعد! تمہیں پسند ہے نا تزئین۔''

کم سن بیٹے کی رائے جاننا چاہی اور سب کو لگ رہا تھا کہ ثمینہ کا دماغ چل گیا ہے۔

''بہت ماما!'' وہ بولڈ لہجے میں بولا۔

''بس تو پھر آج سے تزئین ہماری۔'' کہہ کر انہوں نے جھٹ سے اپنے گلے میں

پڑا چھوٹا سا ڈائمنڈ کے نگینوں سے جگر جگر کرتا لاکٹ تزئین کے گلے میں ڈال دیا۔

"ثمینہ! یہ نہ کرو، ابھی تزئین بچی ہے، نہیں سنبھال پائے گی۔" ارتضیٰ نے لاکٹ ڈالنے کے دوران اسے روکنا چاہا۔

"تزئین پھپھو کی بات کو سمجھتی ہے۔ اچھی طرح سنبھالے گی، ہے نا تزئین!" وہ اس کا ماتھا چوم کر بڑے مان سے بولیں تو طاہرہ کے اندر بہت کچھ ٹوٹ گیا۔

"چلیں، اب گھر چلیں۔ ادھر تو اس قدر گرمی ہے، میرا دل گھبرا رہا ہے۔" طاہرہ فوراً شوہر سے بولیں تو وہ بھی چلنے کو تیار ہو گئے۔ ثمینہ بھی اٹھ گئیں۔

"ویسے بھابھی! اپنے شہیر کے لیے سبین بری تو نہیں۔" ارتضیٰ نے آگے جاتی ثمینہ کا جملہ سنا۔

"ہونہہ!" طاہرہ کے ہنکارے پر انہوں نے اپنے قدم اور پیچھے کر لیے۔ ثمینہ واپس چلی گئیں۔

دو سال اور بیت گئے۔

ارتضیٰ کا مرض شدت اختیار کر گیا۔ تزئین اور سعد والی بات کے بعد مرتضیٰ صرف دو بار ہی آئے تھے۔ وہی کھڑے کھڑے عجب اکھڑا اکھڑا سا ان کا انداز ہوتا تھا۔ ارتضیٰ کے دل پر جیسے بھاری بوجھ سا آن گرا۔

وہ تو اتنے سال منتظر رہے وہ کب ان کو ان کا حق لوٹاتے ہیں یا لوٹانے کی بات ہی کرتے ہیں یا کوئی ذکر مگر ایسا کچھ بھی نہ ہو سکا۔

ارتضیٰ احمد نے سسک سسک کر اک آس کی اوٹ میں آخری سانسیں بھی لے لیں، جب مرتضیٰ کو انہیں گھر لے جانے کا خیال آیا۔

جس گھر میں برستی بارش میں نکالے گئے تھے اسی گھر میں دوبارہ ایمبولینس پر لائے گئے۔

وہ جان سے ہار گئے، مگر حرف شکایت زبان پر نہ لائے۔

ان کے جانے کے بعد ان کی بیٹیوں کو اس گھر میں جگہ تو مل گئی مگر انتہائی مجبوری کی حالت میں۔

"میرا بھائی کس لاچاری کی حالت میں اس دنیا سے گیا۔ اب اس کے جگر گوشوں کا بھائی جان خیال رکھیے گا بس چند سال اور تزئین بس گریجویشن کر لے مجھے کون سی اس سے جاب کروانی ہے۔"

ثمینہ کہہ رہی تھیں۔ طاہرہ کی بیزاری اس کے چہرے پر لکھی نظر آ رہی تھی۔

پھر ان کی بیزاری دن بدن بڑھتی ہی چلی گئی۔ البتہ سبین کو انہوں نے اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔ وہ دن رات تائی جان کے گیت گانے لگی تھی اس نے انٹر کر کے آگے تعلیم کا سلسلہ ختم کر لیا۔

تائی امی دن کہتیں وہ دن کہتی۔ وہ رات کہتیں، وہ رات کہتی۔ وہ شہیر کو پسند کرتی تھی، اس لیے خود کو تائی امی کی پسند کے سانچے میں ڈھالنا چاہ رہی تھی۔

اور آج اس نے کیا کر دیا، وہی جو تائی امی شروع دن سے کہتی چلی آ رہی تھیں۔

"جیسی ماں ویسی بیٹیاں۔ جس طرح اس نے کورٹ میرج کی یہ دونوں بھی وہی کریں گی۔"

اور کل جب تایا ابو کے ساتھ سبین کے بھاگنے کی خبر سن کر گھر آئی تو تائی امی نے پہلی چیخ تایا ابو کے سامنے ہی ماری۔

"دیکھا، وہی کیا نہ اس ناہنجار نے جو ماں نے کیا تھا۔ جیسی ماں تھی ویسی بیٹی نکلی۔"

"سبین! تم نے ایسا کیوں کیا۔ ماما کی روح کو یوں پھر سے رسوا کیا ہے، کیوں؟"

رات کا ڈیڑھ بجا تھا، وہ بستر پر بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔



روتے روتے شاید وہ سو گئی تھی۔ ایک بے چین نیند بار بار آنکھ کھل جاتی تھی، کسی کروٹ چین نہیں تھا کہ اچانک کسی نے اس کا کندھا ہلایا۔

"تزئین! یہ لو، اٹھ کر کچھ کھا لو۔ تھوڑے سے چاول ہیں۔" فاطمہ بی اندھیرے میں پلیٹ لیے اس کے سر پر کھڑی تھیں۔

"نہیں فاطمہ! شکریہ۔ مجھے بھوک نہیں۔"

تھکے تھکے بوجھل ذہن سے اس نے پلیٹ کو رکھا حالانکہ سونے سے پہلے وہ کچن

میں گئی تھی کہ شاید کھانے کو کچھ مل جائے۔ تائی امی فریج لاک کر گئی تھیں۔ باقی سب برتن خالی تھے۔ وہ ناکام ہی واپس آ کر چپ چاپ لیٹ گئی تھی۔

"کھا لو میری بچی! کل سے بھوکی ہو۔ بیگم صاحبہ تو غصہ میں دیوانی ہو رہی ہیں، تمہارا اس میں کیا قصور۔ چلو اٹھو، شاباش۔ کھا لو تھوڑے سے ہی ہیں۔ ایک کباب بھی ہے۔" فاطمہ بی نے اسے چمکارا۔ ان کے اصرار پر وہ انکار نہ کر سکی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پلیٹ ہاتھ میں لے کر بے دلی سے کھانے لگی۔ چاول واقعی تھوڑے تھے۔ شاید فاطمہ بی نے اپنے حصے میں سے اس کے لیے بچائے تھے۔

"میں یہاں سے اپنی مرضی سے جا رہی ہوں۔ مجھے احمر سے محبت ہے۔ وہ بھی مجھ سے محبت کرتا ہے اور مجھے پتا ہے تایا ابو میری احمر سے شادی پر کبھی راضی نہیں ہوں گے۔ مجھے ادھر ساری عمر بے دام کی ملازمہ بن کر نہیں رہنا۔ تائی امی کے کام تو ساری زندگی ختم نہیں ہوں گے۔ اس بیگار سے جان چھڑانے کا ایک ہی طریقہ نظر آتا ہے کہ احمر سے کورٹ میرج کر لوں اور نئی زندگی شروع کرنے کے لیے ہمیں رقم کی بھی ضرورت ہوگی۔ اس کے لیے ماما کے زیور لے کر جا رہی ہوں۔ تمام کے تمام کیونکہ ان پر میرا حق ہے۔ دادا ابو نے ڈیڈی کو ہر چیز سے عاق کر کے پہلے ہی ہماری زندگیوں کو خاصا تکلیف دہ بنا دیا ہے۔ البتہ تزئین! مجھے اس کے لیے معاف کر دینا کہ میں تمہارا بھی حصہ لے کر جا رہی ہوں اور میں اپنے فیصلے پر بالکل بھی نادم نہیں۔ کوئی مجھے نہ ڈھونڈے، میں اپنی مرضی سے اپنی خوشی سے اس جہنم سے جا رہی ہوں۔"

تبین ارتضیٰ

عاشو اونچی آواز میں پڑھ رہی تھی۔ سب ڈائننگ ٹیبل پر ناشتہ کر رہے تھے۔ چند منٹ پہلے عاشو اس کے کمرے میں آئی تھی۔ نہ جانے کیا ڈھونڈنے۔ الماری، درازیں، تکیے کے نیچے، بیڈ کے نیچے، کرسیوں کی گدیاں اٹھا اٹھا کر وہ ادھر سے ادھر کر رہی تھی۔ تزئین واش روم سے منہ ہاتھ دھو کر نکلی تو عاشو بڑی طرح سے اپنی تلاش میں غرق تھی۔ وہ تولیہ ہاتھ میں پکڑے اسے دیکھتی رہ گئی۔

"عاشو! کیا ڈھونڈ رہی ہو؟" وہ نرمی سے اس کے پاس آ کر بولی۔ عاشو نے کوئی

جواب نہیں دیا، اسی طرح جلدی ڈریسنگ ٹیبل کے دراز کھول کھول کر ہاتھ مارتی رہی۔

"یہ۔" چند لمحوں بعد اس نے سر اٹھا کر ہاتھ میں پکڑا کوئی کاغذ اس کے چہرے کے آگے لہرایا۔

"مجھے اس کی تلاش تھی۔ تبین بی بی کا آخری پیغام ہے۔ ڈیڈی کو یقین تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ ضرور چھوڑ گئی ہوگی۔ ان ہی کے حکم پر میں ڈھونڈنے آئی تھی۔" کہہ کر وہ جھپاک سے کمرے سے نکل گئی اور اب باآواز بلند ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی سب کو سنا رہی تھی۔ فضا میں آملیٹ اور چائے کی مہک رچی ہوئی تھی۔ اس کی بھوکی آنتیں انگڑائی لے کر بیدار ہوئی تھیں۔ وہ ایک بار پھر ناشتے کے لیے بلائے جانے کی امید لے کر جلدی اٹھ گئی تھی۔ مگر اس بار ناشتے کی میز پر اس کا انتظار نہیں کیا گیا تھا۔ سب لوگ مزے سے ناشتے کے ساتھ تبین کا آخری خط انجوائے کر رہے تھے۔ وہ کھڑی کڑھتی رہی پھر ایک دم سے اسے کچھ خیال آیا۔ وہ تیزی سے کمرے سے نکلی اور خط عاشو کے ہاتھ سے جھپٹ لیا اور تیزی سے سطروں پر نظر دوڑانے لگی۔

"یہ...... یہ تبین کی رائٹنگ نہیں ہے تایا ابو! رنگی یہ...... یہ تو......" اسے معلوم تھا عاشو کی رائٹنگ تبین سے کافی حد تک ملتی جلتی ہے اور یہ عاشو کی رائٹنگ تھی، اسے مکمل یقین تھا۔

"اچھا، تو پھر یہ ہم نے لکھا ہے، ہے نا۔ تمہارا مطلب ہے ہم نے خود سے گھڑا ہے تیرے دیدوں کے سامنے۔ عاشو اس نامراد کے دراز سے نکال کر لائی ہے اور تو ہمیں یہ الزام دے رہی ہے۔" تائی امی کڑک کر بولیں۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ بے بسی نے اس کی زبان پر بھی لکنت پیدا کر دی تھی۔

"تائی امی! یقین کریں...... یہ بالکل بھی...... یہ ہے ہی نہیں تبین کی...... رائٹنگ نہیں...... میں سچ کہتی ہوں، یقین سے...... یہ اس نے نہیں لکھا، یہ......" وہ ہکلا رہی تھی۔

"اگر یہ تبین نے نہیں لکھا یا لکھا ہے تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ سب سے کڑوی حقیقت تو یہ ہے کہ وہ بدبخت لڑکی ہمارا منہ کالا کر کے جا چکی ہے۔" تایا ابو کا چہرہ غصے سے لال ہو رہا تھا۔ تزئین کے آنسو بہنے لگے۔

"کمبخت اب دفع ہو ادھر سے، ڈھنگ سے ناشتہ بھی کرنے دے گی یا نہیں، اور تو

بالکل فکر نہ کر جس بیگار کے غم میں وہ منحوس ادھر سے دفعان ہو گئی ہے۔ تجھ سے وہ بیگار نہیں لیں گے، بس آج شام کو آ رہی ہے تیری وہ بیہودہ پھوپھی۔ اس کے سامنے ہی تجھے اس گھر سے دفعان کروں گی۔ رکھنا تو اب کسی صورت نہیں چاہے مجھے سارے زمانے سے ٹکر کیوں نہ لینی پڑے۔

اس نے آنسوؤں بھری نظر "حاضرین" پر ڈالی اور الٹے قدموں کمرے میں واپس آ گئی۔

"یہ...... یہ کیا کہہ رہی ہیں کہ مجھے ادھر نہیں رکھنا، تو میں کدھر جاؤں گی۔ میرا اور کون ہے۔" تائی امی کی اس نئی گل فشانی نے تو اس کے ہوش اڑا دیے۔

"پاپا! میں کدھر جاؤں گی۔ کاش، آپ اپنے حق کے لیے لڑے ہوتے تو آج مجھے یوں ادھر سے بے دخل کرنے کی دھمکیاں نہ دی جاتیں۔" وہ بیڈ کے سرے پر بیٹھ کر رونے لگی اور اس کے اختیار میں بھلا کیا تھا۔



پچھلا ہفتہ اس کی زندگی کا خوشگوار ترین نہ سہی مگر بہت اچھا ہفتہ تھا۔ اس کا ایف ایس سی کا رزلٹ آیا تھا۔ اس کی فرسٹ ڈویژن آئی تھی اور مارکس بھی بہت اچھے تھے۔ انجینئرنگ میں ایڈمیشن نہ ہونے کا اسے افسوس تو بہت تھا مگر اچھے مارکس آنے کی خوشی بھی بہت تھی۔

"میں میتھس میں ایم ایس سی کروں گی۔ یہ تو میرا کریز ہے۔" اس نے خوشی خوشی سین کے سامنے اعلان کیا جو خود اس کی کامیابی پر بہت خوش تھی۔ سین نے اسے خوبصورت ریڈی میڈ سوٹ اور ساتھ میچنگ جیولری گفٹ کی تھی۔

"تمہارے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئے؟" ترئین کو گفٹ دے کر فکر ہوئی کیونکہ سوٹ ٹھیک ٹھاک مہنگا تھا۔

"میں نے جمع کر رکھے تھے اور تھوڑے سے تائی امی سے لے لیے تھے۔" وہ لاپروائی سے بولی۔

"تمہیں اتنی مہنگی شاپنگ نہیں کرنی چاہیے تھی۔" وہ اس کی فضول خرچی پر خوش نہ

تھی۔

"ترئین! ہم دونوں کا ایک دوسرے کے سوا اور ہے ہی کون۔ اگر ہم ایک دوسرے کی خوشی سیلیبریٹ نہیں کریں گے، ایک دوسرے کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا خیال نہیں رکھیں گے تو کون رکھے گا۔ اگر ماما، پاپا ہوتے تو وہ یقیناً تمہاری اتنی بڑی کامیابی کو بہت اچھی طرح سے مناتے اور ہماری خوشیوں کا رنگ ہی اور ہوتا۔" وہ اسے گلے لگا کر سسک ہی پڑی۔

"سین! پلیز روؤ نہیں۔ مجھے تمہارا گفٹ بہت پسند آیا۔ شکریہ، اور مجھے بہت خوشی ہوتی اگر تمہارا بھی اسی طرح بی اے کا رزلٹ نکلا ہوتا اور میں تمہیں کچھ نہ کچھ گفٹ کرتی۔" اس نے سین کی افسردگی کا رخ موڑا۔

"اچھا چھوڑو، تائی امی نے آج بریانی بنانے کا آرڈر دے رکھا ہے۔ تم چائے پیو گی؟ میں اپنے لیے بنانے جا رہی ہوں۔" وہ جاتے جاتے رک کر بولی۔

"سین! یہ عاشو اور احمر صاحب کے ساتھ کیا چکر ہے؟" ترئین نے اسے روکا۔

"معلوم نہیں، بس وہ فیکٹری سے آتا ہے تو عاشو لان یا گیٹ کے گرد ہی منڈلاتی رہتی ہے۔ عمر ہی ایسی ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ تائی جان کی مرضی کے بغیر عاشو تو کوئی کبوتر نہیں پال سکتی۔ لائف پارٹنر تو بہت دور کی بات ہے۔" سین کہہ کر چل پڑی۔

"اور آج پھپھو آ رہی ہیں اور سعد بھی اور تم نے مجھے ان سے نظریں ملانے کے قابل بھی نہیں چھوڑا۔" ایک آہ سی اس کی منہ سے نکلی تھی۔

وہ ایک ہی پہلو پر شاید گھنٹہ بھر بیٹھی رہی تھی اب باہر مکمل خاموشی تھی لگتا تھا تایا ابو فیکٹری جا چکے ہیں۔ تائی امی اپنے کمرے میں ہوں گی، شہیر بھائی اپنی فوکسی لے کر نکل گئے ہوں گے۔ شہر کی سڑکیں ناپنے شفق اور عاشو شاید کالج گئی ہوں یا ہو سکتا ہے نہ گئی ہوں، وہ بیٹھی قیاس کرتی رہی اسے سخت بھوک لگ رہی تھی، بلکہ بھوک سے زیادہ اسے چائے کی طلب ہو رہی تھی، یوں لگ رہا تھا اس نے مدت سے چائے نہیں پی، وہ تھک کر اپنی کنپٹیاں دبانے لگی۔

"لو ترئین! ناشتہ کر لو، ساتھ میں یہ ڈسپرین بھی لائی ہوں بڑی بیگم صاحبہ اپنے کمرے میں گئی ہیں۔ اب تم فٹافٹ کھا لو۔ ان کا غصہ تو لگتا ہے اب بھی ٹھنڈا نہ ہو گا۔"

فاطمہ بی نے ٹرے اس کے بیڈ پر ہی رکھ دی۔ اس نے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا۔

"فاطمہ بی رہنے دیتیں۔" بے حد کمزور سا انکار تھا اس کا۔

"ارے بچے بس کر، یہ گھر والے تو ہو گئے ہے پتھر دل کے۔ تم تو خیال کرو جتنی زندگی دی ہے اللہ تعالیٰ نے اتنی سانسیں تو لینی ہیں، نا کہ یونہی فاقے کر کر کے خود کشی کر لو گی، کھالو اب میں کچن میں جا رہی ہوں۔" وہ تاکید کر کے کمرے سے نکل گئیں اور جاتے ہوئے دروازہ بھی اچھی طرح بند کر گئیں۔

"پتا نہیں ابھی کون کون ترس کھائے گا۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر ٹرے کو دیکھا جس میں ایک فرائی انڈا، دو توس اور چائے کا ایک کپ پڑا تھا۔ وہ چپ چاپ کھانے لگی۔



تقریباً رات ہی ہو چکی تھی جب اس نے ثمینہ پھپھو اور سعد کو گاڑی سے اتر کر اندر آتے دیکھا تھا، ان دونوں کا گھر والوں نے والہانہ انداز میں استقبال کیا تھا۔ شفق اور عاشو کی چہکاریں نمایاں تھیں۔ وہ لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ سعد کی آواز اسی طرح فریش تھی۔ تائی امی اور پھپھو کی باتوں کی آوازیں اسے کمرے میں بھی آ رہی تھیں، وہ کیا کہہ رہی ہیں وہ واضح طور پہ نہ سن پا رہی تھی۔ پھر شاید شفق اور عاشو کچن کی طرف آ گئی تھیں اب آوازیں بالکل نمایاں تھیں۔ تائی امی نے ابتدائی گفتگو کے بعد با آواز بلند تزئین کے گھر سے بھاگ جانے کا قصہ خوب نمک مرچ لگا کر بمعہ اپنے آنسوؤں اور بد دعاؤں کے پھپھو کو سنانا شروع کیا۔ تزئین کو جیسے سارے بدن سے جان نکلنا شروع ہو گئی۔

"ارے ہزار بار منع کیا ان کو۔ اس نامراد احمر کو گھر نہ بھیجا کریں، ہر چھوٹے موٹے کام کے لیے انہیں وہی ہرکارہ ملا ہوا تھا۔ چلو یہ تو سیدھے سادے، انہیں زمانے کی کیا خبر وہ تو کمبخت میری نگاہوں میں دھول جھونک جاتی تھی۔

سارے زیورات جو ڈیڈی نے مرنے سے پہلے ارتضیٰ کے حوالے کیے تھے میں تزئین کو ہی دے رکھے تھے کہ بچی پرائی امانت ہے، خدانخواستہ ایک کیل بھی ادھر ادھر ہو گئی اللہ کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ یتیم بچیوں کا مال ہے ہمارا تو ڈر سے کلیجہ ہی کانپ جاتا ہے۔ مجھے خبر تھی اس نامراد نے تو کچھ اور ہی ٹھان رکھا ہے۔ کہ ہم سب کے منہ کالے کر کے ہی

گی۔" تائی امی سانس لینے کو رکیں۔

"آپ دونوں گھر میں رکیں کیوں، بھائی جان کے ساتھ شادی میں کیوں نہ گئیں۔" ثمینہ پھپھو نے ان کے وقفہ سانس کو غنیمت جان کر سوال جڑا۔

"اے میں بدنصیب کرموں جلی کی اس دن طبیعت خراب ہوئی تھی۔ دونوں گھٹنے سوج گئے تھے۔ اوپر سے بلڈ پریشر نیچے ہی نیچے، مجھ سے تو اپنا آپ سنبھالنا دوبھر ہو رہا تھا، شادی بیاہ میں خاک اٹینڈ کرتی۔ میں نے لاکھ کہا بھی کہ فاطمہ بی ہے میرے پاس تم لوگ جاؤ مگر وہ حرام خور مجھے اس کے دل کے چور کی کیا خبر، ہائے تائی امی! میں آپ کو اس حال میں چھوڑ کر چلی جاؤں، کبھی نہیں، میں تو آپ کے پاس رہوں گی۔ اگر چلی بھی گئی تو فنکشن کیسے اٹینڈ کر سکوں گی۔ مجھے تو آپ کا خیال ہی پریشان رکھے گا۔ تزئین جا رہی ہے میری جگہ، میں تو آپ کے پاس ہی رہوں گی۔ اس کی ایک ہی رٹ آخر ہار کر میں بھی مان گئی۔ میں نے جی میں سوچا، فاطمہ بی بوڑھی جان اور لکھنے پڑھنے سے بھی نابلد خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی ہو گئی تو جان سے جاؤں گی، بس اسی خود غرضی میں ماری گئی۔ اس منحوس نے اس کو فون کر کے باہر ہی بلوا لیا، اپنی گٹھڑی پوٹلی سب باندھ رکھی تھی۔ اس نے فاطمہ بی کو دوائیں لینے بھیجا۔ یہ بے چاری واپس آئی تو سب کچھ خاک ہو چکا تھا۔ اللہ کا شکر ہے اس گھر پہ رحم کر گئی، ادھر کوئی ڈاکا نہیں ڈلوا گئی۔ ورنہ ہم عزت کو روتے کہ مال کو۔" تائی امی غضب کی قصہ گو تھیں۔ سارے حاضرین بالکل خاموش ان کے داستان گوئی کے سحر میں جکڑے بیٹھے تھے۔

"اب بھلا میں اپنے سسرال میں کیا بتاؤں گی۔ کسی کو نہ بھی بتاؤں تو بھی کل رات کو راحیل نے تو آنا ہی ہے۔ انہیں تو پتا چلے گا ہی۔ یہ بد خاندان کی شرافت کو لگنا باقی تھا۔ ابھی تو ارتضیٰ کے قصے کی اڑتی دھول نہ بیٹھی تھی کہ یہ چوٹ......" پھپھو بھرائی آواز میں سسکنے لگی۔

"کیا کر سکتے ہیں بی بی! سینے پہ پتھر رکھ کر سب کو بتانا تو ہوتا ہے۔" تائی امی نے ٹھنڈا سانس لیا۔

"ہم نے تو خوف خدا کی وجہ سے ان کو بے سہارا جان کر اپنے گھر میں پناہ دی تھی، ایک نے بھاگ کر ہمارے ماتھے پہ جھومر سجا دیا، دوسری خدا جانے کل کو کیا گل کھلائے گی۔"

انہوں نے یقیناً کانوں کو ہاتھ لگائے ہوں گے۔ اسی لیے ایک لمحے کو رکیں، اس ہمراو میں تو ذرا بھی دید، لحاظ، مروت نہیں، ہم سب کو ہمیشہ ٹیڑھی آنکھ سے دیکھتی ہے جیسے ہم اس کے دشمن ہوں۔ اب کل سے دیکھ لو فاطمہ بی بی نرے سجا سجا کر اس عظیم ہستی کے کمرے میں پہنچا رہی ہے، ہم کیا آنکھوں سے اندھے ہیں سب نظر آتا ہے، منہ سے کچھ نہ کہیں الگ بات ہے۔ اور خدمتیں کل سے یوں کروا رہی ہے جیسے بس ڈپٹی کمشنر بھرتی ہوئی ہے۔ بس میں نے فیصلہ کر لیا ہے، آج سب معاملے طے ہوں گے۔" ان کی آواز اب خاصی بلند ہو چکی تھی، فاطمہ بی کی کوئی بھی کارگزاری ان کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکی تھی۔

"کیسے معاملات.......؟" پھپھو کچھ جھینپے پن سے بولیں۔

"اچھا بس پہلے کھانا کھا لیتے ہیں، اس کے بعد باتیں ہو جائیں گی۔ فاطمہ بی کھانا لگواؤ جا کر۔"

مرتضیٰ احمد کی مداخلت پر محفل برخاست کی، تھوڑی دیر بعد فضا میں پلیٹوں چمچوں اور کانٹوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔

فاطمہ بی کو کافی آرڈر دیا جا چکا تھا، اسے دکھ تھا پھپھو نے ایک پل کو بھی اس کی خبر لینے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ ورنہ تو ہمیشہ ان کی پہلی بات یا پہلی کال تزئین کے لیے ہوتی تھی۔ وہ جتنا ان سے جھجکتی شرماتی وہ اتنا ہی اسے اپنے ساتھ لپٹاتی جاتیں۔

اور ان کی میٹھی میٹھی باتیں تو اکثر اس کی تنہائیوں کو بھی محفل بنا دیتیں۔ پھپھو کے کراچی جانے کے بعد کئی کئی دن وہ ان باتوں کے سحر میں گرفتار رہا کرتی۔

اور سعد کے حوالے سے اس کے دل میں کبھی گدگدی نہیں ہوتی تھی۔ اس کے دل کے تار تو پھپھو کے حوالے سے چھڑ چھڑ جاتے تھے بلکہ سعد کی قربت تو اکثر اسے کوفت میں مبتلا کر دیتی تھی۔ وہ ہمیشہ اس سے بہت فرینک ہو کر بات کرتا اور وہ بہت ریزرو رہتی تھی۔ تزئین کے اتنے سخت رویے پر اکثر جھنجلا کر اس سے پوچھا۔

"تزئین! اس رشتے میں تمہاری رضامندی شامل ہے بھی یا نہیں۔"

"بالکل نہیں، زبردستی کا سودا ہے تمہاری نیاسی تو میں پتا نہیں ہوں یا نہیں، مگر پھپھو کی پسندیدہ بہو ضرور ہوں گی۔" اس کے بہت زچ ہونے پر وہ اکثر اسے یہ جواب دے کر

بھاگ جاتی تھی۔ تزئین بھی پھپھو کے والہانہ انداز پر بہت خوش اور مطمئن تھی۔

"تھینک گاڈ تزئین! یو آر لکی۔ پھپھو جیسی محبت کرنے والی ساس تو نصیب والوں کو ملتی ہے۔ میرا تو خیال ہے پھپھو کراچی میں بھی تمہارے ہی نام کی تسبیح ہاتھ میں لے کر صبح و شام تزئین تزئین کرتی ہوں گی۔" وہ اسے چھیڑتی۔

"رہنے دو تم یہ سب وقتی باتیں ہوتی ہیں، بننے دو انہیں میری ساس تو پھر دیکھنا۔"

"ارے پاگل ایسے نہیں کہتے اللہ سے دعا کرو ان کے ہمیشہ کے لیے اسی طرح رہنے کی۔ پتا نہیں کون سی ساعت قبولیت کی ہو۔" تزئین اسے سرزنش کرتی۔

"اور وہ وقت کتنی جلدی آ گیا یعنی میرے کراچی پہنچنے سے بھی پہلے۔" وہ خود ہی اندھیرے میں استہزائی انداز میں ہنسی، یوں وقت اپنے رنگ بہت جلد دکھا دیتا ہے۔ وقت کو تو بہت جلدی ہوتی ہے۔ گزر جانے کی اور ہم پچھلے وقتوں کا ہی واویلا کرتے رہ جاتے ہیں اور گزرتا وقت بھاگم بھاگ نئی نئی کہانیاں رقم کرتا جاتا ہے۔ وہ ایک گہرا سانس لے کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔ سارا دن گزر گیا۔ شفق اور عاشی میں سے بھی کسی نے جھانک کر بھی نہ دیکھا۔

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور کوئی اچانک دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔

"لاحول ولا قوۃ! یہاں تو بلیک آؤٹ چل رہا ہے۔ اے محترمہ! کون سے کونے کھدرے میں ہو۔ اوہو بھئی لائٹ کا بٹن کدھر ہے؟ یہ رہا۔" ساتھ ہی کمرے میں دودھیا روشنی پھیل گئی۔ سعد آنکھیں پھاڑے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"یہ بائی داوے تم۔ کیوں حجرہ نشین ہو کر بیٹھی ہو، ٹھیک ہے باہر تمہارا سسرال آیا بیٹھا ہے۔ اتنی شرم و حیا تو ہر مشرقی لڑکی کو کرنی چاہیے پر ایسی بھی کیا کہ تم ڈنر پر بھی ہمارا ساتھ نہ دو، یہ تو شرم نہ ہوئی الٹا ہماری توہین ہو گئی، ہم جو بھاگے بھاگے تمہارے درشن کو ادھر آتے ہیں، کچھ تو احساس ہونا چاہیے۔" وہ حسب عادت بلا تکان بولے گیا۔ وہ ہمیشہ ہی اس کی چپ یا بیزاری کو بھانپے بغیر بولے چلا جاتا تھا بغیر اس کے جواب کی ضرورت محسوس کیے۔ آج بھی وہ اسی طرح بولتے ہوئے کمرے کا اور اس کا ناقدانہ نظروں سے ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے جائزہ لے رہا تھا۔

"اے لڑکی، کمرے میں بھی کس قدر گند مچایا ہوا ہے، سسرال والوں سے تو شرم کرتا

یاد رہ گیا یہ نہ یاد رہا کہ ان کے استقبال کے لیے یا ان سے ملنے کے لیے کم از کم مشرقی لڑکیوں کو منہ ہاتھ دھو لینا چاہیے۔ یا کم از کم کنگھی چوٹی از سرِ نو کر کے کوئی ڈھنگ کا لباس پہن لینا چاہیے، یہ نہ ہو کہ وہ آپ کو دیکھتے ہی پاؤں سر پر رکھ کر بھاگیں۔ وہ دونوں ہاتھ کمر پر ٹکائے اسے کھڑا گھور رہا تھا۔

''پلیز لیو می الون......'' وہ آہستگی سے بولی اور اس کے گھورنے سے بچنے کے لیے رخ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔

''ارے بی بی! شام سے تو تمہیں ہم نے ''الون'' ہی چھوڑا ہوا ہے۔ اب ہماری بھی تو مجبوری سمجھو نا کہ تمہاری یہ سڑی صورت دیکھے بغیر رہ نہیں سکتے، دو گھنٹے انتظار کیا کہ شاید تمہیں خود ہی خیال آ جائے، مجبوراً تمہاری ڈھٹائی دیکھ کو خود ہی آنا پڑا اور اب فرما رہی ہو لیو می الون۔'' آخر میں اس نے بڑی زبردست اس کی نقل اتاری تھی۔ ترئین کے ہونٹوں پر معدوم سی مسکراہٹ ابھر کر غائب ہو گئی۔

''اچھا تم نے کھانا کیوں نہیں کھایا؟'' وہ گھوم کر اس کے سامنے آ گیا۔

''بھوک نہیں تھی مجھے؟'' وہ رکھائی سے بولی۔

''یس...... اسی جواب کی توقع تھی مجھے تم سے۔ بائی داوے یہ ڈائیلاگ تم ہر بار میرے سامنے دہراتے تھکتیں نہیں۔ کبھی تم نے میرے ساتھ کھانا کھانے کی زحمت نہیں کی، جب بھی میں لاہور تمہارے فراق وہ کیا کہتے ہیں ہجر وغیرہ سے گھبرا کر آتا ہوں کہ چلو میرے بھوکے پیٹ کے ساتھ آنکھوں کو بھی تمہاری صورت دیکھ کر سیری ہو جائے گی، مگر ہر بار مجھے منہ کھانا پڑی۔''

''سعد! تم کس قدر احمقانہ باتیں کرتے ہو۔'' وہ جھنجلا کر بولی۔

''اچھا تو مطلب کم احمقانہ باتیں کیا کروں، ہاں مجھے خود بھی خیال نہیں رہا کہ تمہیں تو مجھ سے بہت رومانٹک باتوں کی توقع ہوتی ہو گی اور میں ادھر ادھر کی ہانکتا رہتا ہوں۔'' وہ بڑے مزے سے بیڈ کے سرہانے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

''آپ ادھر سے جا رہے ہیں یا میں جاؤں۔'' وہ اسے دھمکا کر بولی۔

''مجبوری ہے۔''

''مگر میرے ساتھ ایسی کوئی مجبوری نہیں، میں جا رہی ہوں۔''

''ارے ہاں مجھے یاد آیا۔ میں ادھر تمہارے حجرہ خاص میں ان فضول باتوں کے لیے نہیں آیا تھا۔ تم پاس ہو گئیں انٹر میں ہے نا۔''

وہ بڑی معصومیت سے اس کی شکل دیکھ کر بولا بیڈ کے بیچوں بیچ چوکڑی مارے وہ بہت بے تکلفی سے اس سے مخاطب تھا۔

''ہو گئی پھر......!'' وہ پچھاڑ کھانے والے لہجے میں بولی۔

''میں نے تو سوچا تھا فیل ہو جاؤ گی تو بہت سوں کا بھلا ہو جائے گا، میرا گفٹ بھی بچ جائے گا اور جان کی بھی خلاصی ہو جائے گی، تم گریجویشن جب تک نہیں کر لیتیں امی تو تمہیں بیاہ کر نہیں لے جائیں گی تم ایک دو سال اور انٹر میں اٹکی رہتیں تو کیا تھا؟'' وہ افسوس بھرے لہجے میں بولا اور ترئین کے منہ سے کوئی بھی سخت جملہ نکلتے نکلتے رہ گیا کیونکہ کسی بھی سخت جملے کا اس چکنے گھڑے پر اثر تو ہونا نہیں تھا۔

''او کے چلو مبارک ہو۔ میں تمہارے لیے گفٹ لے کر آیا ہوں۔ ارادہ تھا کہ ایک رومانٹک سی ملاقات میں ڈنر کے دوران دوں گا مگر تبین نے ساری گڑبڑ کر دی۔ سارا چکر ممانی کا اپنا چلایا ہوا لگتا ہے، پھر بھی تبین کو اس قدر بیوقوفی نہیں کرنی چاہیے تھی۔'' وہ یوں کہہ رہا تھا جیسے تبین نے سخت سردی میں بارش میں نہانے کی غلطی کر لی ہو۔

''بہر حال گفٹ تو اب دینا ہی ہے، آخر پیسے خرچ کیے ہیں۔''

''تو پھر اس گفٹ کو کسی گٹر میں ڈال دیں جا کر، مجھے نہیں ضرورت۔'' وہ چڑ کر بولی۔

''ہائے ایسے نہیں کہتے، میرا رزق حلال کی پاکٹ منی سے خریدا گیا ہے اور جس محبت سے لایا ہوں، کسی اور کو آفر کرتا تو وہ خوشی سے پاگل ہی ہو جاتی۔''

''ظاہر ہے آپ کی کمپنی میں دو چار منٹ گزارنے کے بعد بھی کوئی صحیح الدماغ رہ سکتا ہو، تو اس کے اعصاب کو ایوارڈ دینا چاہیے۔'' وہ طنز سے بولی۔

''نہیں بھئی، ایوارڈ وغیرہ تو میں نہیں دے سکتا۔ اتنا مالدار نہیں ہوں میں بھی، ابھی بس چھوٹا سا نذرانہ دل ہے، اگر اسی کو گولڈ میڈل سمجھ لو تو عنایت ہو گی، باقی ایوارڈ اور تحفے

وغیرہ شادی کے بعد بچوں کی صورت میں تمہیں ملتے رہیں گے ہر سال پھر ان کا : تا بے شک سارے جہاں میں پیٹنا۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔

"یا اللہ میں کدھر جاؤں۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا تو سعد خواہ مخواہ ہنسنے لگا۔

"سعد! سعد کہاں ہو تم؟" پھپھو کی تیز آواز پر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"اوکے کزن! اگنٹ پلس ڈنر کے ساتھ کوئی پروگرام سوچو، میں صبح آؤں گا پھر تفصیلی بات کریں گے۔ ابھی تو ظالم سماج بیچ میں آرہا ہے، بائے۔" وہ منٹوں میں غائب ہو گیا۔ پھپھو کی ایک للکار سے اس کی جان نکلتی تھی۔

"تو یہ تھا تمہارا ٹوٹل رومانس، مسز سعد راحیل۔" اس کے ہونٹوں سے نکلا۔

"جب وقت بدلتا ہے، تو سائے کا رخ جاتا ہے، دیکھنا ابھی کے ابھی چند ہی دنوں میں تمہارا رخ کیسے بدلتا ہے۔" وہ جا کر بیڈ پر اسی جگہ بیٹھ گئی جہاں ابھی چند لمحے پہلے وہ بڑے استحقاق سے بیٹھا تھا۔

فاطمہ بی اس کے لیے ٹرے اٹھائے چلی آرہی تھیں۔

"پکڑ لیں بی بی! جلدی سے! بڑی بیگم دو آنکھیں اپنے سر کے پیچھے بھی لگائے پھرتی ہیں۔ ان کے آگے کیا ہو رہا ہے۔ ان کے پیچھے کیا ہو رہا ہے، وہ کسی بھی بات سے انجان نہیں۔" فاطمہ بی بڑبڑاتے ہوئے ٹرے اسے تھما کر باہر نکل گئیں۔

اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ چت لیٹی پریشان خیالوں میں سرا پکڑنے میں مگن تھی جب عاشو نے دروازہ میں سے سر نکال کر اندر جھانکا۔ زیرو پاور کے بلب کی روشنی میں تزئین کو عاشو کا چہرہ بھی بھیانک ہی نظر آرہا تھا۔ اور سچ تو یہ تھا کہ آج اسے سیدھے منظر بھی الٹے نظر آرہے تھے۔

"تمہیں پاپا بلا رہے ہیں اپنے کمرے میں، جا کر سن لو ان کی بات۔" خاصے لہجے میں کہہ کر زور سے دروازہ بند کرتی چلی گئی۔

"دیکھ لو عاشو تم بھی غصہ تم کیوں پیچھے رہو۔ وقت کی چال ہے سو سب چلو۔"

وہ جیسے گنگناتی ہوئی بیڈ سے اٹھی، کسی معمول کی طرح اٹھ کر اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے آگے کھڑے ہو کر بالوں میں ہلکا سا برش پھیرا دوپٹہ سر پر اوڑھا اور باہر نکل آئی۔ لاؤنج میں کوئی بھی نہیں تھا۔ کچن سے برتنوں کی کھڑ بڑ کی آوازیں آرہی تھیں۔ فاطمہ بی رضیہ کے ساتھ کچن کے کاموں میں لگی تھیں ورنہ پرسوں رات سے پہلے اس وقت کی ڈیوٹی تزئین کی ہوتی تھی۔

وہ گہرا سانس لے کر تایا ابو کے کمرے کی طرف بڑھی، عاشو اور شفق کے کمرے کی لائٹ آن تھی۔ شبیر بھائی کے کمرے کی روشنی بجھ چکی تھی۔

"پتا نہیں تایا ابو کو اب مجھ سے کیا کہنا ہے۔ اور پھپھو کدھر ہیں؟" پریشانیوں میں الجھتی وہ تایا ابو کے کمرے کے باہر کھڑی تھی، ادھ کھلے دروازے سے آوازیں صاف باہر تک سنائی دے رہی تھیں۔

"توبہ کریں بھائی جان توبہ، میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ مجھے جگ ہنسائی نہیں کروانی اور سارے زمانے کا سامنا کرنے کی ہمت تو مجھ میں نہیں اور راحیل کا تو آپ کو پتا ہے، وہ پہلے ہی میرے اس جذباتی فیصلے پر خاصے ناخوش تھے۔ اب تو وہ کسی صورت نہیں مانیں گے۔ اور مجھے اپنے گھر کے سکون اور شوہر کی خوشی سے بڑھ کر کچھ بھی عزیز نہیں، میری طرف سے صاف جواب ہے اور یہ کوئی چوری ڈاکا نہیں کہ میں چند گھنٹوں میں نکاح کر کے لے جاؤں۔ بھرا پڑا سسرال ہے میرا۔ آپ تزئین کا کہیں بھی دیکھ کر شادی کر سکتے ہیں۔ میں معذرت چاہتی ہوں۔"

پھپھو کی تیز آواز اسے مد و جزر کے ساتھ سنائی دے رہی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ اور جسم میں ہلکی ہلکی لرزش پیدا ہونے لگی تھی۔

"ثمینہ! دیکھو یہ بڑا نازک وقت ہے اور ہم سب کو ہی مل کر۔" مرتضیٰ احمد نے دھیمی آواز میں انہیں وقت کی نزاکت کا احساس دلانا چاہا۔

"پلیز بھائی جان! بس اب میں نہ کچھ اور سنوں گی، نہ کہوں گی۔ جو کہا ہے اس کو مانا جائے۔ میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ یہاں تک ان لڑکیوں کی ماں کا حسب نسب بھی نہیں دیکھا جو رات کی تاریکیوں میں میرے معصوم بھائی کی زندگی میں کسی بلا کی طرح داخل ہوئی اور ان کی خوشیوں کو ہڑپ کر گئی۔ صرف بھائی کی خوشی کی خاطر، اس کا بوجھ بٹانے کی خاطر راحیل

سے مشورہ کیے بغیر یہ قدم اٹھایا تھا۔ کس لیے؟ اپنے گھر کی عزت کو میں محفوظ نہیں کروں گی تو اور کون کرے گا۔ جب انہوں نے اس عزت کی حفاظت نہیں کی تو پھر کیا رہ جاتا ہے۔ آپ کو وہ اگر اب بھی عزیز ہے تو بھلے جہاں آپ کا دل مانتا ہے، کر ڈالیں۔'' پھپھو سفاکی کی حد تک ظالم ہو رہی تھیں۔ انہیں کچھ بھی تو یاد نہیں تھا۔ اس کا ٹھنڈا اظہار چہرہ آنسوؤں میں بھیگنے لگا۔

''اے بی! ہم نے کیا گناہ کیا ہے، کیا جرم ہے ہمارا جو ہم سزا کاٹتے جائیں؟''

تائی امی بھی کمرے میں موجود تھیں، پھپھو سے زیادہ چمک کر بولیں۔

وہ دیدہ دلیر لڑکی میری بچیوں کے بھی نصیب خراب کر گئی۔ اب کون اس در پر آئے گا سوالی بن کر۔ اے بی! میری تو سمجھو جیتے جی موت ہو گئی۔ میں جوان بچیوں کی ماں ہوں۔ تم تو ہاتھ جھاڑ کر فارغ ہو گئیں۔ بیٹے کی ماں تھیں رشتہ توڑ کر گلو خلاصی کرالی، ہم کیا کریں گے، ہمیں بھی تو کوئی بتائے۔'' تائی امی اب باقاعدہ چیخ رہی تھیں ان کے غصے کا عالم دیکھ کر باہر کھڑی ترزئین کا جسم اب باقاعدہ کانپنے لگا۔ دل چاہ رہا تھا ادھر سے بھاگ جائے مگر قدموں سے جیسے جان ہی نکل گئی تھی۔

''اچھا آرام سے بات کرو۔'' تایا ابو کی دھیمی مگر کمزور آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

''ابھی بھی میں ہی آرام سے بات کروں، سنو جی! میری بات غور سے سنو۔'' تائی امی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کر ڈالیں۔ ''میں اب اس کلموہی کو اس گھر میں ایک دن کیا ایک پل کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ اس بات کا فیصلہ ابھی ہو گا، اسی وقت ہو گا اسے اس گھر سے دفعان کرو، اگر ثمینہ بی بی نہیں لے جا سکتیں۔'' تائی امی کے لہجے میں نہ دھونس تھی نہ دھمکی سیدھا سیدھا فیصلہ تھا۔

''طاہرہ! اتنی انتہا پر نہ جاؤ میں اس جوان لڑکی کو کہاں دھتکاروں خود سوچو۔''

''کیا سوچوں؟ میں ہی کیوں سوچوں۔ دارالامان یتیم خانے میں جمع کروا دو۔ ورنہ وہ خود عاقل بالغ ہے، اشارہ کرو، خود ہی کہیں رخ کرنے کو تیار ہو جائے گی۔''

دوسرے ہی لمحے سے دروازہ کھلا اور تائی امی کسی خون آشام چڑیل کی طرح اس کے سامنے کھڑی تھیں۔

''اس طرح بھیگی بلی بن کر چوروں کی طرح جو ساری باتیں سن رہی ہو سامنے آؤ اور بات سنو۔'' انہوں نے اس بے دردی سے اس کا بازو اپنی طرف پکڑ کر کھینچا اسے لگا اس کا ہاتھ یقیناً کلائی سے اتر چکا ہو گا۔ کمرے کے وسط میں دھکیل کر انہوں نے ایک جھٹکے سے چھوڑ دیا وہ گرتے گرتے بچی۔ اب وہ کسی مجسمے کی طرح کمرے کے وسط میں ان تینوں کے درمیان سر جھکائے کھڑی تھی۔

''اب آپ بات کریں گے کہ میں بات کروں۔'' تائی چیخ کر بولیں۔

''تم ہی کر لو بات۔'' تایا ابو نے جیسے ہتھیار ڈال دیے۔ ثمینہ پھپھو مکمل طور پر بے نیاز بیٹھی تھیں۔

''سنو بی بی ترزئین! اب ایسا ہے کہ جو کچھ ہوا ہے تمہارے سامنے ہوا ہے۔'' تائی امی نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ اور اسے باقاعدہ کندھے سے پکڑ کر اپنی طرف گھمایا۔ ''نہ اس میں کوئی جھوٹ ہے نہ ڈرامہ تمہاری بہن نے جو کچھ ہمارے ساتھ کیا اس کے بعد ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ ہاں رہ گیا اب تمہارا معاملہ تو اس میں ہماری طرف سے صاف جواب ہے۔ تم اپنا کہیں ٹھکانہ، بندوبست کر لو، آج رات گزارہ کر لو لیکن کل مجھے اس گھر میں مت دکھائی دینا۔

وہ حیرت سے آنکھیں کھول کر ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔

''نہ تو میں نے فارسی بولی ہے نہ جرمن! اس لیے بچہ تو تم سارا کچھ گئی ہو، بہتر ہے اپنے کمرے میں جا کر آج رات خوب غور کر لو، کوئی ٹھکانہ سوچو اور کل صبح ادھر سے اپنا بوریا بستر گول کرو۔ ہم سب سے یہی کہہ دیں گے کہ دونوں بہنیں کہیں الگ جا بسیں ہمارے ساتھ رہنا انہیں پسند نہیں تھا۔ بات ختم۔'' تائی امی نے منٹوں میں بات ختم کر دی۔

''مم...... مگر تائی امی...... تائی امی! مم...... میں...... مم......'' اس کے حلق میں آوازیں اٹک رہی تھیں۔ بس ٹوٹ ٹوٹ کر دو تین ٹوٹے پھوٹے حرف نکلے تھے۔ اور پھر جیسے اس کی ہمت تمام ہو گئی تھی۔ وہ بس نگاہوں میں رحم کی امید لیے تائی امی کے چہرے کو تکتی رہی۔

''یہ میں، میں میرے سامنے مت کرو، نہ تو تم اس قدر معصوم ہو نہ وہ تمہاری نامراد

بن جو منہ کالا کر گئی، بس جو کہہ دیا ہے مجھے اس پر عمل چاہیے۔ اب جاؤ ادھر سے۔" وہ بے رحمی کی انتہا پر کھڑی تھیں۔

"میں کہاں جاؤں؟ تائی امی! کدھر" اس نے پوری طاقت مجتمع کر کے سوال کیا۔

"بھاڑ میں جاؤ، دوزخ میں یا کسی برزخ میں۔ ہمارا پیچھا چھوڑ دو تمہاری مہربانی۔"

تائی امی نے زور سے تالی بجا کر دونوں ہاتھ اس کے آگے جوڑے۔

"میں نہیں جاؤں گی کہیں بھی۔ میں کہاں جا سکتی ہوں بھلا۔" وہ کچھ اڑیل پن سے بولی۔

"زبان چلاتی ہے بدبخت" وہ طیش میں آ گئیں۔

"تایا ابو پلیز! آپ تائی امی سے بات کریں م...... میں کہاں جاؤں گی۔ بھلا میرا کون سا ٹھکانہ ہے۔" اسے ایک دم سے خیال آیا تو وہ خاموش بیٹھے تایا ابو کی طرف مڑی انہوں نے ایک لاتعلق سی نگاہ اس پر ڈالی اور منہ پھیلا لیا۔ اس کا دل جیسے دولخت ہو گیا۔

"ت...... تایا ابو پلیز۔" وہ ہمت کر کے ایک بار پھر بولی۔

"نہیں، میں نہیں جاؤں گی، کہیں بھی۔ میرا اور کون ہے؟ سین چلی گئی تو میرا کیا قصور ہے۔ میں نے تو کچھ نہیں کیا۔ پلیز تایا ابو۔" تائی امی اسے بازو سے باہر دھکیل رہی تھیں۔ وہ دروازے کا ہینڈل مضبوطی سے تھامے کھڑی تھی۔ اس کی آواز حلق سے پھٹ کر نکل رہی تھی۔

"میں کہہ رہی ہوں چلی جا ادھر سے۔ وہ چلی گئی۔ ایک دن تو بھی چلی جائے گی۔ تیرا خون اس سے جدا تو نہیں۔" تائی امی نے دوہتڑ اس کی کمر پر مارے۔

"تایا ابو پلیز میں کچھ نہیں کروں گی، کبھی بھی، مجھے اپنے مرے ہوئے ماں باپ کی قسم۔ میں کہاں جاؤں گی تایا ابو پلیز مجھے یہاں رکھ لیں۔ تایا ابو پلیز۔" وہ پتھر بنے بیٹھے مرتضیٰ کے قدموں سے لپٹ گئی۔

وہ ان کے قدموں پر سر رکھے زارو قطار روئے جا رہی تھی کہ پتھر کا سینہ بھی شق ہو جائے۔ ثمینہ پھپھو بے چینی سے کرسی پر پہلو بدلنے لگیں تائی امی کا غصے سے برا حال تھا، انہیں بس اسی نازک لمحے کا ڈر تھا۔

"اچھا اٹھو تم جاؤ اپنے کمرے میں، تمہیں کوئی ادھر سے جانے کا نہیں کہے گا۔" تایا ابو نے کچھ بیزاری سے اسے کندھوں سے پکڑ کر اٹھانا چاہا۔

"آگ لگا دوں گی میں اس گھر کو، خود پر پٹرول چھڑک لوں گی۔ شفیق کے پاپا! اگر یہ اس گھر میں رہی تو میں اپنے بچوں سمیت زہر کھا کر سو رہوں گی، اس کو ابھی ادھر سے چلتا کرو۔ نہیں تو نہیں تو......" تائی امی کے سر پر جیسے جنون سوار ہو گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے آپ کو پیٹنے لگیں۔ ان کی چیخیں جیسے سارے گھر کو دہلانے لگیں۔

"طاہرہ! طاہرہ ہوش کرو، کیا کر رہی ہو؟" تایا ابو اپنی بیوی کی طرف لپکے۔

"بھابی...... بھابی ہوش کریں، کچھ نہیں ہو گا آپ کی مرضی کے خلاف اسے بھیج دیں بھائی جان! کسی دارالامان میں، اپنے گھر کا سکون برباد نہ کریں۔ جاؤ تم ادھر سے بھابی جان...... بھابی جان ہوش کریں۔"

ثمینہ پھپھو نے درخت کے تنے کی طرح ڈولتی بھابی کو سنبھالے لگیں۔

وہ لرزتے قدموں کے ساتھ کمرے سے نکل آئی۔ کمرے کے دروازے کے ساتھ ہی سعد کھڑا بے قراری سے اس کی طرف بڑھا مگر تزئین کی نظروں میں اس کے لیے جیسے کوئی شناسائی نہ تھی۔ وہ شکست خوردہ سے قدم گن گن کر اٹھاتی اپنے کمرے کی طرف بڑھی اور کمرے میں داخل ہو کر اس نے دروازہ بند کر کے لاک لگا لیا۔ سعد بند دروازے کے دوسری طرف کھڑا رہ گیا۔



"بڑی ممانی خواہ کچھ کر لیں، تمہیں ادھر سے کوئی نہیں نکال سکتا۔ یہ گھر جتنا ان کا ہے، اتنا ہی تمہارا بھی ہے۔ تم کیوں فکر کرتی ہو۔" وہ پچھلے باغیچے کی سیڑھیوں کے آخری قدم پر اپنے گھٹنوں پر سر جھکائے بیٹھی گھاس نوچ نوچ کر پھینکے جا رہی تھی۔ جب سعد پیچھے سے آ کر پاس آ بیٹھا۔ چند منٹ خاموش بیٹھا اس کو دیکھتا رہا پھر بول اٹھا۔ اس کی بات پر تزئین نے کوئی توجہ نہیں دی۔ اسی طرح گھاس نوچتی رہی۔

"تمہیں معلوم ہے، قبضہ سچا دعوا جھوٹا اور میرا نہ تو ادھر قبضہ ہے، نہ دعوا۔ میں تو ان

گھاس کے تنکوں سے بھی بدتر اور ہلکی ہوں۔ جو چاہے گا مجھے نوچ کر پھینک دے گا۔" کافی دیر بعد وہ آہستگی سے بولی تھی۔

"دوسرے طاقت ور نہیں ہوتے۔ ہماری کمزوری ان کو طاقت دیتی ہے۔ تم اسی طرح کمزوری دکھاتی رہو گی تو یقیناً آج شام سے ہی پہلے گھر سے باہر بیٹھی ہو گی۔" سعد نے سامنے آسمان پر اڑتے پرندوں کو دیکھ کر کہا۔

اس نے اپنے سیاہ چمکیلے بالوں والا سر اٹھا کر ویران آنکھوں سے سعد کو دیکھا۔

"ایسے مت دیکھو مجھے، اتنی اداس نگاہوں سے کہ میں ......" وہ جیسے چڑ کر بولا۔

"تمہیں کیا فرق پڑتا ہے یا کسی کو بھی کیا فرق پڑتا ہے۔" اس نے پھر سر جھکا لیا۔

"تزئین! اتنی مایوس ہو، میں ابھی ہوں۔ کیا میری موجودگی کا خیال تمہیں سہارا نہیں دیتا۔" وہ بہت نرمی سے بولا۔

"تم ......" وہ زخمی لہجے میں مسکرائی۔ "تمہیں معلوم ہے نا پھپھو نے رات کو یہ کمزور سا رشتہ بھی ختم کر دیا ہے۔ اب تم میرے لیے ایسے ہی ہو جسے پھپھو، تایا ابو، تائی امی یا اس گھر کا کوئی بھی فرد۔"

"میں سعد ہوں، سعد راحیل۔ میں کوئی فرد نہیں ہوں، میں خاص تمہارے لیے ہوں اور تم خاص میرے لیے۔ زندگی لبوں تک آ کر دم توڑنے لگے تو بھی یہ خصوصیت کم نہ ہو گی۔ کوئی بھی اس محبت کو کم نہیں کر سکتا، جو مجھے تم سے ہے۔" وہ بہت آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔

تزئین نے ایک طنز بھری خاموش نظر سے اس کے پر یقین چہرے پر ڈالی اور سر جھکا لیا۔

"تزئین! تمہیں میرا یقین نہیں کیا؟"

"کس بات کا یقین، اب کیا رہ گیا ہے۔ مجھے اپنا بھی یقین نہیں رہا۔ میری تمام تر سچائی دوسروں کے اعمال کی محتاج ہو کر رہ گئی ہے۔ میری زندگی کا ہر عمل تین کے ایک فعل کے ساتھ مشروط کر دیا گیا ہے۔"

"احمق ہیں یہ لوگ؟ اور میں جانتا ہوں، تم تزئین! جسے میرے دل نے پہلے لمحے سے اپنا بنا رکھا ہے اور تمہارے کردار پر پڑنے والی کوئی بھی چھینٹ خواہ وہ میرے بہت اپنے ہی کیوں نہ ڈالیں، مجھے اس کا یقین نہیں۔ مجھے تمہارے اندر کی خالص لڑکی پر مان ہے۔ جسے میں خود سے زیادہ جانتا ہوں اور جو میری ہے۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"اور جو یہ اندر کی خالص لڑکی ناخالص ہو جائے تو ......" وہ اس کی چمکتی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔

"ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔" وہ یقین سے بولا۔

"جو ہو جائے تو؟" وہ اسی پرزور لہجے میں بولی۔

"ایسا نہیں ہو سکتا تزئین! میرے دل کی کسوٹی نے تمہیں پرکھا ہے، اب دنیا کی کوئی بھی طاقت تمہارا مقام میری نظروں سے گرا نہیں سکتی۔ بلیومی تزئین! اس کے اعتماد بھرے لہجے پر وہ چپ ہو گئی۔

"میں شاید آج رات کو واپس چلا جاؤں، میری ایجوکیشن مکمل ہونے میں ابھی ڈھائی سال ہیں۔ یہ ڈھائی سال تمہیں بڑی ہمت اور حوصلے سے کاٹنے ہوں گے۔ جب حالات تھوڑے نارمل ہو جائیں تو ......"

"اگر نارمل نہ ہوئے تو ......؟"

"تو بھی مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرے اندر اتنی طاقت ہے کہ میں تمہارے لیے حالات کو بہترین بنا سکتا ہوں۔ تم جب مجھے آواز دو گی، مجھے اپنے پاس کھڑا پاؤ گی۔"

"لگتا ہے آج کل فلمیں بہت دیکھنے لگے ہو۔" اس کا دل سعد کی باتوں سے بہل گیا تھا۔

"نہیں آج کل تو مجھے سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں، میرے تعلیمی کیریئر کے سب سے اہم سال ہیں یہ۔ ویسے میں نے ماموں جان سے بات کر لی ہے، وہ تمہیں اس طرح تو کبھی بھی اس گھر سے نکال نہیں سکتے۔ اصل میں، میں نے ان سے جس طرح بات کی ہے، سمجھو وہ ان کا ویک پوائنٹ تھا۔ اب وہ اگر ممانی کی محبت کے جوش میں ایسا کچھ کرنے بھی لگیں تو سوچیں گے ضرور کیونکہ وہ بہر حال ایسا کرنے کے مجاز ہرگز نہیں۔" وہ بہت سوچ سوچ کر بول رہا تھا۔

"کیا مطلب؟" وہ حیرت سے بولی۔

"مطلب کو چھوڑو، تمہارے تھرڈ ایئر میں ایڈمیشن کب شروع ہو رہے ہیں۔" وہ

موضوع بدل کر بولا۔

''اگلے ہفتے سے۔'' وہ بے دلی سے بولی۔

''اور کلاسز۔''

''اگلے ماہ سے ایڈمیشن کے بعد کچھ ٹائم تو لگتا ہے۔''

''تو کمیں! اب ایسا ہے کہ گھر کا ماحول ابھی فی الحال تمہارے حق میں سازگار نہیں۔ ممانی خواہ مخواہ تم سے دشمنی پر تلی بیٹھی ہیں، اس لیے تم ادھر رہو گی تو خواہ مخواہ ان کی باتوں سے اپنا دل اور ذہن متاثر کرلو گی جبکہ تمہیں اب اپنا ذہن صرف اپنی اسٹڈیز کی طرف لگانا چاہیے۔ اس واقعہ کے اثر سے نکلنے کا واحد راستہ یہی ہے علم کے سمندر میں ڈوب جاؤ پھر دیکھنا تم کیسی نکھر کر نکلو گی کہ کوئی تم پر میلی نظر ڈالنے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔'' وہ پتا نہیں اسے کیا سمجھا رہا تھا۔

''اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تم فی الحال ہاسٹل میں رہو، میں نے ماموں جان سے یہی بات کی ہے۔ اتنے عرصہ میں ممانی کا غصہ بھی ٹھنڈا ہو جائے گا اور تمہاری پڑھائی بھی متاثر نہ ہوگی۔ کیا خیال ہے۔''

''تو یہ بات ہے۔'' وہ سر ہلا کر بولی۔

''کیا اس میں کوئی برائی ہے؟''

''بظاہر نہیں مگر ہو تو وہی رہا ہے جو تائی امی نے چاہا۔'' وہ دکھی لہجے میں بولی۔

''ان کی عمر میں جب بندہ ضد پر اتر آئے تو مقابل کو سامنے سے ہٹ جانا چاہیے۔ کہ ادھیڑ عمری کی ضد بڑی ہٹیلی ہوتی ہے۔ انہیں ضد ہو گئی ہے تم سے اور میں نہیں جانتا کہ ٹین کے ساتھ کیا ہوا، جبکہ میرے خیال میں وہ قطعاً ایسی لڑکی نہ تھی۔'' ٹین کے ذکر پر اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

''مجھ سے کوئی نہیں پوچھتا، وہ میری بہن تھی، مجھ سے زیادہ اسے کوئی نہیں جان سکتا۔ وہ بہت اچھی تھی، بہت معصوم۔ ایسا قدم اٹھا ہی نہیں سکتی تھی پھر نہ جانے کیا ہوا، وہ کہاں چلی گئی کسی کو اس کا پتا کرنے سے دلچسپی نہیں۔'' وہ رونے لگی۔

''اس کا افسوس تو ہے مگر ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اسے اور کچھ نہیں تو کم از کم تم سے

رابطہ کرنا چاہیے تھا۔'' وہ چپ رہی۔ یہی آس تو اسے بھی تھی۔ کہ وہ اسے فون ضرور کرے گی۔

''اچھا اب تم حوصلہ کرو اور جیسے ہی ایڈمیشن اسٹارٹ ہوتا ہے، تم ہاسٹل کے لیے بھی اپلائی کر دینا۔ میں ماموں جان کو پھر تاکید کر جاؤں گا اور جتنے دن ادھر ہو، میری تم سے درخواست ہے کہ تم ممانی جان کا سامنا نہ ہی کرو تو اچھا ہے۔''

''سعد...... ! سعد! کدھر غائب ہو جاتے ہو تم۔ چلو تمہارے پاپا آ چکے ہیں۔''

پھپھو تیزی سے ادھر ہی آ رہی تھیں۔

''او کے مائی سویٹ کزن، وش یو گڈ لک۔ میں تم سے کانٹیکٹ رکھنے کی کوشش کروں گا۔ بائے ہمت نہیں ہارنا۔'' کہتے ہوئے وہ چند سیکنڈ میں ادھر سے بھاگ گیا۔

اور وہ گھٹنوں پر سر رکھ کر پھر سے گھاس نوچنے لگی۔



''تمہارے داخلے کے ساتھ ہی تمہارا ہاسٹل میں بھی داخلہ ہو گیا ہے۔ اگرچہ میں نے کبھی اس طرح نہ سوچا تھا کہ تم دونوں...... '' انہوں نے جیسے اپنی زبان دانتوں تلے دبائی۔ ''اس طرح رخصت ہو گی۔ بہرحال ابھی میں مجبور ہوں اور تم مجھے مجبور سمجھو، خود غرض یا بے حس۔ تمہاری تائی امی کا فیصلہ بھی درست ہے۔ جو رشتہ شفق اور عاشی کے لیے آئے گا وہ ضرور ٹین کے بارے میں پوچھے گا۔''

وہ تھکے تھکے لہجے میں بولے۔

''تم ویک اینڈ بھی وہیں گزارو گی۔ میں تمہیں گھر تک لانے یا بلوانے سے قاصر ہوں۔ چھٹیاں تو اب ظاہر ہے فورتھ ایئر ہی میں ہوں گی۔ تھرڈ ایئر کے تو یہی چھ سات ماہ ہوں گے۔ گرمیوں تک شاید کوئی راہ نکل آئے اور اگر۔''

وہ رکے، اس کی شکل دیکھی۔

''تم خود کوئی راہ نکالنا چاہو تو ذرا میرا خیال نہ کرنا۔ اپنے فیصلے کو، اپنے رستے کو درست سمجھنا تو بنا میری اجازت کے بے شک چل پڑنا، جیسے اس نے کیا۔ میں ہر قسم کی بازپرس کے حق سے دستبردار ہوتا ہوں۔ تمہارے اخراجات کے لیے ہاسٹل اور کالج کے آئندہ تین ماہ کے ایڈوانس جمع کرا دیے ہیں، اس کے بعد کے لیے مجھے فون کر دینا۔ میں جمع کروا دوں گا

تمہیں خود۔۔۔ آنے کی ضرورت نہیں اور باقی اخراجات کے لیے کچھ رقم ہے اس لفافے میں۔'' انہوں نے خاکی لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔

''اور ضرورت پڑے تو میرے آفس فون کر دینا، میں بھجوا دوں گا۔ تمہیں صبح جانا ہے چونکہ اب دوبارہ تم اپنی تائی امی کی اجازت سے آ سکو گی تو بہتر ہے اپنے لیے ضرورت کا سامان اور کپڑے جو بھی چاہیے ہوں، ایک ہی دفعہ رکھ لینا۔ اب تم جاؤ۔'' انہوں نے کہہ کر رخ موڑ لیا۔

''اور ہاں، وہ میرے لیے مر چکی ہے۔ اگر کبھی زندہ ہو کر ملی تو میں اس کی شکل دیکھنا پسند نہیں کروں گا۔ ہاں تم اگر ملنا چاہو تو سو بار ملنا، میری پرواہ مت کرنا۔'' ان کی بات واضح تھی۔ سیین کا نام لیے بغیر بھی۔

''تایا ابو! میں جانتی ہوں آپ اس وقت مجھ سے حد سے زیادہ ناراض اور بدگمان ہیں اور میرا اس وقت کچھ بھی کہنا آپ کو جھوٹا دعواہی لگے گا۔ وہ اگر آپ کے لیے مر چکی ہے تو میرے لیے بھی مر چکی ہے۔ میں اس کے لیے کوئی قسم نہیں کھاؤں گی مگر اس کی شکل دیکھ کر بھی نہیں دیکھوں گی۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔ میرا نام آپ کی عزت میں اضافے کا نہ سہی تو کمی کا باعث بھی نہیں ہو گا۔ ہمیشہ میں اس بات کا خیال رکھوں گی، اگر میں کبھی آپ سے رابطہ کروں تو آپ یہ مت سمجھیے گا کہ میں نے کسی مادی غرض سے فون کیا ہے کہ خون کا رشتہ تو میرا آپ سے آخری لمحے تک رہے گا جب تک یہ سانسیں ہیں، اور میں اپنا نام کبھی احسان فراموش لوگوں میں نہیں لکھوانا چاہوں گی۔ ان پانچ سالوں تک ہم دونوں بہنوں کی پرورش کا احسان تو ہماری گردنوں پر ہے نا۔ خدا حافظ۔'' وہ ان کا جواب سنے بغیر ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

تایا ابو نے اسے بتا دیا تھا کہ اس کا داخلہ کالج میں ہو چکا ہے۔ وہ بس کمرے میں پڑی جانے کی گھڑیاں گنتی رہی۔

ثمینہ پھپھو نے تو سنگ دلی کی انتہا کر دی۔ اسے ایک بار بھی نہیں بلایا تھا۔ وہ تو ایسے اس سے سلوک کر رہی تھیں جیسے سیین کو اس نے بھگایا ہے۔ اس رات کے بعد وہ صرف ایک بار راحیل انکل کے ساتھ آئیں چند گھنٹوں کے لیے اور رات سے پہلے واپس چلی گئیں۔

تائی امی نے ان سے شفق اور عاشی کے رشتے کے لیے بہت زور دیا تھا کہ وہ سعد کے لیے دونوں میں سے ایک کا انتخاب کر لیں۔

پھپھو نے انہیں بہت خوبصورتی سے ٹال دیا تھا۔ فاطمہ بی نے اسے یہ رپورٹ پہنچائی تھی۔

''شہیر صاحب تو آج کل امریکہ جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ بڑے صاحب نے انہیں اجازت دے دی ہے۔ تمہاری پھپھو نے سفارش کی تھی، دو تین ماہ تک چلے جائیں گے۔''

اور اب اسے اس گھر کے کسی بھی معاملے سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ اس کی، سیین کی، اور پاپا کی کتنی خواہش تھی کہ تایا ابو شہیر کے لیے سیین کو مانگ لیں۔ پتا نہیں پھر اس نے یہ انتہائی قدم کیوں اٹھایا۔

بے تحاشا سوچنے کے باوجود اسے اس سوال کا جواب نہیں مل پایا تھا۔ اسے تو احمر سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ عاشی ہی احمر کی دیوانی ہو رہی تھی پھر یہ سب کیا ہوا۔ وہ سوچ سوچ کر تھک گئی۔

جتنے دن وہ گھر میں رہی اس کی حسیات منتظر ہی رہیں کہ ابھی فاطمہ بی آ کر اس سے چپکے سے کہیں کہ سیین کا فون ہے، سیین کا پیغام ہے یا کچھ اور اس سے ملتا جلتا مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ تھک کر اس نے دل میں قطعی فیصلہ کر لیا۔

''اب میں اس بے وفا لڑکی کے بارے میں بالکل نہیں سوچوں گی۔ اس نے کیسے مجھے سب کی نظروں میں گرا دیا ہے۔ خاص طور پر پھپھو۔ اسے معلوم بھی تھا مجھے پھپھو سے عشق ہے ان کے۔۔۔ محبت بھرے لہجے کی میں دیوانی ہوں اور اس بار جب انہوں نے مجھے بلایا تک نہیں تو میرا دل کیسے لہولہو رو دیا ہے میں کس کو بتاؤں۔''

اس نے بے دردی سے اپنی بھیگی آنکھوں کو مسل ڈالا اور اٹھ کر سامان پیک کرنے لگی کہ صبح تو بہر حال اسے جانا ہی تھا۔

ہاسٹل کی زندگی اس کے لیے بالکل اجنبی تھی۔ وہ شروع ہی سے گھر میں رہنے کی

عادی تھی۔ چوبیس گھنٹے ایک ڈسپلن کے تحت ایک مخصوص احاطے میں رہنا اس کی حساس طبیعت بے چین کر گیا۔ ان کی وارڈن بھی بہت سخت تھیں۔ ہاسٹل کے باہر ان کی اجازت کے بغیر قدم رکھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا بلکہ کالج ٹائم میں وہ خود کو زیادہ پرسکون محسوس کرتی بجائے ہاسٹل کے اس تنگ سے کمرے میں۔ حالانکہ کمرہ بہت تنگ نہیں تھا۔ سامان اس کی گنجائش سے زیادہ ٹھنسا ہونے کی وجہ سے کمرہ پہلی نظر میں ہی اپنی تنگی کا اعلان کرتا نظر آتا۔ اس کی روم میٹ سارہ اور عاصمہ تھیں۔ سارہ کا تعلق فیصل آباد سے تھا جبکہ عاصمہ لاہور کی تھی اور وہ کم ہی ہاسٹل میں ٹکتی تھی۔ اس نے شاید ماحول کی تبدیلی کی غرض سے شوقیہ طور پر ہاسٹل میں داخلہ لیا ہوا تھا۔ وہ زیادہ تر اپنے گھر ہی میں رہتیں۔ وہ جوائنٹ فیملی میں رہتی تھی، تیس چالیس افراد کی جوائنٹ فیملی۔

"ایسے جلوس زدہ ماحول میں رہ کر بندہ خاک پڑھ سکتا ہے اس لیے میں نے ہاسٹل میں ایڈمیشن لیا ہے۔ مگر یارو! گھر کے بغیر بھی نہیں رہا جاتا، یہاں کچھ سکون تو ہوتا ہے مگر بدمزہ بے رنگ کھانے دوسرے ہی گھنٹے بندے کو اٹھا کر ہاسٹل سے باہر لے جا پھینکیں اور میں لذیذ کھانوں کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ہمارے گھر میں اور کچھ ہو نہ ہو لذیذ چٹپٹے اور بہت فراوانی سے ڈشز کا انبار ہمہ وقت جمبو سائز ڈائننگ ٹیبل پر موجود رہتا ہے۔ سب افراد کے کھانے کے معمولات ایک دوسرے سے جدا جدا ہیں، اس لیے میرے جیسوں کے تو ہر وقت مزے ہیں۔ اس بات کا اندازہ تم لوگوں کو میری صحت سے بھی ہو گیا ہوگا۔" اس نے اپنی فربہی مائل گورے چٹے وجود کی طرف اشارہ کیا۔ یہ سارہ اور تزئین سے عاصمہ کی پہلی ملاقات تھی جس میں وہ بہت بے تکلفی سے ملی تھی۔ پھر دونوں نے اسے بہت کم اپنے ساتھ کمرے میں دیکھا، وہ اکثر ہی گھر کو فرار رہتی البتہ اس کا سامان تو موجود تھا۔ سارہ بہت چپ چپ اور گم صم رہنے والی لڑکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی اداسی ہر وقت تیرتی رہتی تھی جیسے ابھی رو دے گی۔ صحت کی بھی وہ کمزور تھی اور شکل بھی واجبی سی۔ وہ پہلی نظر میں قطعاً متاثر نہ کرتی تھی اور تزئین نے تو اسے کچھ خاص کبھی پڑھتے ہوئے بھی نہ دیکھا تھا۔

گھنٹوں ایک ہی جگہ پر بت بن کر بیٹھی رہتی۔ اس کے ان گوتم بدھ کے سے مراقبوں سے تزئین کی طبیعت کی بیزاری کچھ اور بڑھ گئی۔

"عاصمہ آج بھی نہیں آئی۔" تزئین کا باتیں کرنے کا دل چاہ رہا تھا، اس لیے خاموشی توڑنے کو بات کا آغاز کیا۔

"تمہیں اس سے کوئی کام تھا؟" وہ بے ڈھنگے پن سے بولی۔

سارہ کے رویے پر اسے غصہ آنے لگا۔ اسے ان لڑکیوں پر رشک آ رہا تھا جن کے کمروں میں پانچ پانچ لڑکیاں رہتی تھیں اور رات گئے تک خوب اودھم مچاتی تھیں۔ ہاسٹل کے سائنس بلاک میں ہر کمرے میں تین سے زیادہ لڑکیاں نہیں رہتی تھیں اور ان کے کمرے کی تیسری ہر وقت فرار اور دوسری آدم بیزار۔

"تم نے فیصل آباد میں ایڈمیشن کیوں نہیں لے لیا؟" اس نے سارہ سے پوچھا۔

"کیونکہ لاہور، لاہور ہے؟"

"ہوں، صحیح کہا؟" تزئین نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تمہارے سبجیکٹس کون سے ہیں؟"

"سائنس اور کیمسٹری۔ تمہیں معلوم ہے آج ایف ایس سی انٹری ٹیسٹ کا رزلٹ اناؤنس ہوا ہے، اگلے ماہ سے داخلے ہو جائیں گے، میڈیکل کالجز میں۔" وہ جوش سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ تزئین کو اس کی اس بے ربط بات کا مقصد سمجھ میں نہ آیا۔

"تو کیا تم نے ٹیسٹ دیا تھا؟"

"نہیں...... میں...... نہیں تو۔" وہ یک دم ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ایں! یہ تمہیں کیا ہوا، طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ سارہ! آر یو آل رائٹ۔"

وہ تو اس کی اس طرح رونے سے پر گھبرا اٹھی۔

"میں کیسے دے سکتی تھی انٹری ٹیسٹ، میرے تو میرٹ سے تین نمبر کم آئے تھے، ٹ میں میرا نام ہی نہیں تھا۔ تزئین! میں تمہیں کیا بتاؤں میں نے ایف ایس سی میں کس قدر نت کی تھی۔ میں نے اٹھارہ نہیں بیس گھنٹے پڑھا تھا۔ دن رات، پڑھائی۔ یہ میری صحت یکھ رہی ہو، صرف اس لیے کہ مجھے میڈیکل میں داخلہ مل جائے۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں ڈاکٹر نا میری زندگی کا اصل مقصد میرا جنون تھا...... یہ خواب، یہ جنون کیا ٹوٹا میری زندگی سے

سب کچھ ختم ہو گیا۔ جستجو، لگن، خوشی، حرکت سب کچھ۔ اب مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ دو بار میں نے خودکشی کی کوشش بھی کی ہے۔ مگر بہت ڈھیٹ ہوں بچ گئی۔ اب میں نے خودکشی نہ کرنے کا وعدہ کر لیا ہے، اس لیے وہ بھی نہیں کر سکتی مگر میں اس طرح جی بھی نہیں سکتی۔''

شفق اور عاشی تو اسے کالج میں دیکھتے ہی نگاہیں چرا لیا کرتی تھیں۔ دونوں نے اس دن سے جو اس سے قطع کلامی کی تھی، وہ اس کے مستقل ہاسٹل اٹھ جانے پر بھی برقرار تھی۔ دوبارہ گھر میں سے بھی کسی نے اس سے رابطہ کرنے کی کوشش نہ کی تھی۔ تائی امی تو خیر ایسا مر کر بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ تایا ابو سے اسے کچھ امید تھی، اب چار ماہ گزرنے کے بعد وہ بھی نہ رہی تھی۔

شفق فائنل ایئر میں تھی، جبکہ عاشی اس کے ساتھ ہی تھرڈ ایئر میں تھی۔ عاشی کے ساتھ اس کا اسلامیات اور پاکستان اسٹڈیز کا پیریڈ ہوتا تھا اور کبھی اس نے تزئین سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شفق کو البتہ وہ آج کالج میں بہت کم دیکھ رہی تھی۔ ویسے بھی اس کا سال ختم ہونے والا تھا۔ شاید وہ گھر پر رہ کر پڑھتی ہو۔ اس نے خود ہی قیاس کیا۔

لیکن وہ صبح تو اس کی زندگی کی حیران کن صبح تھی۔ وہ پہلے پیریڈ کے لیے ابھی سائنس بلاک کے سیکنڈ روم میں داخل ہونا چاہتی تھی کہ پیچھے سے کسی نے اس کا کندھا تھام کر اسے پکارا۔ وہ بے اختیار مڑی۔ شفق سوجی سوجی آنکھوں، بے رونق چہرے اور شکن زدہ یونیفارم میں اس کے سامنے کھڑی تھی۔

''تزئین! مجھے تم سے ایک کام ہے۔ پلیز ذرا میری بات سن لو۔'' اس کا ملتجی لہجہ تزئین کو حیران کر دینے کے لیے کافی تھا۔

''کیسا کام؟'' وہ گڑبڑا کر بولی۔

''ادھر آؤ، میں بتاتی ہوں۔'' وہ اس کا ہاتھ کھینچ کر کمروں سے ہٹ کر برآمدے کی طرف جانے لگی۔

''شفق! میرا پیریڈ ہے فزکس کا۔ پلیز ذرا جلدی۔'' اس نے قدم روک کر کہا۔

''میں زیادہ ٹائم نہیں لوں گی۔ بس چند منٹ۔'' اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا سوتے ہوئے جیسے وہ رات بھر نہ سوئی ہو۔

بال بھی اڑے اڑے سے تھے جیسے جلدی میں انہیں برش کرنا بھول گئی ہو۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' تزئین فکرمندی سے بولی۔

''میں ٹھیک ہوں، تزئین! ابھی عاشی آئے گی تمہارے پاس میرا پوچھنے تو پلیز تم اس سے کہہ دینا کہ میں رات کو تمہارے پاس تھی۔ تمہارے روم میں۔ پلیز کہہ دو گی نا۔'' شفق نے تزئین کے دونوں ہاتھ اپنے ٹھنڈے کانپتے ہاتھوں میں جکڑ رکھے تھے۔

''ک...... کیا...... مطلب۔'' تزئین پر جیسے حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

''ابھی آئے گی نا عاشو! میں نے گھر میں یہی کہا تھا کہ میں رات تمہارے ساتھ رہوں گی۔ تم نے بس میرے بیان کی تصدیق کرنی ہے۔ کر دو گی نا۔'' وہ کچھ جھلا کر اور پھر فوراً ہی نرم پڑ کر بولی۔

''شفق! تمہیں معلوم ہے، تم کیا کہہ رہی ہو۔ یہ کوئی بہت چھوٹی یا معمولی بات نہیں ہے۔'' وہ مدھم لہجہ جتا دینے والا تھا، بہت کچھ۔

''پڑتا ہے فرق، جو بات ہوئی نہیں میرے سامنے میں اس کی شہادت کیسے دے دوں۔''

''تم خود کیا ہو، تمہیں معلوم ہے نا اچھی طرح۔'' وہ ایک دم سے آنکھوں میں تحقیر بھر لائی۔ تزئین کا پورا جسم جیسے جلنے لگا۔

''میں جو ہوں، مجھے پتا ہے اور جو تم ہو وہ تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو خوب پتا ہے پھر یقیناً میری گواہی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ سوری، میری کلاس کا ٹائم ہے مجھے جانا ہے۔'' وہ ایک جھٹکے سے مڑی اور اپنے کلاس روم کی طرف جانے لگی۔

''تزئین...... تزئین! آئی ایم سوری پلیز۔ تزئین! خدا کے واسطے بس آج...... آج کہہ دو آئندہ میں کبھی تم سے ایسی درخواست نہیں کروں گی پلیز۔'' وہ بے اختیار ہو کر اس کے پیچھے لپکی تھی۔ اسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر اپنی طرف موڑ کر بڑی منت سے بولی۔

''جو کام میں نہیں کر سکتی، وہ مجھ سے مت کہو۔ چاہے تم مجھے کسی کا بھی واسطہ دو، میں یہ بات نہیں کہوں گی سوری۔'' تزئین نے روکھے پن سے کہا اور تیزی سے کمرے کے اندر چلی گئی۔ اس کے پیچھے ہی ان کی ٹیچر کمرے میں داخل ہوئیں تو شفق بے جان قدموں سے

پیچھے ہٹ گئی۔

جوں ہی پیریڈ ختم ہوا، تزئین اپنی فائل اور بیگ اٹھائے باہر نکلی تو دروازے کے ساتھ دیوار کے ساتھ لگی شفق کو دیکھ کر بس ایک لمحے کو حیران ہوئی تھی۔

"تزئین! پلیز۔" وہ بہت آہستگی سے اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولی۔ تزئین ان سنی کر کے چلتی رہی۔

"تزئین! میری عزت کا سوال ہے۔" وہ اب اس کے برابر چل رہی تھی، اب لڑکیاں گروپس کی شکل میں پھر رہی تھیں۔ شفق ارد گرد بھی دیکھتی جا رہی تھی۔

"شفق! پلیز...... تم اپنا اور میرا وقت ضائع کر رہی ہو۔" وہ ذرا سا رک کر بولی اور پھر چلنے لگی۔

"تزئین...... تزئین!" کسی نے زور سے اسے پکارا تھا۔ اس نے دائیں طرف گردن موڑ کر دیکھا۔ عاشی تقریباً بھاگتی ہوئی اس کی طرف آ رہی تھی۔ تزئین نے بے اختیار گردن موڑ کر اپنے بائیں طرف دیکھا، شفق دوسری طرف کے کمرے میں غائب ہو چکی تھی، تزئین رک گئی۔

"تزئین! تم نے شفق کو دیکھا ہے کہیں؟" اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور چہرے کا رنگ اڑا اڑا سا تھا۔

"صبح ملاقات ہوئی تھی۔" وہ سرسری لہجے میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بولی۔

"رات وہ تمہارے ساتھ تھی ہاسٹل میں؟" عاشی کے سوال پر اندر کمرے میں دیوار سے چپکی شفق کا سانس جیسے رکنے لگا۔

"کیوں، خیریت؟" تزئین نے فائل دوسرے ہاتھ میں منتقل کی۔

"تم بتاؤ نا، رات وہ تمہارے ساتھ تھی۔" عاشی اصرار سے بولی۔

"نہیں، وہ میرے پاس کیوں آئے گی بھلا۔" تزئین کے جواب پر عاشی کا چہرہ جیسے تاریک ہو گیا۔ وہ کچھ بول ہی نہ سکی۔

"گھر میں سب ٹھیک ہے نا؟" تزئین نے ایک نظر اس کے چہرے کو دیکھا۔ عاشی کچھ نہ بولی۔

"او کے، عاشی! میری کلاس ہے، میں چلتی ہوں۔" وہ کہہ کر آگے بڑھ گئی۔ عاشی چپ چاپ کھڑی رہ گئی اور شفق میں تو ابھی باہر آنے کا حوصلہ نہ تھا۔

اور یہ تزئین کی بدقسمتی تھی کہ اسے آج ہی گھر جانے کی سوجھی۔ اصل میں چار ماہ کے اندازے سے جتنے کپڑے وہ لے کر آئی تھی، وہ اب موسم کی مطابقت کا ساتھ نہ دے پا رہے تھے۔ سردیاں عروج پر تھیں اور اس کے پاس گرم کپڑوں کی کمی تھی۔ ویسے بھی چار ماہ پہلے گھر سے آتے ہوئے اسے خیال تھا کہ تائی امی کا غصہ ایک دو ماہ میں کم ہو جائے گا تو وہ مہینے میں ایک دفعہ تو آ ہی جایا کرے گی۔ وہ اب کئی دنوں سے گھر جا کر کپڑے لانے کا سوچ رہی تھی۔ رات شدید سردی کے بعد آج اس نے پکا پروگرام بنا لیا تھا کہ آج جا کر کپڑے لے آئے گی اور ساتھ ہی تایا ابو سے کچھ پیسے بھی کیونکہ ان کی دی ہوئی رقم تو کب کی خرچ ہو چکی تھی۔ اسے کئی کتابیں اور اسٹیشنری کا سامان تو خریدنا پڑا تھا۔ ویسے بھی آج ہفتہ تھا، ویک اینڈ۔ ہفتے کو ایک تو تایا ابو دوپہر کو ہی گھر آ جایا کرتے تھے، ان سے ملاقات کی امید تھی، دوسرے ویک اینڈ کا خیال کر کے وہ ضرور اسے روک لیں گے۔ آج ہی اس کا گھر جانے کا پروگرام تھا اور آج ہی اس کی ملاقات دونوں بہنوں سے اس ناخوشگوار ماحول میں ہو چکی تھی۔

"مجھے کیا، مجھے تو کپڑے ہی لینے جانا ہے۔ کسی نے نہ روکا تو شام سے پہلے آ جاؤں گی۔ اب شفق بی بی، تائی امی کی بیٹی ہے۔ بن بتائے چاہے ایک رات گھر سے باہر گزارے یا ایک ماہ، کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔"

یہی کچھ سوچتے ہوئے وہ آخری پیریڈ کے بعد ہاسٹل چلی گئی۔ کپڑے بدل کر اس نے شولڈر بیگ میں ایک دو ضروری کتابیں، اپنا ٹوتھ برش اور کچھ نوٹس رکھے۔ "یقیناً رات کو تو رک ہی جاؤں گی۔" خود کو تسلیاں دیتی وہ اسٹاپ تک جا پہنچی۔

"کہاں تھیں، تم رات بھر بے غیرت لڑکی!" وہ الماری کے اوپر بنے اسٹور نما بڑے سے کیبنٹ کو کھولے کھڑی تھی۔ نیچے اس نے ٹیبل اور اس کے اوپر کرسی رکھی ہوئی تھی۔ جب تائی امی کی گرجدار آواز لاؤنج سے اس کے کانوں میں پڑی۔ وہ گھر آئی تو تائی امی گھر میں نہ تھیں اور فاطمہ بی نے اسے بتا دیا تھا کہ شفق رات بھر گھر نہ آئی تھی، اس نے فون کر کے کہہ دیا تھا کہ وہ تزئین کے پاس ٹھہرے گی، پھر ایک سین جیسے ملتے جلتے کیس میں اسے خواہ مخواہ گھسیٹا

جا رہا تھا اس لیے اس نے جلدی سے کپڑے لے کر واپس جانے کا سوچ لیا تھا۔

''ترمین! کے پاس، بتا تو دیا تھا آپ کو رات فون کر کے۔'' شفق کی آواز بے خوف تھی۔ ترمین کے ہاتھ ٹرنک کے ادھ کھلے ڈھکن پر رکے رہ گئے۔

''جھوٹ مت بول، مجھے عاشو نے بتا دیا ہے، وہ کہہ رہی تھی کہ تم اس کے پاس نہیں ٹھہری تھی۔'' تائی امی غرا کر بولی۔

''وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ میں نہیں۔'' شفق کے لہجے میں ذرا بھی خوف نہ تھا۔

''وہ صرف اپنی بہن کے گھر سے بھاگنے کی رسوائی کا ہم سے بدلہ لینا چاہتی ہے، اور اپنے گھر سے نکالے جانا کا انتقام لے رہی ہے، مجھے بدنام کر کے۔ حالانکہ آپ اس کی روم میٹ سے پوچھ لیں۔ میں رات ادھر ہی تھی۔'' شفق کتنی صفائی سے جھوٹ بولے جا رہی تھی۔

''اب سچ بولے گی یا میں۔ تیری چمڑی ادھیڑوں۔'' تائی امی بھی شفق کی ماں تھیں، اتنی جلدی اس کے جھوٹ کو سچ کیسے مان سکتی تھیں۔

''اب اگر آپ کو خود ہی بدنام ہونے کا شوق ہے تو ٹھیک ہے، میں رات اس کے ساتھ نہیں تھی، کہیں اور تھی۔ جس کو دل چاہتا ہے بتا دیں۔'' یہ شفق تھی، ترمین کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

''دیکھا نامراد کی ڈھٹائی، کیسے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بول رہی ہے۔'' شاید تائی امی نے اسے تھپڑ مارا تھا، وہ بلبلا اٹھی۔

''بس کریں آپ! ہر کوئی ترمین یا سین نہیں ہوتا۔ ٹھیک ہے، میں تھی گھر سے باہر رات بھر مگر اپنی مرضی سے، اپنی خوشی سے۔ آپ کو کوئی اعتراض ہے تو مجھے پروا نہیں۔'' وہ بہت اونچا بول رہی تھی۔ ترمین نے جلدی جلدی ٹرنک کھول کر سویٹر اور گرم کپڑے نکالنے شروع کیے۔

''آہستہ بول بے حیا لڑکی! آہستہ بول۔ کیوں ہماری عزت کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی ہے۔ باپ بھائی نے سن لیا تو گردن اتار دیں گے تیری۔ کیوں میری مٹی پلید کروائے گی ان کے ہاتھوں۔'' تائی امی کے لہجے میں بے بسی تھی۔

''تو آپ کیوں بات کو بڑھا رہی ہیں۔ جب اس نے کہہ دیا کہ وہ رات ترمین کے پاس تھی، پاپا کو بھی یہی پتا ہے تو کیا ضرورت ہے واویلا مچانے کی۔'' عاشو نے غصے سے چلا کر کہا۔ وہ بھی لاؤنج میں موجود تھی۔

''واویلے کی بچی، جب اس جھوٹ کی اصلیت کھلی تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔ پھر کس کس کا منہ بند کروں گی، کس کس کی زبان روکوں گی اور تمہارا باپ تو میرا خون کر دے گا۔'' تائی امی رو دینے کو تھیں۔

''ایسے کوئی کسی کا خون نہیں کرتا۔ کرتا ہوتا تو پہلے بھتیجی کا نہ کرتے۔ ہونہہ ساری پابندیاں، سارے ضابطے ہمارے لیے ہیں۔'' عاشو اسی ٹون میں بول رہی تھی۔ ترمین نے ٹرنک بند کر دیا اور کپڑے احتیاط سے لیے نیچے اتر آئی۔

''فاطمہ بی...... اے فاطمہ بی...... باہر بارش ہونے والی ہے، رضیہ کو بھیجو، چھت پر کپڑے تو نہیں ڈال رکھے۔ باہر لان سے کرسیاں بھی اٹھوالو۔''

تائی امی کی تیز آواز پر اس نے جلدی سے نیچے اتر کر کھڑکی کھول کر باہر دیکھا۔ کالے سیاہ بادلوں نے ہر طرف اندھیرا کر دیا تھا۔ کھڑکی کھولتے ہی سرد ہوا نے اس کا استقبال کیا۔ بارش کافی تیز ہو چکی تھی۔ وہ جلدی جلدی کپڑے تہہ کر کے بیگ میں رکھنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد اس کا بیگ تیار تھا۔ اسے چائے کی طلب ہو رہی تھی وہ فاطمہ کی تلاش میں اپنے کمرے سے باہر نکل آئی۔

''یہ کیا لینے آئی ہے ادھر۔ یہ اب ہمارا تماشا دیکھنے آئی ہے کن سوئیاں لینے، جھوٹی، مکار لڑکی، جس تھالی میں ساری عمر کھایا، اسی میں چھید کیا۔ کہتی ہے، میں اس کے پاس رات ہی تھی نہیں۔ ہاں اسے موقع جو مل گیا ہے تو فائدہ نہ اٹھائے۔ پوچھیں اس سے۔''

شفق اور عاشو سر جوڑے سرگوشیوں میں مگن تھیں۔ شفق اسے دیکھتے ہی کسی بلی کی طرح اس پر جھپٹی تھی۔ تائی جو دوسرے صوفے پر بیٹھی کسی گہری سوچ میں گم تھیں۔ بیٹی کی چیخ و پکار سنتے ہی حال میں واپس آ گئیں۔

''تم ادھر کیوں آئیں؟ میری اجازت کے بغیر بولو۔''

تائی امی سرد لہجے میں کہتے ہوئے اس کی طرف بڑھیں تو اس کے پورے جسم میں

لگی سی دوڑ گئی۔

''وہ... مم... میں تائی امی کپڑے گرم نہیں تھے میرے پاس۔ وہ لینے کے لیے......'' وہ بمشکل بولی تھی۔

''نکل ادھر سے، تجھے کس نے اجازت دی آنے کی، دور ہو جا میری نظروں کے سامنے سے۔'' تائی امی شاید آگے بڑھ کر اسے پیٹنا ہی شروع کر دیتیں۔

''تائی امی! باہر بارش ہو رہی ہے، رک جائے گی تو چلی جاؤں گی۔'' وہ منت بھرے لہجے میں بولی۔

''میں تجھے ایک پل کے لیے ادھر نہیں دیکھنا چاہتی۔ دفع ہو جا، میری نظروں کے سامنے سے۔ گندی مچھلی۔'' ان کی آنکھوں سے شعلے لپکنے لگے۔

''آپ...... آپ خود ہیں یہ سب اور آپ کی بیٹیاں بھی۔'' زور سے چلا کر کہتے ہوئے اس نے لاؤنج سے باہر کی طرف دوڑ لگا دی پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

اور اسٹاپ تک پہنچ کر اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا، عام سے سوٹ کا دوپٹہ اوڑھے وہ پوری طرح سے بھیگ چکی تھی۔ سردی سے اس کے دانت بج رہے تھے۔ آنکھوں کے آگے بار بار آنسوؤں کی چادر آ رہی تھی۔

کم از کم اپنا سامان تو اٹھا لیتی، شولڈر بیگ بھی ادھر ہی رہ گیا۔ اب وین کا کرایہ کہاں سے دوں گی؟'' اسٹاپ کے شیڈ کے نیچے کھڑی چہرہ صاف کرتے ہوئے وہ اپنی عقل پر ماتم کرنے لگی۔

''اب کیا ہو گا۔'' اس نے پریشان نظروں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ خوف اور پریشانی سے اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ دو وینیں اس کے سامنے سے گزر گئیں، مگر اس کے پاس کرایہ نہیں تھا، تو وہ کیسے بیٹھ جاتی۔

''بی بی! یہ آپ کا سامان فاطمہ بی نے دیا ہے۔'' ایک دم سے مڑ کر دیکھا، پڑوس کے انکل شیرازی کا نوکر اس کے گرم کپڑوں کا بیگ اور شولڈر بیگ لیے کھڑا تھا۔ اس مہربانی پر اس کا دل بھر آیا۔

نوکر کو ممنون نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے سامان لے لیا۔

''اگر روئے زمین پر تائی امی جیسے شقی القلب لوگ ہیں تو فاطمہ بی جیسے دل رحم بھی۔'' وہ دل ہی دل میں شکر ادا کرتے ہوئے وین کی طرف بڑھ گئی۔

☼

ایک تو بارش میں وہ کافی دیر تک بھیگتی تھی پھر عزت نفس اور خودی کی ذلت کا ایک اور تلخ تجربہ۔ اپنے وجود کی اس حد تک تحقیر کہ اسے دھکے دے کر نکالا گیا۔ ہاسٹل آ کر اس کو اپنے اوپر بے اختیار رونا آیا، سامان فرش پر پھینک کر بستر پر گرتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کا دل درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ اپنی اس حد تک بے وقعتی کا احساس مارے دے رہا تھا۔ شاید اس کی سسکیاں کمرے سے باہر جانے لگی تھیں کہ ایک دم اسے احساس ہوا، اس نے ان بے قابو ہوتی سسکیوں کا یک لخت گلا گھونٹا۔

''آخر میں کیوں رو رہی ہوں، کیوں؟ یہ تو مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ کسی کو میری ضرورت نہیں۔ تائی امی نے جو کیا، یہ کچھ نیا تو نہیں، انہیں تو ہمیشہ سے انسانوں کو دھتکارنے کا عادت ہے۔''

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی، گیلے دوپٹے سے اپنا چہرہ رگڑ کر صاف کیا۔ اس کے کپڑے بھی گیلے تھے اور بستر پر اس طرح گر جانے سے اب تو بستر بھی نم ہو گیا تھا۔ وہ ابھی اپنے کپڑے نکالے اور واش روم میں چلی گئی۔ گیلے بال سلجھاتے ہوئے اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ خود پر ضبط کے بند باندھے بال سلجھا کر وہ بستر میں گھس گئی۔

''وہ جو کہتا تھا، میں سعد راحیل ہوں، خاص تمہارے لیے اور تم خاص میرے لیے اور یہ خصوصیت موت بھی فنا نہ کر سکے گی۔ اب وہ کہاں ہے؟ اتنے ماہ میں اسے ایک بار بھی خیال نہ آیا کہ اپنی اس خاص ہستی کا پتا ہی کر لے، کہ وہ زندہ بھی ہے کہ مر گئی۔''

اس کی آنکھیں پھر نم ہونے لگیں۔

''تزئین ارتضیٰ! جب سب سے آس ٹوٹ گئی تو سعد راحیل کون سا دنیا بھر سے جدا ہے۔ ثمینہ پھپھو کے اشارہ ابرو کے بغیر وہ تو سانس بھی نہیں لے سکتا۔ کیا میرے بارے میں تنہا فیصلے کرتا پھرے۔ بھول جاؤ اس کو۔'' وہ سر دبانے لگی۔

''شکر ہے سارہ آج موجود نہیں ورنہ میں اس سے کچھ بھی نہ چھپا پاتی۔'' اس نے

گہری سانس لے کر آنکھیں موند لیں۔

رات تک اسے بخار ہو چکا تھا، وہ اسی طرح بخار میں پھنکتی رہی۔ پتا نہیں کب جلتے بدن اور جلتے ذہن کے ساتھ وہ بے سدھ ہو گئی۔



تایا ابو سے اب رابطہ کرنا بہت ضروری ہو گیا تھا۔ اس کی مجبوری تھی، اس کو ہاسٹل سے آخری نوٹس مل چکا تھا۔ چار ماہ کے واجبات ادا جو نہیں ہوئے تھے۔ کالج فیس کا بھی یہی حال تھا اور خود اس کے پاس اب ایک بال پوائنٹ خریدنے کے پیسے بھی نہیں تھے۔ اگلے ہفتے اس کے فائنل ایگزام شروع ہونے والے تھے۔ اسی لیے وارڈن نے واجبات کی ادائیگی کے لیے جلدی مچا رکھی تھی کہ ایگزام ہوتے ہی لڑکیاں گھروں کو روانہ ہو جائیں گی پھر دو ماہ تک کسی کی شکل بھی نظر نہیں آئے گی۔

''تایا ابو! السلام علیکم میں ترزین۔'' اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''وعلیکم السلام۔ کیا حال ہے تمہارا؟'' ان کا لہجہ بے حد نارمل تھا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔

''ٹھیک ہوں تایا ابو!'' دھیرے سے کہہ کر وہ چپ ہو گئی۔

''تم نے پہلے بھی شاید فون کیا تھا، مجھے پیغام ملا تھا مگر مصروفیت کی وجہ سے فون نہیں کر سکا۔'' ان کا لہجہ ہنوز تھا۔ کوئی شفقت، معذرت کچھ بھی تو نہیں تھا۔

''جی...... '' وہ رکی۔ ''وہ ایگزام ہیں میرے فائنل، اگلے ہفتے سے۔'' اسے تو تمہید باندھنا بھی نہیں آتی تھی۔

''اچھا!''

دونوں طرف یک لخت خاموشی چھا گئی۔

''اچھا ترزین! میں بزی ہوں اس وقت، پھر فون کر لینا۔'' اسے لگا، وہ فون بند کرنے والے ہیں۔

''تایا ابو پلیز!'' وہ جلدی سے بولی۔ ''وہ تایا ابو مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی تھی۔''

''ہاں بولو۔''

''وہ تایا ابو میرے ہاسٹل کے واجبات پچھلے چار ماہ کے اور کالج فیس بھی...... اور دوسرے...... میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔'' رک رک کر اس نے مدعا بیان کر دیا۔

''ٹھیک ہے، میں شام تک بھجوا دوں گا اور کوئی بات؟'' بعجلت تمام کہا۔

''تایا ابو ڈیوز ادا کیے بغیر مجھے ایگزام میں بیٹھنے نہیں دیں گے۔'' اس نے احساس دلانا چاہا۔

''کہہ جو دیا شام کو بھجوا دوں گا، اب اتنا تو انتظار کر سکتی ہو نا؟'' پتا نہیں وہ اس قدر اس سے ناراض کیوں تھے۔

''تایا ابو! ایک اور بات بھی تھی۔'' اب تو اس کا حوصلہ تمام ہونے کو تھا۔

''ہاں، اب کیا ہے؟'' وہ سخت بیزاری کے عالم میں بولے۔

''تایا ابو! ایگزام کے بعد کالج تقریباً ڈیڑھ ماہ کے لیے، میرا مطلب ہے کلاسز تو ہوں گی نہیں رزلٹ تک...... تو میں گھر آ جاتا...... اور کہاں جاؤں گی۔'' وہ رو دینے کو تھی۔

''اچھا اس پر پھر بات کریں گے، میں ایک دو روز میں تمہیں فون کروں گا۔ آج شہیر کی فلائٹ ہے ایک گھنٹے بعد، میں اس کو چھوڑنے ایئر پورٹ جا رہا ہوں، خدا حافظ۔''

انہوں نے فون بند کر دیا تو اس نے بھی جیسے تھک کر ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔ میڈم زرقا جیسے فائلوں میں گم تھیں۔ دوسرا اسٹاف بھی اپنے کاموں میں مگن تھا۔ کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا، اس نے آہستہ سے آنکھوں میں آئی نمی صاف کی۔

''میڈم کال چارجز......؟'' اس نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں بھئی! جاؤ، اس کی ضرورت نہیں۔'' انہوں نے سر اٹھائے بغیر جواب دیا تو وہ کمرے سے باہر آ گئی۔

پتا نہیں کیوں اسے لگ رہا تھا تایا ابو نے محض اسے ٹالا ہے، وہ پیسے نہیں بھیجیں گے۔ وہ مایوس سی آ کر کمرے میں بیٹھ گئی۔

''چائے پیو گی؟'' سارہ اپنے لیے الیکٹرک کیٹل میں چائے بنانے جا رہی تھی، ٹی کرزن سے ٹی بیگ نکالتے ہوئے بولی۔

"ہاں پی لوں گی۔" وہ تھکے تھکے لہجے میں بولی۔ سارہ خاموشی سے چائے بنانے لگی۔

"تزئین کو کوئی رستہ نہیں سوجھ رہا تھا، اگر تایا ابو نے شام تک پیسے نہ بھجوائے تو......؟" ایک ایسا سوالیہ نشان اس کے آگے تن کر کھڑا تھا کہ اس کے پیچھے دیکھنے کی اسے ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

"یہ لو۔" گرم گرم بھاپ اڑاتی چائے کا مگ سارہ نے اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"تھینک یو۔" اس نے مگ کو دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام لیا۔

"کیا بات ہے تزئین! پریشان ہو بہت، انکل سے بات کر آئیں۔"

"ہاں، کر آئی۔" اس نے گہرا سانس لے کر چائے کا گھونٹ بھرا۔

"کیا کہا انہوں نے؟" سارہ اپنے رائٹنگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھ کر اپنے نوٹس درست کرنے لگی۔

"شام تک بھجوا دیں گے۔" وہ کھڑکی سے باہر ڈھلتی دوپہر کے سائے نظروں میں تولتے ہوئے دھیمے سے بولی۔

"تو پھر فکر کی کیا بات ہے، بھیج دیں گے شام کو۔ اف ایک ہفتہ رہ گیا ہے پیپرز میں اور ابھی تک میری Revision بھی مکمل نہیں ہو پا رہی۔" وہ افسوس سے سر ہلاتے ہوئے اپنے نوٹس میں گم ہو گئی۔ تزئین خاموشی سے چائے کے سپ لیتی رہی۔

شام گہری رات میں ڈھل گئی۔ تایا ابو نے اپنا وعدہ ایفا نہ کیا اور انہیں ضرورت بھی کیا تھی، وہ کون سا اس کے آگے یا کسی کے بھی آگے تزئین کے سلسلے میں جواب دہ تھے۔ اور وہ احمقوں کی طرح ان سے توقع لگا کر بیٹھ گئی۔

"انہوں نے جتنا کر دیا اب تک، وہی بہت ہے۔ اب مجھے خود کچھ سوچنا چاہیے۔ آخر کب تک میں دوسروں کو آس بھری نظروں سے تکتی رہوں گی۔"

رات بھر اسی طرح کی بے چین سوچوں نے اسے گہری نیند سونے نہیں دیا پھر وارڈن کی وارننگ کے بھی صرف دو دن ہی تو رہ گئے تھے۔

"سارہ! میرا ایک کام کرو گی، تم کالج جا رہی ہو؟" صبح سارہ کو کالج کے لیے تیار

ہوتے دیکھ کر وہ بولی۔

"ہاں یار! بس دو چار پریکٹیکلز رہ گئے ہیں، ان ہی کی وجہ سے جانا پڑ رہا ہے۔ ہاں تو تمہیں کیا کام ہے؟" وہ برش کرتے ہوئے مصروف لہجے میں بولی۔

"کالج سے کب تک آؤ گی۔" وہ ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔

"کیوں، کہیں جانا ہے؟"

"تمہارے ماموں کا گھر ہے نا ادھر۔ میرا مطلب ہے۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"سارہ! مجھے یہ دونوں چیزیں سیل کرنی ہیں۔" اس نے اپنی بند مٹھی سارہ کے آگے کھولی۔ اس کی کھلی ہتھیلی پر اس کے ٹاپس کی جوڑی اور گلے کی چین پڑی تھی۔ ٹاپس تو ارتضیٰ نے اسے مڈل میں ٹاپ کرنے پر دیے تھے اور چین سیٹ کی تھی جو اس نے تزئین کو آخری دن شادی میں پہن کر جانے کے لیے دی تھی۔

"اس کی کیا ضرورت پڑ گئی۔" سارہ اچنبھے سے بولی۔

"تمہیں معلوم تو ہے۔" اس کی آواز ذرا کی ذرا بدلی۔

"لیکن۔" سارہ جھجکی۔ "تم اپنے انکل کو دوبارہ فون کرو یا گھر چلی جاؤ تزئین! یہ تو اچھا نہیں لگتا۔ تم خود بتاتی ہو یہ تمہارے پاپا کی نشانی ہے تو۔"

"سارہ! زندہ لوگوں کی ضروریات مردوں کی نشانیوں سے زیادہ اہم ہوتی ہیں اور تایا ابو کو میں فون نہیں کر سکتی اور نہ گھر جا سکتی ہوں۔ سارہ! میرے پاس فقط آج کا دن ہے، اگر کل تک ڈیوز پے نہ ہوئے تو...... تمہیں معلوم ہے اس مسئلے کی وجہ سے میں بالکل بھی نہیں پڑھ پا رہی ہوں اور اگر میں فائنل ایگزام نہ دے سکی تو...... سارہ میری زندگی میری اس تعلیم پر ین کرتی ہے۔ اگر میں گریجویشن نہ کر سکی تو پھر شاید میرے پاس زندہ رہنے کے لیے کوئی رستہ نہ بچے گا۔ تم اس بات کو شاید نہ سمجھ سکو۔" وہ رخ موڑ کر اپنے جذبات پر قابو پانے لگی۔

"اوکے، میں گیارہ بجے تک آ جاؤں گی، تم تیار رہنا، ہم ماموں کی طرف چلیں گے۔ ممانی کے بھائی جیولر ہیں، ممانی کو ساتھ لے لیں گے۔ اچھا، جتنی جلدی تمہارے واجبات ادا ہوں، تم کم از کم پڑھ تو لو۔ کیریئر بنا لوگی تو اس طرح کی بہت سی چیزیں خرید لوگی۔ ٹینشن، ریلیکس۔" وہ اسے تسلی دے کر اپنی کتابیں اٹھائے باہر نکل گئی۔

سارہ کی ممانی اچھی عورت تھیں۔ سارہ نے پتا نہیں کس طرح تزئین کے مسئلے کا بتایا کہ وہ اس پر بہت مہربان نظر آ رہی تھیں۔

"کھانا کھائے بغیر تو تم دونوں نہیں جا سکتیں۔ کھانا بس تیار ہے، میں نے بھائی جان کو فون کر دیا ہے، بس کھانا کھاتے ہی چلیں گے۔"

"پلیز آنٹی! آپ کھانے کا تکلف مت کیجئے، ہمیں دیر ہو جائے گی، ہمیں پڑھنا ہے جا کر۔" وہ فوراً اٹھتے ہوئے بولی۔

"جی ممانی! تزئین ٹھیک کہہ رہی ہے، ہمیں دیر ہو جائے گی۔" سارہ کو بھی وقت کی کمی کا احساس تھا۔ امتحان کا ہوا اس کے سر پر بھی سوار تھا۔

"آدھے گھنٹے میں کوئی تم دونوں ناپ کرنے سے رہ نہیں جاؤ گی، تم دونوں منہ ہاتھ دھو لو، میں پندرہ منٹ میں کھانا لگواتی ہوں۔" وہ دونوں کو ڈانٹ کر باہر نکل گئیں۔

"تزئین! ویسے میرے پاس بھی کچھ رقم ہے، اگر تمہارا اس سے کام چلتا ہے تو ٹھیک ورنہ تھوڑے پیسے میں ممانی سے لے لیتی ہوں۔ تم یہ چیزیں مت بیچو۔" سارہ کچھ دیر بعد بولی۔

"نہیں سارہ! یہ چیزیں میری خودداری سے زیادہ قیمتی نہیں، اب یہ بات دوبارہ مت کرنا پلیز کہ میں خود کو ہلکا سمجھنے لگوں۔" تزئین کی بات پر سارہ چپ ہو گئی۔

پھر جیولر سے فارغ ہوتے انہیں چار پانچ بج ہی گئے۔ بہر حال رقم اتنی مل گئی جس سے وہ نہ صرف اپنے تمام ڈیوز کلیئر کرا سکتی تھی بلکہ اپنا جیب خرچ بھی کئی ہفتوں تک با آسانی چلا سکتی تھی اور اس میں یقیناً ممانی کے بھائی کی فراخدلی یا بہن کے سسرالی رشتے داری کا خیال کارفرما تھا۔

"میں تم لوگوں کو کالج ڈراپ کر دیتی ہوں۔" اس کی ممانی نے آفر کی۔

"نہیں مامی! ہم چلے جائیں گے۔ اصل میں مجھے ذرا فیروز سنز تک جانا ہے۔ ایک ریفرنس بک دیکھنی ہے ادھر، آپ کو دیر ہو جائے گی۔"

سارہ نے سہولت سے انکار کر دیا۔ وہ انہیں خدا حافظ کہہ کر گاڑی آگے بڑھا لے گئیں۔ فیروز سنز تو اس کی بھی آئیڈیل جگہ تھی، یہاں آنے کو ہمیشہ ہی اس کا دل مچلتا تھا۔

کتابیں ہی کتابیں کہ جن میں گم ہو کر آدمی ساری دنیا کی پریشانیاں سرے سے فراموش کر سکتا ہے۔ سارہ اپنی ریفرنس بک کی تلاش میں لگ گئی، وہ ادھر ادھر ریکس میں کتابیں دیکھنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد وہ سارہ کی طرف مڑی جو اپنی کتاب ہاتھ میں پکڑے کاؤنٹر کی طرف جا رہی تھی۔

"کیا خیال ہے، آئس کریم نہ کھالی جائے۔" باہر نکلتے ہی سارہ کو نئی سوجھی۔

"نہیں سارہ! پلیز اب واپس چلتے ہیں، مجھے جا کر پڑھنا بھی ہے۔ کئی دنوں سے ڈھنگ سے پڑھ نہیں سکی۔" وہ فوراً انکار کرتے ہوئے بولی۔

"او کے، پھر آئیں گے کبھی آئس کریم کھانے اور ساتھ میں کوئی زبردست سی مووی دیکھنے۔ تم تو یار مجھ سے بھی زیادہ آدم بیزار ہو۔ جوانی میں کچھ نہ کچھ تو انجوائے منٹ کرنا چاہیے۔" رکشے میں بیٹھنے سے پہلے وہ بولی۔

"چلو ایگزام کے بعد اس انجوائے منٹ کی بھی کوشش کریں گے تمہارے کہنے پر۔" رکشے میں بیٹھنے سے پہلے اس نے مال روڈ پر دوڑتی ٹریفک پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ ریڈ مارگلہ میں وہ یقیناً ثمینہ پھپھو ہی تھیں، پیچھے عاشو اور شفق کے چہرے بھی نظر آ رہے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر کون تھا، وہ دیکھ نہ سکی۔

"بیٹھیں بی بی!" رکشے والا اس کے اس اچانک ٹھٹکنے پر جھنجھلا کر بولا تو وہ جلدی سے رکشے میں بیٹھ گئی۔

"خیریت!" سارہ نے متلاشی نظروں سے اس کی کھوئی کھوئی کیفیت کو دیکھا۔

"اٹس او کے، ویسے ہی۔"

"پھپھو لاہور میں ہیں اور شاید سعد بھی، پھر بھی ...... کم از کم سعد کو تو مجھ سے کانٹیکٹ ......" وہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔

"حد ہے تزئین بی بی! اتنی ذلتوں کے باوجود بھی نئی نئی امیدوں کے محل سرا تعمیر کرنے سے باز نہیں آئیں تم۔" اس کے دل نے فوراً جھڑکا تو وہ سر جھٹک کر باہر دیکھنے لگی۔



"اصل میں پیسے مجھے بھجوانے تو تھے، اس روز شہیر کی فلائٹ بھی تھی، میں اسے ایئر

پورٹ چھوڑنے لگا، فلائٹ ایک گھنٹہ لیٹ تھی۔ بس ان ہی چکروں میں شام ہو گئی، آفس میں دوبارہ جا ہی نہ سکا۔ اگلے روز تین دن کے لیے مجھے اسلام آباد جانا پڑ گیا۔ بس اسی میں ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ گزر گیا۔ تمہارے ایگزام ہو رہے ہیں؟''

تایا ابو کا لہجہ اس بار کچھ نرم تھا اور کچھ معذرتی بھی۔ وہ آج پہلی بار اس سے ملنے آئے تھے اور وہ انہیں جتا بھی نہ سکی کہ اس کی فون کال کو ڈیڑھ ہفتہ نہیں تین ہفتے ہونے کو آئے ہیں۔

''جی، ایگزام تو ختم ہو گئے، آج ہی آخری پیپر تھا۔''

''وہ میں گیا تھا آفس، تمہارے ڈیوز کلیئر کرنے تو پتا چلا کہ تم نے ادا کر دیے ہیں۔ تم تو کہہ رہی تھیں تمہارے پاس پاس کچھ بھی نہیں۔'' ان کی آنکھوں میں لرزتے عجیب سے شک نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ پہلے اس کا ارادہ نہیں تھا کہ وہ انہیں سب بتائے گی مگر اس کی یہ مصلحت اسے زندگی بھر کے لیے ان کی نظروں میں مشکوک کر سکتی تھی۔

''میں نے اپنے ٹاپس اور چین بیچ کر دیے تھے۔ میری روم میٹ کے ماموں جیولر ہیں، اس کے بغیر میں ایگزام نہیں دے سکتی تھی۔'' وہ اٹک اٹک کر بولی تو مرتضیٰ احمد جیسے سناٹے میں آ گئے۔

''تم نے کیوں بیچے، مجھے دوبارہ کال کر لیتیں۔'' کافی دیر بعد وہ شرمندہ لہجے میں بولے۔

''سوری، مجھے تم نے بتایا تھا، میں ہی بھول گیا تھا۔'' اسے تو اب ان سے اس قسم کے معذرتی رویے کی توقع بھی نہ رہی تھی۔ اس کی یہ شرمندگی اپنی چیزوں سے محرومی کے احساس کو بھی لمحے میں دھو گئی۔

''بہرحال میں نے تمہارے آئندہ چھ ماہ کے ڈیوز اکٹھے ادا کر دیے ہیں۔ ہاسٹل کے بھی اور کالج کے بھی کیونکہ مصروفیت میں اکثر بہت سے ضروری کام بھول جاتا ہوں۔'' ان کی بات پر اس کے دل نے اطمینان کا سانس لیا۔ کم از کم وہ چھ ماہ تو سکون سے پڑھ سکے گی اور اب تو اس کے پاس بیچنے کو بھی کچھ نہ تھا۔

''پیپرز کیسے ہوئے تمہارے؟'' انہیں خیال آیا۔

''بہت اچھے، میری توقع سے بڑھ کر۔'' وہ اب جیسے سارے ملال بھول چکی تھی۔ جوش سے مسکراتے ہوئے بولی۔

''اچھی بات ہے۔ یہ تمہارا جیب خرچ، اگر کم پڑے تو اب کے میرے منیجر اعجاز کو فون کر دینا۔ اس کا نمبر بھی میں نے لکھ دیا ہے۔ اسے میں نے ہدایت کر دی ہے، جتنی رقم تم کہو گی، وہ تمہیں ادھر دے جایا کرے گا۔'' پتا نہیں تایا ابو اس پر اس قدر مہربان کیوں ہو رہے تھے۔ وہ حیران سی تھی۔

''اور یہ کچھ رقم ہے اس سے اپنی کچھ شاپنگ کر لینا جا کر، موسم بھی تو بدل رہا ہے نا۔'' انہوں نے اسے ہزار کے دو نوٹ پکڑائے۔

''اچھا اب میں چلتا ہوں۔ کافی دیر ہو گئی۔'' وہ رسٹ واچ پر نگاہ ڈال کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

''تایا ابو! مجھے بھی تو آپ کے ساتھ جانا ہے۔ آپ کو معلوم ہے نا، آج ہمارے ایگزام ختم ہو گئے ہیں اور ڈیڑھ ماہ تک تقریباً تو ہماری کلاسز ہوں گی اور نہ......''

''کالج تو کھلا ہے نا سیکنڈ ائیر اور فورتھ ائیر موجود ہے ابھی۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر بولے۔

''جی، وہ تو ہے مگر ہماری......''

''دیکھو زین! میری بات سنو۔ اصل میں، میں تمہیں گھر نہیں لے جا سکتا اور ان دنوں تو بالکل نہیں۔ شفق کے رشتے کی بات تقریباً فائنل ہو چکی ہے اور ان لوگوں کو ہم نے تمہارے اور زین کے بارے میں کچھ نہیں بتا رکھا۔ آج کل خوب آنا جانا لگا ہوا ہے، شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں، تم جاؤ گی تو وہ تمہارے بارے میں پوچھیں گے اور تمہاری تائی امی، تمہیں تو معلوم ہے نا سب، اس لیے تم اب ادھر ہی رہو۔ جب مناسب ہو گا میں تمہیں لے جاؤں گا۔ ویسے میں نے تمہاری وارڈن سے ساری بات کر لی ہے۔ وہ تمہیں جانے کو نہیں کہیں گی۔ او کے، میں اب چلتا ہوں بہت دیر ہو گئی، رزلٹ آ جائے تو مجھے ضرور بتانا۔'' انہوں نے اس کے جھکے سر پہ ہاتھ پھیرا اور خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گئے۔ یہ دیکھے بغیر کہ ان کے جاتے ہی وہ کیسے دھواں دھواں آنکھوں کے ساتھ صوفے پر گر گئی تھی۔

اور پھر اس کے آنسو تھم ہی نہ سکے۔ سارہ تو جا چکی تھی۔ عاصمہ پہلے ہی نہیں آتی تھی۔ ایگزام سے پہلے ایک ہفتے کے لیے آئی تھی اور پرسوں سے گھر چلی گئی تھی اور اب تو سائنس ہاسٹل تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ فورتھ ایئر بھی فائنل ایگزام کے لیے آج کل میں فری ہونے کو تھا۔ اس کے بعد تو سارا کالج اور ہاسٹل بھائیں بھائیں کرنے لگے گا۔

"کیا میں اس قدر اچھوت ہو چکی ہوں جس کا سایہ ان کی بیٹیوں پر پڑنا ہی نہیں چاہیے۔ سین! اقم نے یہ کیا کیا۔ کیوں میری زندگی اس قدر مشکل بنا دی، کیوں؟" رات کو بیڈ پر لیٹ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ سارہ کے جانے سے اسے تنہا کمرے سے خوف آنے لگا تھا۔

اور پھر باقی کے اٹھیں دن اس نے کیسے کاٹے، یہ اس کا دل جانتا تھا یا اس کا خدا۔ حالانکہ آخری دن اس نے لائبریری بند ہونے سے پہلے تقریباً دس کتابیں ایشو کروائی تھیں مگر ان میں سے بمشکل تین کتابیں ہی وہ پڑھ سکی تھی۔

"ایسی مہیب تنہائیاں تھیں کہ سوائے خوف اور رونے کے اسے کچھ سوجھتا ہی نہ تھا اور حوصلہ اس قدر نہ تھا کہ کہیں باہر جا کر ہی گھوم پھر آئے۔ وارڈن اور اس کا اسٹاف بھی عجیب مشکوک نظروں سے دیکھتے تھے کہ وہ اپنے آپ ہی پانی پانی ہو کر رہ جاتی۔

خدا خدا کر کے کل سے کلاس شروع ہونے والی تھیں۔ وہ کل کے لیے اپنا یونیفارم پریس کر رہی تھی، جب چپڑاسی نے آ کر اسے کسی کی آمد کا بتایا۔

"تایا ابو کو آج کیسے میری یاد آ گئی۔ جب میں تنہائی کا جنگل کاٹ چکی۔" استری کا پلگ نکال کر وہ کڑھتی ہوئی وزیٹنگ روم میں آ گئی اور اندر بیٹھے شخص کو دیکھ کر اسے جھٹکا لگا۔ سعد راحیل، اسی فریش چہرے اور چمکتی آنکھوں سمیت اس کا منتظر بیٹھا تھا۔ وہ سست قدموں سے اندر بڑھ گئی۔

"کیا بات ہے، بہت پڑھ لکھ گئی ہیں۔ آپ جو سلام کرنا مناسب نہیں سمجھتیں؟ معلوم بھی ہے، بندہ کتنے ہزار کوس دور سے آیا ہے۔" وہ اس کا روٹھا روٹھا چہرہ دیکھ کر شوخی سے بولا۔

"میں نے کسی کو خط نہیں لکھا تھا کہ ہزاروں کوس پھلانگ کر مجھ سے ملنے آئے۔"

منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔

"خط نہیں لکھا، خوابوں میں آ کر تو روز ستاتی تھیں نا۔" وہ ذرا سا رومانٹک ہو کر بولا۔

"مجھے ضرورت نہیں ہے کسی کے خوابوں میں جانے کی۔"

"اسی طرح کی صورت بنا کر آتی تھیں، روز میں ڈر کر چیخ مارتا ہوا اٹھ جاتا تھا۔"

وہ اس کے مذاق پر کچھ نہ بولی بلکہ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ کوئی بھی بات کرے۔ ان اٹھیں دنوں کی تنہائی نے اسے جیسے بالکل ہی مار کر رکھ دیا تھا۔

"اب ٹھیک سے بولو تو سہی، اتنے دنوں بعد تو آیا ہوں۔"

"میں نے آپ کو نہیں بلایا۔" وہ چڑ کر بولی۔

"پھر وہی انداز۔" وہ انگلی اٹھا کر تنبیہی انداز میں بولا۔ "تزئین! میں تمہیں ایک پل کو نہیں بھولا، مجھے تمہارے سر کی قسم مگر رابطہ اس لیے نہیں کیا کیونکہ ایک تو تم ہاسٹل میں تھیں، فون کرتا تو اچھا نہ لگتا۔ ویسے ملنے آنا بھی مشکل تھا۔ میرے ایگزام بھی تھے۔ کچھ اسٹڈیز کی مصروفیت۔ کچھ پاپا کے ساتھ آفس میں جاتا ہوں۔ اب بس فائنل ایئر آنے والا ہے۔ کچھ ہماری مشکلات کا ایک ڈیڑھ سال اور اس کے بعد میری راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو گی تم سے ملنے میں۔" وہ شاید اسے تسلی دے رہا تھا۔

"مسٹر سعد راحیل! یہ آپ کی غلط فہمی ہے بلکہ خوش فہمی کہ میں آپ سے ملنے کے لیے مری جا رہی ہوں اور ان ملاقاتوں کے رستے میں آنے والی رکاوٹوں پر دل و جان سے خائف ہوں اور دن رات ان کے دور ہونے کی دعائیں کر رہی ہوں تو میں آپ کو بتا دوں مجھے ایسا کوئی شوق نہیں ہے اور خواہش۔ ویسے آپ مجھے بتا سکتے ہیں، آپ مجھ سے کس رشتے یا والے سے ملنے آئے ہیں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میرا رشتہ آپ سے، آپ کی والدہ کے حوالے سے بنتا ہے۔ جب وہی مجھے ڈس اون (نہ اپنانا) کر رہی ہیں تو میرا آپ سے کوئی واسطہ نہیں۔"

وہ چبا چبا کر انتہائی روکھے لہجے میں بول رہی تھی۔ سعد راحیل کا چند لمحے پیشتر کا کھلا کھلا سا شاداب چہرہ ایک دم مرجھا گیا تھا۔ آنکھوں کی جوت بجھ سی گئی۔

''یہ ایک حقیقت ہے، میں اس کو مانتا ہوں کہ میرا رشتہ تم سے حما کے حوالے سے بنا ہے۔ وہ تمہیں ایک بار نہیں، دس ہزار بار بھی ڈس اون کریں، مجھے پروا نہیں کیونکہ میرا دل تمہیں قبول کر چکا ہے۔ ہمیشہ کے لیے۔ اب تمہیں چاہے اچھا لگے، چاہے برا، میں ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ نہ اپنے عہد سے، نہ اپنے تعلق سے کہ تم میری منگیتر تو ہو نا۔'' وہ چند لمحے کے توقف سے بڑے مضبوط انداز میں بولا تھا۔

''آپ بھول رہے ہیں، آپ کی منگیتر تھی، اب نہیں ہوں اور پلیز، اب آپ جا سکتے ہیں۔ میں گھر کی مضبوط چار دیواری میں نہیں ہوں جس کے اندر چادر پر کوئی میل نہیں آ سکتی۔ میں کھلے آسمان تلے کھڑی ہوں اور مجھے اپنی چادر کو میلا نہیں ہونے دینا۔'' وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بول رہی تھی۔

''تزئین! اس قدر بدگمان کیوں ہو رہی ہو، میں بنوں گا تمہاری چادر۔''

''جب بنیں گے، تب دیکھیں گے، ابھی آپ جا سکتے ہیں۔'' وہ تیزی سے خفگی بھرے لہجے میں بولی۔

''اوکے، میں تمہیں بن کر دکھاؤں گا پھر تمہیں معلوم ہوگا کہ میں اپنے قول کا کتنا پکا ہوں۔'' اس نے بیرونی دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

''آ جائیں فاطمہ بی! صرف دس منٹ میں، میں باہر گاڑی میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں، خدا حافظ۔''

جاتے جاتے وہ ذرا سا رک کر بولا تو اس کا دل چاہا لپک کر اسے روک لے، بازو تھام لے یا کم از کم اسے یوں ناراض ہو کر نہ جانے دے مگر اس وقت اس نے دل کی کسی بات کو نہ ماننے کی قسم کھا رکھی تھی۔

''فاطمہ بی آپ! السلام علیکم۔ آپ کو کہاں سے یاد آ گئی۔'' اندر آتی فاطمہ بی کو دیکھ کر اس کے دل کی کلی کھل اٹھی۔ وہ آگے بڑھ کر ان سے لپٹ گئی۔

''بھولی کب تھی بچے! بس مجبور ہوں۔ مالکوں کے تیور دیکھ کر بات کرنی پڑتی ہے۔ تم سناؤ، اچھی ہو؟'' وہ اس کے سر پر پیار کرتے ہوئے بولیں۔

''جی فاطمہ بی! بالکل اچھی، آپ کے سامنے۔'' وہ خوش دلی سے بولی۔

''خاک اچھی ہو، کس قدر کمزور ہو رہی ہو۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ چکے ہیں۔ کہا بھی تھا بڑے صاحب سے کم از کم تمہیں شادی میں بلا لیں۔''

''شا.... شادی کس کی؟'' وہ اٹک کر بولی۔

''ایں! سعد میاں نے نہیں بتایا، شفق کی شادی میں ہی تو سب لوگ آئے تھے۔ آج ولیمہ ہے، کل یہ لوگ واپس چلے جائیں گے۔'' اس کا دل جیسے بجھ کر راکھ کا ڈھیر بن گیا۔ نہ دھواں اٹھا، نہ شعلہ بھڑکا، بس راکھ ہی راکھ۔ فاطمہ بی اس کی شکل دیکھنے لگی۔

''اے بچی! میں مجبور ہو گئی تھی۔ وہ اوپر بیٹھا اللہ تو سب دیکھتا ہے نا۔ جو بھی عمل کرو، وہ پورا پورا تول رکھتا ہے اپنے پاس، چند دن اور گھر میں بٹھا لیتیں تو ساری عمر رسوائی کے چرچے اپنے کانوں سے سنتیں۔ ہاتھ پاؤں جوڑ کر لڑکے کو راضی کیا تھا، اس شادی پر اور جہیز کے نام پر آدھی جائیداد گھر، گاڑی سب کچھ تو دیا ہے۔ وہ تو اچھے خاصے غریب تھے۔ لڑکی کنویں میں جھونک دی۔ پر کیا کریں، عزت بچاتیں یا اس بے حیا کے نصیبوں کو روتیں۔ اللہ دنیا میں ہی دکھا دیتا ہے، کوئی سمجھے یا نہ سمجھے۔'' وہ سانس لینے کو رکی۔

''اچھا ہوا، تم نہیں آئیں۔ شادی تھوڑی تھی، کسی کا ماتم لگ رہا تھا۔ بے تحاشہ پیسہ برباد کرنے کے باوجود کوئی بھی دل سے خوش نہ تھا۔ سب مارے باندھے شامل ہوئے تھے۔ تمہاری پھوپھی کا مزاج الگ بگڑا ہوا تھا کہ اس گھر کی ساری لڑکیاں ہی ایک ڈگر پر چل نکلی ہیں۔ ماں باپ اندھے ہیں کیا، مگر کیا کریں۔ جب پہلے خوب آزادی دے لی، اس کا نتیجہ تو بھگتنا ہی تھا جو چند روز میں سب کچھ طے کیا۔ پانچواں تو لگنے کو تھا اس کمبخت کو۔'' فاطمہ بی کی بات پر اس نے ناسمجھی سے دیکھا۔

''اچھا میں تمہارے لیے کچھ چیزیں لائی ہوں، گاجر کا حلوہ کب کا بنا کر رکھا تھا، کون لے کر آتا۔ بادام اور چاروں مغز ڈالے ہیں اس میں۔ پڑھتی ہو، دماغ کے لیے اچھا ہے، کھا لینا۔''

انہوں نے ایک بند ٹفن اسے پکڑایا کہ باہر سے گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔

''اچھا بچے! چلتی ہوں۔ بڑی مہربانی کی سعد میاں نے جو لے آئے مجھے ادھر۔ تم سے ملنے کو ترس رہی تھی۔ اپنا خیال رکھا کرو، دیکھو کتنی کمزور ہو گئی ہو۔'' وہ محبت سے اسے ساتھ

لپٹا کر بولیں۔

"فاطمہ بی!" اس نے آہستگی سے کہا۔

"ہاں — بولا۔" وہ رک گئیں۔

"فاطمہ بی! سبین کا کوئی فون یا پیغام؟" وہ جھجکتے ہوئے پوچھ ہی بیٹھی۔ فاطمہ نے ٹھنڈا سانس لیا اور نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں بچے! ہوتا تو پہلے بتا دیتی۔ اللہ جانے اس کو زمین کھا گئی کہ آسمان، نگوڑ نے کچھ خبر ہی نہ دی۔ چلو اللہ خوش رکھے، جہاں بھی ہو۔ اللہ حافظ۔" وہ افسوس سے کہتی ہو باہر نکل گئیں تو وہ ہلتے پردے کو دیکھنے لگی۔

"کتنی کوشش کرتی ہوں سبین تمہیں بھلانے کی، پر کیا کروں، تمہیں تو میں ہنستی کھیلا آنکھوں کے سامنے چھوڑ کر گئی تھی۔ کیسے بھول جاؤں۔" اس نے آنکھوں میں آئی دھند کو ہاتھ سے رگڑا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔



تین دن بعد ہی ان کا رزلٹ آؤٹ ہو گیا۔ تزئین نے بی ایس سی تھرڈ ایئر میں ٹاپ کیا تھا۔ اس کی حیرت اور خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ امید تو اسے تھی کہ اس کے مارکس بہت اچھے آئیں گے مگر اتنے شاندار رزلٹ کی توقع اسے بہرحال نہیں تھی۔

خوشی جتنی بڑی تھی، غم اس سے سوا تھا کہ اپنی اس کامیابی کو کس کے ساتھ شیئر کرے۔ تایا ابو نے اسے شفق کی شادی کے بارے میں بتانا گوارا نہ کیا تھا۔ گھر لے جانے سے انکار کر دیا۔ وہ کس طرح انہیں اطلاع دیتی، ویسے بھی وہ فون پر کم ہی ملتے تھے اور کون تھا جس کو وہ اپنی خوشی کے بارے میں بتاتی۔ دل سے اک ہوک سی اٹھی سبین کو یاد کر کے۔ حالانکہ اس کے دل کو بڑی آس تھی کہ سعد کم از کم جانے سے پہلے ایک بار اس سے ضرور کانٹیکٹ کرے گا۔ اپنے برے سلوک کے باوجود۔ آج تو اس کے دل کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ اپنی خوشی کسی کے ساتھ شیئرز کرنا چاہتی تھی۔ اپنے اتنے قریبی رشتوں کے ہوتے ہوئے وہ تہی دامن تھی، ان کی محبتوں سے محروم۔ سارہ کی دلجوئی کے باوجود وہ بے طرح اداس تھی۔ چپ چاپ آ کر کمرے میں لیٹ گئی۔ اسے لیٹے ابھی کچھ دیر ہوئی تھی کہ چپڑاسی نے دروازے پر دستک دی۔

"یہ جی آپ کے لیے پارسل آیا ہے، مس تزئین ارتضیٰ!" اس نے پیکٹ پر لکھا اس کا نام پڑھتے ہوئے بتایا تو اس نے سائن کر کے پارسل لے لیا۔

"یہ بھلا کون بھیج سکتا ہے۔ آخر اتنا میرا اپنا کون ہے۔" پارسل کھولتے ہوئے وہ سوچنے لگی۔ سب سے اوپر مبارک باد کا خوبصورت کارڈ تھا۔ للی کے پھولوں کے درمیان رول کی ہوئی ڈگری کا عکس بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں کارڈ کو سراہتے ہوئے اسے کھولا۔

"کامیابی مبارک! جس قدر روکھا رویہ تمہارا ہے، اس کے بعد کوئی بھی شریف آدمی دوسری دفعہ تمہاری طرف مڑ کر دیکھنے کے لیے دس بار سوچے گا مغرور، سڑیل، تنک چڑھی حسینہ۔ لیکن اگر وہ شریف آدمی تم جیسی بے حس لڑکی کو اپنا دل بھی دے بیٹھا ہو تو پھر بے چارے کو اپنی انا اور مردانگی کی قبر پر روز پھول چڑھانا ہی پڑے گا۔

تم سے مل کر نکلا تو ایک چیز نہ جانے کیوں بار بار میرے ذہن میں کلک کرتی رہی، کچھ ادھورا پن...... کچھ ادھورا پن سا نظر آیا تھا۔ تمہارے چہرے پر۔ رات تک میں سوچتا رہا۔ اپنے سب کاموں اور مصروفیات کے دوران بھی۔ آخر رات کے ڈھائی بجے نیم غنودگی کے عالم میں مجھے یاد آیا کہ مجھے تمہارا چہرہ ادھورا سا کیوں لگا تھا۔ بہرحال آئندہ میں تمہارے چہرے کو ان کے بغیر نہیں دیکھنا چاہوں گا۔ امید ہے تم میری خواہش کا ضرور احترام کرو گی۔ بس اتنا سا تقاضا ہے میری پرخلوص محبت کا۔

فون کرنا چاہتا تھا، پھر دل میں سوچا سعد میاں، جتنی عزت بچی ہے، سو سمیٹ کر واپس چلو۔ آج رات میری فلائٹ ہے، مما شاید دو چار دن رہیں۔ میں جا رہا ہوں (بے شک میرا دل تمہارے قبضے میں ہے) پاس تو تم یقیناً ہو ہی چکی ہو گی۔ آج کل تمہارا رزلٹ بھی آ جائے گا۔ پیشگی گفٹ قبول کرو۔ ایک دن مما کے ساتھ آؤں گا، بڑے جلوس کی صورت۔ تمہیں اپنی ضد اور مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔"

تم سے ناراض
سعد راحیل

کارڈ کے اندر ہی خط رکھا تھا اور ساتھ ہی مخملیں ڈبیا ایک اور پیکٹ کے اندر جس

میں دو خوبصورت ڈائمنڈ لگے نازک سے ٹاپس تھے۔

"تو یہ تھا میرے چہرے کا ادھورا پن جو تمہیں محسوس ہوا۔ اس نے بے اختیاری سے اپنے دونوں کانوں کو چھوا۔

"تم اس حد تک مجھے Observe (مشاہدہ) کرتے ہو۔" وہ اس کے مشاہدے پر حیران رہ گئی۔ اس نے ٹاپس نکالے اور آئینے کے سامنے جا کر پہن کر دیکھنے لگی۔ جگر جگر کرتے ڈائمنڈز اس کی سنہری رنگت کو اور لو دینے لگے تھے۔ اس کے ہونٹ اور آنکھیں آپ ہی آپ مسکرانے لگیں۔

"ایک ذرا سی محبت، تھوڑی سی توجہ انسان کو اندر تک خوش کر دیتی ہے کہ اس خوشی کا عکس آئینہ بھی دیکھ سکتا ہے۔" اس نے آئینے میں اپنی مسکراتی شبیہہ کو دیکھا۔

دروازے کے باہر آہٹ سی ہوئی۔ اس نے جلدی سے ٹاپس اتارے اور بیڈ پر پڑے پیکٹ کو سمیٹ کر اپنی الماری کے دراز میں رکھ دیا۔ اس وقت وہ کسی بھی سوال جواب کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

اور شام کو عاصمہ کا سرپرائز۔

"میں چاچو کی سوزوکی لائی ہوں خود ڈرائیو کر کے۔ ہاں، ہاں تم لوگ بے یقینی سے کیوں دیکھ رہی ہو۔ میں بڑی زبردست ڈرائیور ہوں۔ لائسنس بھی ہے میرے پاس۔" وہ ان کے مذاق اڑاتے چہروں کو دیکھ کر بولی۔

"اچھا اب پی کو تیک۔ زیب اور شزا گاڑی میں ہی بیٹھی ہیں۔ چاچو نے صرف تین گھنٹوں کے لیے گاڑی دی ہے۔ تزئین جی ڈنر کے لیے ذرا لمبی رقم لے لیجئے گا۔" وہ سارہ کی ڈائننگ ٹیبل پر پڑا پرفیوم اٹھا کر خود پر اسپرے کرنے لگی۔

"ڈنر کے لیے میرے پاس کچھ نہیں، جسٹ فاسٹ فوڈ۔ ایک ایک برگر کولڈ ڈرنک کے ساتھ۔" میں نے کالج میں ٹاپ کیا ہے۔ اسٹیٹ بینک میں میری نوکری پکی نہیں ہوئی۔"

"بہت کنجوس ہے یہ ایمان سے۔ ویسے مجھے اس کے کمینے پن کا پہلے ہی علم تھا۔ ڈنر میں کراؤں گی، تم بس اتنی عنایت کرو کہ جلدی چلو۔" دونوں کو تقریباً باہر دھکیلتے ہوئے بولی۔

عاصمہ واقعی اچھی ڈرائیونگ کر لیتی تھی۔

"ساڈوں وی لے چل نال وے باؤ سوہنی گڈی والے آ۔" شزا چٹکیوں کے ساتھ گنگنانے لگی۔

مال کی خوبصورت سڑکیں، بائیں طرف گھنے گھنے بے تحاشا درختوں میں گھرا لارنس گارڈن اور چڑیا گھر اور دوسری طرف بلند و بالا عمارات اور ہوٹلز، اور ڈھلتی شام کے سائے، دوستوں کی بھرپور کمپنی۔ بہت دنوں بعد تزئین کا دل اس قدر خوش اور مطمئن تھا۔

وہ پانچوں آئس کریم کھاتے ہوئے پاٹو راما سینٹر سے باہر نکلیں، جب دائیں طرف سے تایا ابو کی فیملی بمع پھپھو کے آتے دیکھ کر اس کے قدم ٹھٹک کر رہ گئے۔ وہ چاروں کسی بات پر قہقہے لگا رہی تھیں، اس کے قدم اپنی جگہ گم ہو کر رہ گئے۔ تائی امی کی طنزیہ نگاہوں میں بہت کچھ تھا اور ان کے ساتھ کھڑے تایا ابو کی نگاہوں میں غصہ۔ ان کے پیچھے عاشو اور ثمینہ پھپھو تھیں۔

"دیکھ لیجئے لچھن نیک پروین کے۔ چاہے ہاسٹل بھیجو، چاہے کالے پانی، یہ اپنے لچھن نہ چھوڑیں گی۔ آوارگی کا عالم دیکھا، تائی امی کی آواز اتنی بلند ضرور تھی کہ اس کے علاوہ پاس سے گزرتے دو چار لوگوں نے بھی بخوبی سن لی۔ تایا ابو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھپھو کی نظروں میں پہچان کی ہلکی سی بھی رمق نہ تھی۔ چاروں اسے گویا پیروں تلے روندتے ہوئے پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھ گئے۔

"ارے تزئین یار! کیا پتھر کی ہو گئی ہو، آ بھی جاؤ۔ ہم نے برگرز اور کولڈ ڈرنکس کا آرڈر دے دیا ہے۔ فیروز سنز کے ساتھ والی بند شاپ کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر کھائیں گے اور مال کی رونقوں سے لطف اٹھائیں گے۔" عاصمہ اسے دیکھ کر تقریباً دوڑتی ہوئی واپس آئی تھی۔ اس کا کندھا ہلا کر بولی۔

"ہاں، چلو۔" وہ گھٹے گھٹے لہجے میں بولی۔

"کیا بات ہے، آر یو آل رائٹ؟ آئس کریم بھی نہیں کھائی تم نے ساری پگھل گئی۔"

"ہاں پگھل گئی، آئس کریم بھی نا۔" اس نے کپ سامنے پڑے ڈسٹ بین میں

اچھال دیا اور عاصمہ کے ساتھ چل پڑی۔

"کیا میرے نصیب میں کوئی بھی خوشی مکمل شکل میں نہیں آسکتی۔ ہر خوشی کے ساتھ ہول ضرور لگے ہوتے ہیں۔" مرے مرے قدموں سے عاصمہ کے ساتھ چلتے ہوئے بے بسی سے سامنے شاپنگ مال کی جگمگ کرتی روشنیوں کو دیکھ رہی تھی۔



تایا ابو نے ابھی بھی فون نہیں کیا تھا۔ اب وہ اس سے راضی تھے یا بہت ناراض، اسے کچھ اندازہ نہیں تھا۔ لیکن اب اس کا تایا ابو سے بات کرنا لازم ہو گیا تھا۔ کالج میں موسم گرما کی تعطیلات ہو رہی تھیں تین ماہ کے لیے۔ ظاہر ہے کالج بھی بند اور ہاسٹل بھی، تو وہ کہاں جائے گی۔ کئی بار تایا ابو کے آفس فون کیا اور فیکٹری بھی، موبائل ان کا اکثر آف ہی رہتا تھا۔ اب وہ بہت فکرمند تھی۔

"دیکھو تزئین! تم اپنے انکل سے بات کرو، کہیں پہلے کی طرح تم یہاں اکیلی رہ جاؤ۔ اب تو یہاں کوئی بھی نہیں ہوگا۔ اگر وہ تمہیں نہیں لے کر جاتے تو تم میرے ساتھ چلو۔ مجھے یا میرے گھر والوں کو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔" سارہ اس کی پریشان صورت دیکھ کر بولی۔

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ میں چلی جاؤں گی۔ بس ایک بار تایا ابو سے بات ہو جائے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ لوگ تم سے اس طرح کا رویہ کیوں رکھتے ہیں، لیکن یہ تو کوئی ایسا جرم نہیں کہ کسی کو گھر سے ہی نکال دیا جائے۔" سارہ حیرت سے کہہ رہی تھی۔

"ہیلو، ہیلو تایا ابو! میں تزئین۔ کئی دنوں سے آپ کو فون کر رہی ہوں۔"

معجزانہ طور پر آج اس کی بات ہو ہی گئی۔

"اچھا مجھے پیغام نہیں ملا خیریت تھی؟"

"جی تایا ابو۔ تایا ابو! آج کالج میں چھٹیاں ہو رہی ہیں نا، عاشو نے بتایا ہوگا آپ کو۔ تایا ابو مجھے...... مجھے گھر آنا ہے۔ سامان میں نے باندھ لیا ہے، میں آ جاؤں نا۔" وہ ڈرتے ڈرتے بولی مبادا وہ انکار نہ کر دیں۔

"آں...... ہاں نہیں۔ تم ایسے کرو، تم ذرا ٹھہرا ادھر ہی، میں تمہیں پندرہ منٹ بعد

فون کر کے بتاتا ہوں۔" وہ کچھ سوچ کر بولے۔ شاید انہیں گھر فون کرنا تھا۔

"جی تایا ابو! اگر آپ کا فون نہ آیا تو میں آدھے گھنٹے میں آ جاؤں گی کیونکہ ہاسٹل تو سارا خالی ہو چکا ہے۔" اس نے فون بند کرنے سے پہلے بتا دیا۔

"تم وہیں انتظار کرو، میں تمہیں فون کرتا ہوں۔" انہوں نے فون بند کر دیا۔ وہ بیٹھے بیٹھے تھک گئی تھی۔ جب پچیسویں منٹ میں ان کا فون آیا۔

"ہیلو تزئین! تم آ جاؤ گھر۔ مگر گھر کے پچھلے گیٹ پر اترنا۔ تمہیں نواز اور فاطمہ وہیں ملیں گے۔ وہ تمہارا سامان اوپر والے کمرے میں جو پرانے گیسٹ روم کے ساتھ ہے، ادھر پہنچا دیں گے۔ تم اوپر ہی رہو گی۔ اسٹور صاف کر کے تھوڑا بہت کچن کا سامان فاطمہ بی ادھر پہنچا دیں گی اور آنے جانے کے لیے بھی تم پچھلا راستہ ہی استعمال کرو گی۔ تمہاری تائی امی صرف اسی شرط پر مانی ہیں اور...... میں مجبور ہوں۔ تم سمجھ سکتی ہو اور ویسے بھی میرا خیال ہے یہی زیادہ صحیح ہے۔ نہ تم ان کے سامنے آؤ گی نہ وہ واویلا کریں گی، سمجھ گئی نا۔ جاؤ پھر تم۔" انہوں نے اس کا جواب سنے بغیر فون بند کر دیا۔

"تو اب یہ میری سزا ہوگی۔" سامان اٹھاتے ہوئے وہ خود سے بولی۔ "تنہائی، خاموشی اور سب سے بڑھ کر الگ تھلگ۔" وہ تھکے تھکے قدموں سے گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔



سب کچھ ویسے ہی ہوا جیسے تایا ابو نے اسے بتایا تھا۔ اسے پچھلے گیٹ سے ہی مع سامان...... اوپر پہنچا دیا گیا۔ اسٹور کو کچن کی شکل دے دی گئی تھی۔ بس گزارنے کے لیے دو چار برتن، ایک سنگل چولہا، چھوٹی چھوٹی گھر کی ناکارہ و پرانی ڈبیوں میں نمک مرچ وغیرہ موجود تھے۔

"باقی اور جس چیز کی ضرورت ہوگی، میں شام کو لے آؤں گی۔ تم مجھے بتا دینا اور معاف کرنا تزئین بیٹا! میں زیادہ سیڑھیاں نہیں چڑھ سکتی۔ تمہیں تو معلوم ہے۔" فاطمہ بی بولیں۔

"اور فاطمہ بی! مجھے سیڑھیاں اترنے کا حکم نہیں۔" وہ بھی جواباً بولی۔

"یہی تو بات ہے، بڑی بیگم صاحبہ کے دماغ میں خدا جانے کیا بات سما گئی ہے۔ تم اب آرام کرو، میں کھانا نیچے ہی سے کسی ملازم کے ہاتھ گھنٹے بعد بھجوا دوں گی اور بیگم صاحبہ سے کہوں گی، اگر اجازت دیں تو شہیر صاحب کے کمرے میں جو چھوٹا فرج پڑا ہے، وہ اوپر بھیج دیں۔ اس قدر گرمی میں نلکے کا کھولتا پانی تو نہیں پی سکو گی نا۔" وہ ہمدردی سے بولیں۔

"جو کچھ میرے ساتھ ہو رہا ہے، اس کی جلن تپتے پانی سے زیادہ ہے۔" وہ سرد آہ بھر کر کمرے کی طرف مڑ گئی۔

سنگل بیڈ جس پر گھر کی سب سے پرانی بیڈ شیٹ بچھی تھی۔ ایک کرسی اور ایک میز کمرے کا فرنیچر تھا۔ شکر ہے الماری موجود ہے اور میں۔ اس نے بیگ کی زپ کھول کر کپڑے الماری میں سیٹ کرنے شروع کیے۔ دوپہر سے شام ہونے کو آئی مگر فاطمہ بی کا کھانا نہ آ سکا۔ نہا کر اس نے کچھ دیر آرام بھی کر لیا۔ اب خالی پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے پھر اوپر کے پورشن میں اچھی خاصی گرمی تھی۔ نیچے تو اے سی چل رہے تھے۔ وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔ ہر چیز کو جیسے بخار ہو رہا تھا۔ شام کے چار بجنے کو تھے، گرمی اپنے عروج پر تھی۔ آخر دس منٹ کے لاحاصل انتظار کے بعد وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ برآمدے کے آگے سیڑھیاں تھیں۔ اس نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا کہ فاطمہ بی ہاتھوں میں ٹرے اٹھائے اوپر آتی نظر آئیں۔ تھکن ان کے بوڑھے چہرے سے ہویدا تھی۔ تزئین کو شرمندگی سی ہوئی۔

"میں آ رہی تھی فاطمہ بی!" اس نے آگے بڑھ کر ٹرے تھام لی۔

"کیوں پیٹرول کو جلتی تیلی دکھاتی ہے، وہ پہلے ہی دوپہر سے دس بار چیخ چیخ کر مجھے سمجھا چکی ہیں۔ اگر سیڑھیوں کی طرف کوئی بھی گیا، نوکری سے نکال دوں گی، ساری عمر کی خدمت کا بھی لحاظ نہ رکھیں گی۔" فاطمہ بی وہیں تیسری سیڑھی پر بیٹھ گئیں۔

"اگر اوپر کچھ ہوتا تو میں اوپر ہی پکا لیتی۔" وہ بے چارگی سے بولی۔ "تایا ابو آ گئے؟"

"کب سے۔ دوپہر کا کھانا ان لوگوں نے لیٹ کھایا تھا، اسی لیے دیر ہو گئی۔" فاطمہ بی قمیص کے دامن سے پسینہ خشک کرنے لگیں۔

"مجھے تایا ابو سے ملنا بھی تھا۔ انہوں نے میرا پوچھا نہیں؟"

"نہیں۔" فاطمہ بی کچھ توقف سے بولیں تو اسے یونہی شرمندگی سی ہوئی۔

"ایک گھنٹے تک بڑی بیگم صاحبہ اور عاشو کہیں جائیں گی، شاید بازار جانا ہے اور کسی سے ملنے بھی، رات تک آئیں گی۔ تم نیچے آ جانا۔ صاحب سے مل لینا۔ دوسرے کچن سے ضروری سامان اوپر لے آنا۔ چاول، دالیں، گوشت، سبزی وغیرہ۔ ایسے تو بیگم صاحبہ کچھ نہیں بھیجیں گی اور بار بار اوپر کھانا لانا بھی مشکل ہے۔ تمہاری چھٹیاں کتنے مہینوں کی ہیں۔"

"تین مہینے۔" اس کے حلق میں نوالہ پھنسنے لگا۔

"کافی دن ہیں، اس لیے اوپر ہی پکا لیا کرنا۔ اچھا میں چلتی ہوں اور ذرا دو چار سیڑھیاں نیچے آ جاؤ۔ ٹھنڈے پانی کی بوتل رکھی ہے، وہ آ کر لے جاؤ۔" کہتے ہوئے وہ سیڑھیاں اترنے لگیں۔ ٹھنڈے پانی کی اسے بھی بہت طلب ہو رہی تھی۔ وہ جا کر پانی لے آئی۔

پھر کافی دیر تک وہ تائی امی اور عاشو کے جانے کا انتظار کرتی رہی۔ وہیں ٹیرس سے گاڑی اسٹارٹ ہونے اور جانے کی آواز چھ بجے کے قریب آ گئی اور دس منٹ بعد وہ نیچے اتر آئی۔ تایا ابو لاؤنج ہی میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ اسے دیکھ کر بھی ان کے تاثرات نارمل تھے۔ وہ البتہ انہیں دیکھ کر حیران رہ گئی۔

تایا ابو بالکل سوکھ کر ڈھانچہ ہو رہے تھے۔ حالانکہ تقریباً دو سوا دو ماہ پہلے جب وہ اس سے ملنے آئے تو ان کی صحت ٹھیک ٹھاک تھی۔ آج تو وہ اسے بہت کمزور لگے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔ ہاتھوں کی رگیں تک ابھری ہوئی تھیں، وہ سلام کر کے ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ وہ پھر سے اخبار پڑھنے لگے۔ فاطمہ بی نے چائے کی ٹرے ان کے آگے ٹیبل پر رکھی۔

"کوئی مسئلہ تو نہیں اوپر؟" چند منٹ بعد انہیں خیال آیا۔

"جی نہیں۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"رات کو دس بجے سے لے کر تقریباً ساڑھے گیارہ بجے تک میں اسٹڈی میں ہوتا ہوں اگر کوئی بات کرنی ہو تو ادھر آ جایا کرو۔" وہ چند لمحوں بعد بولے۔

"تمہاری تائی امی کا مزاج بگڑ جاتا ہے۔ گھر کا ماحول خوشگوار رکھنے کے لیے یہ

سب کرنا پڑتا ہے۔" وہ بہت آہستہ بول رہے تھے جیسے خود سے باتیں کر رہے ہوں۔

"تایا ابو! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" وہ ان کی بات ان سنی کرتے ہوئے بولی۔

"آں!" وہ جیسے ان کی بات پر چونک گئے "تمہیں یہ خیال کیسے آیا۔"

"آپ بہت کمزور ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹر کو دکھائیں۔" وہ فکرمندی سے بولی۔

"ٹھیک ہوں میں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔"

"صاحب جی! اوپر گرمی بہت ہے اور بار بار ٹھنڈے پانی کے لیے مجھے اوپر جانا پڑتا ہے۔" فاطمہ بی شکر دانی رکھنے آئی تو بولیں۔ "وہ شہیر صاحب کے کمرے میں چھوٹا فرج ہے کہیں تو۔"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ نواز کو بلا کر کہو، وہ کمرے سے فرج اٹھا کر اوپر رکھ آئے۔" وہ سر ہلا کر بولے۔

"اچھا بھلا تمہارا کمرہ نیچے ہے، وہ خود دماغ عورت سمجھتی نہیں۔ بھلا اس سے کیا ہوتا ہے جو گل کھلنے تھے، وہ تو کھل کر ہی رہے۔" وہ دھیرے سے بڑبڑائے۔

"شہیر چلا گیا ہے امریکہ، ماں کی طرح ضدی، نہیں مانی میری بات۔ کتنا کہا ادھر رہ کر پڑھو، تعلیم مکمل کرو، میرے ساتھ ہاتھ بٹاؤ۔ اور اب تین ماہ ہونے کو آئے، دوائی میلو اور چار فون کالز کے علاوہ اس نے کوئی خبر نہیں دی اور اب دیکھو سب کچھ ختم ہونے کو ہے۔ فیکٹری میں کچھ نہیں، مشینری سب بے کار پڑی ہیں۔ مال کہاں سے تیار ہو۔ کاریگر بھاگ رہے..... اب کیا ہوگا۔"

وہ پھر خود سے باتیں کر رہے تھے۔ تزئین کو ان کی دماغی حالت ٹھیک نہیں لگی۔ اسے خوف سا آنے لگا۔ اس نے ڈری ہوئی نظروں سے انہیں دیکھا۔ وہ کہیں کھوئے ہوئے تھے۔

"تایا ابو! چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" اس نے انہیں متوجہ کیا۔

"ہاں، آں۔" وہ کسی خیال سے چونکے۔ انہوں نے کپ تھام لیا۔

"پتا ہے تزئین! کبھی کبھی انسان سے کوئی ایسا گناہ سرزد ہو جاتا ہے کہ پھر وہ گناہ

اس کی ساری عمر کے نیک اعمال کی فصل ہڑپ کر جاتا ہے۔ انسان اس گناہ کے اعتراف سے گریزاں رہتا ہے۔ ایسے انسان نہ تو خدا کی مغفرت کے اہل ہوتے ہیں، نہ انسانوں کی محبت کے۔ ہے نا۔"

"میں سمجھی نہیں۔" وہ کچھ گھبرا کر بولی۔

"جب تم سمجھو گی تو شاید مجھ جیسے انسان پر تھوکو گی۔ دنیا میں مکافاتِ عمل بھی ہوتا ہے، اس کی بہترین مثال تمہیں اس گھر کے علاوہ کہیں نہ ملے گی۔ مجھے ذرا جانا ہے، تمہیں جو ضرورت کا سامان چاہیے ہو لے جاؤ اور اگر کچھ بازار سے منگوانا ہو تو وہ بھی نواز سے کہہ دو لا دے گا۔" وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے، بات ادھوری چھوڑ کر۔

ان کے جاتے ہی وہ بھی اوپر آ گئی۔ فاطمہ بی! رضیہ کے ساتھ کچن میں سامان سیٹ کر رہی تھیں۔ کمرے میں فرج رکھ دیا گیا تھا۔ وہ باہر ٹیرس پر آ کر ٹہلنے لگی۔

"سامان سیٹ ہو گیا ہے اور جس چیز کی ضرورت ہو بتا دینا، فرج میں گوشت، سبزی بھی ہے اور انڈے وغیرہ بھی۔ باقی روز کا دودھ میں رضیہ کے ہاتھ بھجوا دیا کروں گی، ٹھیک ہے پھر میں چلتی ہوں"

"فاطمہ بی! آپ کا شکریہ۔ آپ اتنا خیال رکھتی ہیں میرا۔"

"بچے! میں قرض دار ہوں تیری، تیرے باپ کی۔ اگر اس خدمت سے کچھ قرض ادا ہو جائے تو اچھا ہے۔"

"کیا مطلب؟" وہ ایک بار پھر الجھ گئی۔

"کچھ مطلب نہیں، بہت سی بے مطلب باتیں اپنے اندر بڑے دکھ رکھتی ہیں اور اللہ نہ کرے تجھے کوئی دکھ ملے۔"

"جو کچھ میرے ساتھ ہو رہا ہے، اس سے بھی بڑے دکھ ہوتے ہیں فاطمہ بی!"

"گناہ سے بڑا کوئی دکھ نہیں بچے!"

"فاطمہ بی! مجھے ایک بات بتائیں گی؟" وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر بیرس کی طرف لے آئی۔ "فاطمہ بی! تایا ابو کو کیا ہوا ہے۔"

فاطمہ بی نے سر اٹھا کر دیکھا۔

"کیوں، کیا ہوا ہے؟"

"آپ نے دیکھا نہیں، وہ کس قدر کمزور ہو رہے ہیں، ان کا رنگ کتنا خراب ہو گیا ہے اور کتنے چپ چپ سے ہیں۔"

"ہاں بچے! چپ چپ کیوں نہ ہوں۔ قیامت ٹوٹی ہے ان پر۔"

"کیا مطلب؟"

"شفق بی بی کا رشتہ دونوں میاں بیوی نے اس لفنگے کے آگے ہاتھ پیر جوڑ کر کر دیا، بیٹی ہاتھوں سے نکل جا رہی تھی تو عزت بھی گھڑی بھر کی مہمان لگتی تھی اور وہ کمبخت قابو نہیں آ رہا تھا۔ آخر تھک ہار کر صاحب جی نے فیکٹری شفق کے نام لگا دی۔ ایک گھر لے کر دیا بڑے مہنگے علاقے میں اور دس لاکھ کی گاڑی بھی اور دونوں سال بھر کے لیے باہر چلے گئے ہیں۔ بیگم صاحب نے اپنے خرچ پر بھجوایا ہے کہ جب واپس آئیں تو کسی کو پتا نہ چلے کہ بچہ چھ ماہ کا ہے یا آٹھ کا، سب کچھ لگا دیا اس جوئے میں۔ صاحب سب کچھ ہار گئے۔ اب یہ گھر ہی بچا ہے یا تھوڑا بہت بینک میں پیسہ ہے جس سے چھوٹا موٹا کام چلا رہے ہیں۔ چھوٹے صاحب بھی رسیاں تڑا کر بھاگ گئے ہیں۔ ساری اولاد ہی ایک جیسی نکلی، بے حس اور نافرمان۔ تمہارے تایا ابو کی تو یہ حالت ہونی تھی۔" فاطمہ بی نے گویا انکشاف کیا۔

"مکافات عمل اسی کو کہتے ہیں۔" اس کے کانوں میں کچھ دیر پہلے کی کہی تایا ابو کی بات گونجی۔

"صاحب تو جیسے اندر سے نچڑ کر رہ گئے ہیں۔ بیگم صاحب اپنی ہٹ پر قائم ہیں، اسی ضد میں انہیں کچھ خبر نہیں کہ چھوٹی والی کدھر جا رہی ہے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

"کیا مطلب عاشو کیا؟"

"کہنے کی تو بات نہیں، ماں کو تو جوان بیٹی کی خبر رکھنی چاہیے۔ ابھی تو ایک ٹھوکر سے بیگم سنبھلیں نہیں ہیں۔ اچھا میں چلتی ہوں، رات کے کھانے کی بھی تیاری کرنی ہے۔"

وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھیں۔

پھر بہت سارے دن چپ چاپ گزر گئے اور وہ کوشش کے باوجود دوبارہ تایا ابو سے ملنے نہ جا سکی۔ اس کا حوصلہ ہی نہ پڑتا تھا ان کی حالت دیکھنے کا۔ جب گھر میں مہمان

آتے تو کھانوں کی خوشبوئیں، تائی امی کی پاٹ دار آواز، عاشو کے قہقہے اسے اپنی تنہائی اور اکیلے پن کا اور بھی احساس دلاتے۔ اکیلے بیٹھ کر اپنے لیے پکانا اور پھر کھانا اسے دشوار ہو جاتا۔ ایسے میں اسے صرف کتابیں یاد آتیں۔ اس کی چھٹیاں ختم ہونے میں ابھی ایک ماہ تھا۔ اس نے اپنا تمام کورس دہرا بھی لیا تھا۔

گرمی کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ اب تو اکثر و بیشتر بارش ہونے لگتی۔ جس کی وجہ سے رات کا موسم کافی بہتر ہو جاتا تھا۔

"آپ کو بڑے صاحب بلا رہے ہیں کتابوں کے کمرے میں۔" رات کے ساڑھے گیارہ بجے وہ سونے کا ارادہ کر رہی تھی کہ رضیہ نے آ کر اسے پیغام دیا۔

"تایا ابو نے بھلا کیوں بلوایا ہے؟" وہ سوچتے ہوئے نیچے آ گئی۔ نیچے مکمل خاموشی تھی۔

"السلام علیکم تایا ابو!" وہ کسی کتاب میں گم تھے۔

"وعلیکم السلام۔ آؤ بیٹھو۔"

انہوں نے سر اٹھا کر اسے بغور دیکھا۔ عینک اتار کر ٹیبل پر رکھ دی۔ وہ ان کے پاس پڑی دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ تایا ابو پہلے سے بھی زیادہ کمزور ہو چکے تھے اور فاطمہ بی نے بتایا تھا وہ آج کل آفس بھی نہیں جا رہے۔ تائی امی سے بھی آج کل خوب لڑائیاں ہو رہی تھیں۔ اس نے ان کی جھکی نظروں، ہاتھوں کی لرزش کو دیکھا، ان کے پاؤں سوجے ہوئے تھے۔

"تایا ابو کو کوئی بیماری تو نہیں لگ گئی۔" اس نے فکرمندی سے سوچا۔

"ٹھیک تو ہو نا، کوئی مسئلہ تو نہیں؟" چند لمحوں بعد انہوں نے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں تایا ابو! کوئی مسئلہ نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔"

"نہیں تایا ابو! فاطمہ بی خیال رکھتی ہیں۔" وہ چپ ہو گئے۔

"بیٹا! میں تم سے شرمندہ ہوں بہت زیادہ۔" ان کی آواز اسے دور سے آتی محسوس ہوئی۔

"کیوں تایا ابو؟"

''پتا نہیں کیوں جب ہم زندگی کو دوسروں کی آنکھ سے دیکھنا اور دوسروں کی سوچ کے مطابق برتنا شروع کر دیتے ہیں تو پھر ہمارے ضمیر سو جاتے ہیں اتنی گہری نیند کہ شاید مر ہی جاتے ہیں اور میں نے پڑھا تھا کہ جن لوگوں کے ضمیر مر جاتے ہیں، وہ جسموں کی قبروں میں زندہ رہتے ہیں تو تم کہو میں اپنے جسم کی قبر میں زندہ ہوں۔ کئی سالوں سے، اور میں اس قبر کو زندگی دے سکتا تھا مگر میں نے کوشش نہیں کی۔ کبھی اس مردہ زندگی کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔ میں دوسروں کی آنکھ سے دیکھتا رہا، سوچتا رہا اور اپنے لیے آگے گڑھے کھودتا رہا۔''

آدھی رات کا پہر اور تایا ابو کی گفتگو۔ اس نے کچھ ہول کر انہیں دیکھا۔ ان کا چہرہ تاریک سا ہو رہا تھا اور آنکھوں میں عجیب سی دہشت جھلک رہی تھی۔

''تمہیں پتا ہے نا، یہ زندگی چند روزہ ہے اور جو لوگ اس چند روزہ زندگی کے فائدوں کے پیچھے دیوانہ وار دوڑتے ہیں، وہ اکثر اسے حاصل تو کر لیتے ہیں مگر یہ فائدے یہیں رہ جاتے ہیں اور وہ برے اعمالوں کے ساتھ لافانی حیات کا حصہ بن جاتے ہیں جس میں پھر ان کے لیے کوئی آرام کوئی آسائش، کوئی مزہ نہیں ہوتا۔'' وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہے تھے۔

''تمہاری یہ چند سالوں کی تکلیف انشاء اللہ تمہاری آئندہ زندگی کو بہت خوبصورت بنا دے گی۔ تزئین بیٹا! مجھے تم پر فخر ہے۔'' اتنا حیران کن اور اتنا خوبصورت جملہ اس کی زندگی میں اتنی جلدی آ گیا، اس نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔

''یس آئی ایم ریئلی پراؤڈ آف یو۔'' انہوں نے مسکرا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''تم نے ایک مشکل زندگی گزاری ہے، اب زندگی تمہیں کسی بات سے نہیں ڈرا سکتی۔ تم سوتو نہیں رہی تھیں؟'' انہیں اچانک خیال آیا۔

''نہیں تایا ابو!''

''تمہارے کالج کب کھلیں گے۔''

''ابھی تو بیس پچیس دن ہیں۔''

''تمہیں شاید اب ادھر ہی رہنا پڑے۔ ہاسٹل نہ جانا۔'' وہ کچھ سوچ کر بولے۔

''کیوں تایا ابو۔''

''میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا بہر حال، اور یہ موقع آئے تو میرا مشورہ ہے تم اوپر ہی

رو لینا، یہ زیادہ بہتر ہے۔'' اور وہ تو پہلے ہی گن گن کر دن گزار رہی تھی کہ اس تنہائی کے عذاب سے اس کی جان چھوٹے۔

''اب تم جاؤ، میں آرام کروں گا۔'' وہ بولے تو تزئین اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تزئین!'' وہ جانے لگی تو انہوں نے پکارا۔

''جی تایا ابو!'' وہ مڑی۔

''تزئین! اگر کبھی تمہیں یمین ملے تو اسے معاف کر دینا۔ اس سے مل لینا۔ میں نے تمہیں اپنی قسم سے آزاد کیا۔'' ان کی بات اس قدر اچانک تھی کہ وہ کھڑی رہ گئی۔

''تایا ابو!''

''ہاں بیٹا! کئی معاملے جو تقدیر کا حصہ ہوتے ہیں، ہماری سمجھ اور ہمارے اختیار سے باہر ہوتے ہیں، بس وہ ہو جاتے ہیں۔ یہ یمین کی تقدیر کا حصہ تھا جو ہونا ہی تھا۔ اب تم جاؤ شب بخیر۔''

وہ اٹھ کر کتاب ریک میں رکھنے لگے تو وہ باہر نکل آئی۔

''تایا ابو نے یہ کیوں کہا؟'' رات بھر اس سوچ نے اس کی نیند کو بے چین ہی رکھا۔

صبح ہونے کو تھی جب فاطمہ بی نے اسے جھنجوڑ کر اٹھایا۔

''تزئین! تزئین! اٹھو۔'' وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ فاطمہ بی کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔

''کیا ہوا فاطمہ بی! خیریت تو ہے؟'' اس نے بمشکل آنکھیں کھول کر گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔

''بڑے صاحب تمہارے تایا گزر گئے۔'' وہ روتے ہوئے بولیں تو تزئین کی چیخ نکل گئی۔ فاطمہ بی نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

''نہیں، نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے، ابھی رات کو تو۔'' وہ زور زور سے رونے لگی۔

''ڈاکٹر آیا تھا۔ ہاسپٹل لے جانے کی مہلت ہی نہ ملی، ہائے، قیامت نے اس گھر کو تاک لیا ہے۔ تم آ جاؤ نیچے ابھی لوگ آنا شروع ہو جائیں گے۔'' فاطمہ بی سسکیاں بھرتی سیڑھیوں کی طرف بڑھیں تو وہ بھی روتی ہوئی ان کے پیچھے چل پڑی۔

○

پھر سارا خاندان اکٹھا ہوا اور تایا ابو خاموشی سے گھر سے چلے گئے۔ "اسی لیے شاید انہوں نے مجھ سے اتنی باتیں کی تھیں۔"

کلام پاک پڑھتے ہوئے بار بار ان کا افسردہ چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آتا تو آنسوؤں سے اس کا چہرہ بھیگ جاتا۔

ثمینہ پھپھو بہت روئی تھیں اور سعد تیسرے دن ہی چلا گیا تھا۔

"میرے ایگزام ہیں ورنہ چند دن اور ٹھہرتا۔" وہ اس کے پاس بس چند لمحے کو ہی رکا تھا۔ وہ سر جھکا کر بیٹھی رہی۔

"ترئین! جو لوگ محبتوں کی قدر نہیں کرتے پھر محبتیں بھی ان سے روٹھ جاتی ہیں۔ تم نے تاپس نہیں پہنے۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے یہ یک طرفہ جذبے مجھے نڈھال کر دیں گے اور تمہیں خبر بھی نہ ہوگی۔" کہہ کر وہ تیز قدموں سے چلتا باہر نکل گیا تھا۔

وہ اسے بھی ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی مگر اسے راضی رکھنا بھی تو اس کے اختیار میں نہ تھا۔ اس نے ڈرز دیدہ نظروں سے پھپھو کی طرف دیکھا جو اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھیں۔

اور تیسرے دن ابھی سوئم ختم ہوا تھا، جب تائی ای اسی موڈ میں اس کے پاس آئیں۔

"اٹھو اور دفع ہو جا یہاں سے۔ میں مزید تیرا وجود یہاں برداشت نہیں کر سکتی۔" انہوں نے اسے نفرت سے گھورتے ہوئے کہا۔ وہ چپکے سے اٹھ کر اوپر آ گئی۔ راستے میں اسے شفق نظر آئی۔ اس نے ایک طنزیہ سی نظر ترئین پر ڈالی۔

"کس قدر ڈھیٹ ہو جو ابھی تک ہماری جان نہیں چھوڑ رہیں۔" اس نے براہ راست اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ اس نے کچھ جواب نہ دیا اور اوپر آ گئی۔

"میں اب یہاں کیسے رہوں گی۔" اوپر آ کر وہ بے اختیار رونے لگی۔

کسی کو بھی اس کی پروا نہ تھی۔ وہ دوبارہ نیچے ہی نہ گئی۔ فاطمہ بی دو چار دفعہ اوپر آئیں، ضرورت کا کچھ سامان دینے۔ وہ چپ چاپ ان کی شکل دیکھے جاتی۔

"بچی! صبر کر، اوپر اللہ تو دیکھ رہا ہے۔" اس کی حالت دیکھ کر وہ کہتیں۔

اس کے کالج کھل گئے تھے۔

"فاطمہ بی! میں ہاسٹل جا رہی ہوں کل۔" اس نے اطلاع دیتے ہوئے کہا۔

"بچی! ادھر کی فیس کون بھرے گا اب۔ تمہارے تایا مجھ سے کہہ گئے تھے کہ میں تم سے کہہ دوں۔ تمہارے کالج کی فیس کے لیے وہ مجھے چیک لکھ کر دے گئے۔ وہ تم نواز کے ساتھ جا کر کیش کرا لینا۔ کہتے تھے رقم اتنی ہے کہ تم کالج فیس اور دوسری ضرورتیں پوری کر سکتی ہو۔ ہاسٹل کی فیس بچا لو گی تو اگر آگے پڑھنا چاہو گی تو اس کے لیے کام آئے گی اور گھر کے حالات تو تم سے پوشیدہ نہیں۔ شبیر میاں نہیں آئے۔ آج تک ایک دھیلا نہیں بھیجا۔ فیکٹری وہ مودا داماد لے گیا۔ اس جوئے باز نے بیچ بھی ڈالی۔ ساری رقم اپنے بینک میں ڈال لی۔ اب عیش کر رہا ہوگا۔ دیکھا ہے نا تم نے شفق کو ذرا جو اسے شرمندگی ہو اب گھر کا انتظام کیسے چلے گا اللہ ہی جانے۔ اب تو جو سب بیگم صاحب کے پاس اپنا روپیہ، زیور ہے اور بس۔ آدھا دن تو کالج میں گزار ہی آیا کرو گی، شام تک پڑھنا اور رات کو سونا۔ اب اتنی تنہائی محسوس نہیں ہو گی۔" فاطمہ بی کی باتیں اس کی سمجھ میں آ گئیں۔ نواز کے ساتھ جا کر ایک مہینے بعد تایا ابو کے دیے دو چیکس میں سے ایک اس نے کیش کرا لیا۔

بہر حال وہ اس کے لیے اتنی رقم چھوڑ گئے تھے کہ وہ باآسانی پڑھ سکتی تھی۔ اس کے دل نے ایک بار پھر ان کی مغفرت کی دعا کی۔

نیچے اب کیا ہو رہا ہے۔ اسے کچھ خبر نہ ہوتی تھی۔ پچھلے راستے سے جاتی اور ادھر ہی سے آتی، ایک وقت کا پکاتی اور تین چار وقت وہی کھا لیتی۔

"تم ہاسٹل نہیں آ رہیں۔" سارہ نے اس سے پوچھا۔

"نہیں، اب میں گھر میں ہی رہوں گی۔" اگرچہ دونوں کے مضامین مختلف تھے پھر بھی روز ملاقات ہو جاتی تھی۔

آخر خدا خدا کر کے اس کے فائنل ایگزام ہوئے تو اسے لگا ایک طویل سفر کے بعد آرام کا وقت آیا ہے۔

"اب کیا کروں؟" کئی دن کے مسلسل آرام سے بھی اکتا گئی۔

''فاطمہ بی! میں جاب کر لوں؟'' فاطمہ بی اس کے لیے نیچے ہی سے کھانا لے آئی تھیں آج۔

''نہ بچے! تائی پہلے ہی خار کھائے بیٹھی ہے۔''

''چھوڑیں فاطمہ بی! میں نے اب اس بات کا غم کھانا چھوڑ دیا ہے۔ یہ گھر کے پاس ہی انگلش میڈیم اسکول ہے، میں کل ان کے آفس گئی تھی، وہ مجھے جاب دینے پر تیار ہیں۔ جب تک رزلٹ نہیں آ جاتا، میں مصروف رہوں گی۔''

اسکول کی وجہ سے اس کا وقت اچھا گزرنے لگا تھا۔ آتے جاتے ایک دو بار اس نے عاشو کو دیکھا۔ سوزوکی میں کسی لمبے بالوں والے لڑکے کے ساتھ آتے جاتے۔

''تمہیں پتا ہے، عاشو نے امتحان بھی نہیں دیا۔'' اس نے فاطمہ بی سے ذکر کیا تو انہوں نے بتایا۔

''اچھا، مجھے تو نہیں پتا۔''

''بہن کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔'' فاطمہ بی کی بات پر اسے تائی امی کا محاورہ یاد آ گیا جوان دونوں بہنوں کے لیے وقف تھا۔ جیسی ماں ویسی بیٹیاں۔

اس کا رزلٹ آؤٹ ہوا۔ اس بار بھی اس نے بی ایس سی فائنل ایئر میں ٹاپ کیا تھا اور اس بار بھی اس کی خوشی کو سیلیبریٹ کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ صبح تو کالج میں اچھا ٹائم گزرا تھا۔ وہ کالج گئی تھی۔ سب ٹیچرز سے ملاقات ہوئی تھی۔ پرنسپل صاحب کے ساتھ تصویریں اور گولڈ میڈل۔ سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا اور شام اس قدر خالی اور ویران۔

''اگر ممی پاپا ہوتے، ثمین ہوتی۔ ثمین کہاں چلی گئی؟ اتنا عرصہ بیت گیا۔ ڈھائی سال سے اس کی کچھ خبر نہیں۔'' وہ سوچنے لگی۔

''تزئین بی بی! آپ کا فون ہے۔'' رضیہ کی آواز نے اسے سوچوں سے باہر نکالا۔

''میرا فون!'' وہ تعجب سے بولی۔

''جی نیچے ڈرائنگ روم میں آ جائیں۔ فاطمہ بی کہہ رہی ہیں۔''

''ہیلو!'' نیچے آ کر اس نے ریسیور اٹھایا۔

''کانگریچولیشنز تزئین! صبح سے فون کر رہا ہوں، فاطمہ بی ٹالے جا رہی تھیں۔ مجھے

معلوم نہیں تھا تم بدمزاج اور تک چڑھی ہونے کے ساتھ ذہین بھی ہو، اسی لیے نخرے دکھاتی ہو۔'' سعد کی فریش آواز سے اس کی ساری اداسی دور ہو گئی۔

''تمہیں کیسے خیال آ گیا'' اس سے بات کرتے اس کے لہجے میں یونہی تیکھا پن آ جاتا تھا۔

''تمہارے خیال سے میں کبھی غافل نہیں ہوا۔ تمہیں معلوم ہے۔''

''مجھے معلوم ہونے سے کیا ہوتا ہے۔''

''فکر نہ کرو، چاند چڑھے گا تو سارا شہر دیکھے گا، بس کچھ عرصہ اور، اور آگے تمہارے کیا ارادے ہیں۔''

''ظاہر ہے ماسٹرز کرنے کے۔''

''اچھی بات ہے۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ لڑکیاں ایم اے کیوں کرتی ہیں، اچھے رشتوں کے انتظار میں اور تم اپنی ساس کے راضی ہونے کے انتظار میں کرو۔''

''یہ بھی تم جیسے کسی نکمے نے کہا ہوگا۔''

''بس تیار ہو جاؤ، یہ لکھا اب تمہارے عشق میں بالکل ہی نکما ......''

''فاطمہ بی! کون چمٹا ہوا ہے فون کے ساتھ۔ کسی کے باپ کی کمائی نہیں آ رہی جو بل بھرتے پھریں۔ کمبخت حرام خور لوگ نہ کوئی شکر، نہ احسان مندی۔ اس چھت تلے جگہ دی، منحوس نے ہمیں ہی ڈس لیا۔ جس دن سے اس پچھل پیری نے اس گھر میں قدم رکھا، گھر میں کالے سائے اتر آئے ہیں۔ کتنی رہی نکال دو ان کو ادھر سے، مگر مرنے والا بھی ایک ڈھیٹ تھا، دیکھ لیا آج اس کا نتیجہ۔ اجڑ گیا یہ گھر، خالی ہو گیا۔''

تزئین گھبرا گئی۔ اس نے ریسیور کریڈل پر ڈالا اور اندھا دھند وہاں سے بھاگتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف آ گئی۔ تائی امی کی تیز چنگھاڑتی ہوئی آواز اور کوسنے آخری سیڑھی تک اس کا پیچھا کرتے رہے۔



پھر اس نے بھی جیسے قسم کھائی کہ اب نیچے نہیں جانا۔ ماسٹر کے دو سال بس چپ چاپ گزارنے ہیں۔ اور اس کے بعد ادھر رہنا بھی نہیں۔ وہ اپنے باغی دل و دماغ کو یہ تسلی

دے کر ٹھنڈا کرتی رہتی۔ یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہوئے پھر کلاسز بھی اسٹارٹ ہو گئیں۔ کلاسز کے بعد ایک ڈیڑھ گھنٹہ وہ لائبریری میں ضرور گزارتی۔

میتھس جیسے خشک مضمون کی کلاس کے سارے اسٹوڈنٹس ہی خوب زندہ دل تھے۔ ہر دوسرے دن کوئی نہ کوئی مشغلہ کھڑا کر لیتے۔ غیر نصابی سرگرمیوں کی طرف ان کا بہت رجحان تھا۔

''اُفوہ ترزمین! تم بھی آؤ نا۔ آڈیٹوریم میں اتنا زبردست مباحثہ ہے۔ اپنی شہلا اور حیدر دونوں حصہ لے رہے ہیں۔ تم ادھر کونے میں گھسی جا رہی ہو، کتابی کیڑا بننے کے لیے۔'' کلاسز کے بعد اسے فائل اٹھا کر لائبریری کی طرف جاتے دیکھ کر فائزہ اور سوتا نے روکا۔

''سوری یار! مجھے بہت ضروری اسائنمنٹ بنانی ہے۔ مجھے تو معاف ہی رکھو۔ اگر جلدی فارغ ہو گئی تو آ جاؤں گی۔''

وہ ان سے پیچھا چھڑا کر نکل گئی اور جلدی تو وہ فارغ ہو نہیں سکتی تھی۔

تھرڈ ائیر کے سمسٹر ہوئے اور رزلٹ میں وہ حسب معمول ٹاپ آف دالسٹ تھی۔ اس کا دل خوشی اور اطمینان سے بھر گیا۔ بس اب آخری مرحلہ تھا۔ جس میں اسے بہت محنت کرنی تھی تاکہ اسے بہترین جاب مل سکے کہ معاشی تنگدستی کی جو تلوار اس کے سر پر لٹک رہی تھی، اس سے نجات ملے۔ اس سال تو اس نے کوئی نیا سوٹ بھی نہیں بنایا تھا۔ دو سفید شلواروں اور دو پٹوں نے آٹھ شرٹس کا بھرم رکھ لیا تھا۔

''یار! یہ مردانہ کلر کے علاوہ بھی کوئی کلرفل سوٹ پہن آیا کرو۔'' حنا چڑ کر کہتی۔

''مجھے پسند ہے یہ کمبینیشن۔''

''تمہیں معلوم ہے، اپنا حیدر دل میں تمہاری کتنی ڈھیر ساری جگہ اٹھائے اٹھائے پھر رہا ہے پرپوں سے، مگر تمہاری اس ڈریسنگ سے اس قدر خوف ہے کہ کچھ کہنے کی ہمت خود میں نہیں پاتا۔ جس دن تم کلرفل ڈریس پہن آئیں، اس دن ہمت کرے گا۔'' عظمیٰ نے ہنستے ہوئے انکشاف کیا۔

''بس تو پھر اس سے کہو روز حشر کا انتظار کرے۔'' وہ اطمینان سے بولی۔

''لاحول ولا قوۃ۔ وہ تو پہلے ہی پریم شہید بننے کو تیار پھر رہا ہے، تمہارا انتظار تو اسے

مار ہی ڈالے گا۔''

''حیدر نے فائنل کے بعد اپنی مدر کو تمہارے گھر بھیجنے کا کہہ رکھا ہے، تم تیار رہنا۔''

حنا کی بات پر وہ حیران رہ گئی۔

''حیدر صاحب یہ منزل تو میرے راستوں میں کہیں بھی نہیں میری آنکھیں مدتوں سے خوابوں سے خالی ہیں۔'' وہ دل میں سوچتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

ان کے فائنل ایگزام سر پر تھے۔ اسے دن رات کا فرق بھول گیا تھا۔ اس رات بھی وہ بیٹھی پڑھ رہی تھی جب اس کے کانوں نے ایک عجیب سی آواز سنی۔ وہ چونک گئی۔ اس نے کتاب بند کر کے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ڈیڑھ بج رہا تھا۔ اس نے کان پھر اس آواز کی طرف لگائے اور اٹھ کر باہر آ گئی۔ گیسٹ روم کا دروازہ ذرا سا دھکیلنے پر کھل گیا۔ اندر کا منظر عجیب تھا۔ بلکہ اس کے لیے عجیب ترین۔

عاشو پاؤں میں گھنگھرو باندھے شارٹ ٹی شرٹ اور ٹراؤزر میں پھولے سانسوں کے ساتھ گھوم گھوم کر بڑھے ردھم کے ساتھ رقص کر رہی تھی۔ اسٹریو کی آواز بہت اونچی نہیں تھی، اس لیے شاید پہلے اسے سنائی نہیں دی تھی۔ اس کے کانوں نے تو گھنگھروؤں کی آواز سنی تھی۔

''عاشو!'' اس کے حیرت زدہ لبوں سے بے اختیار نکلا تو عاشو کے گھومتے قدم تھم گئے۔

''تم!'' وہ جیسے غصے میں آ گئی۔ ''تم ادھر کیوں آئی ہو؟'' وہ اپنے قدم جھٹکتے ہوئے بولی تو گھنگھرو زور سے بج اٹھے۔

''تم یہ سب کیا کر رہی ہو؟'' ترزمین اس کے غصے کو نظر انداز کر کے بولی۔

''اندھی ہو نظر نہیں آتا؟'' وہ بدتمیزی سے بولی۔

''نظر تو آ رہا ہے اور خوب آ رہا ہے مگر کس لیے؟'' وہ آگے بڑھ کر بولی۔

''میں رقص سیکھ رہی ہوں، مجھے شوق ہے۔'' وہ لاپروائی سے بولی۔

''میرا خیال ہے یہ سب اس ہپی ٹاپ لڑکے کی کمپنی کا نتیجہ ہے جس کے ساتھ تم سال بھر سے گھوم رہی ہو۔''

''خوب، بہت خوب!'' ساری خبریں ہیں تمہیں۔ تو سنو، مجھے چھپانے کی کچھ ضرورت نہیں، وہ نسیم وقار ہے، وکی۔ سنا ہوگا نام تم نے فلموں کا نامور ڈانس ماسٹر۔ رقص کی دنیا کا بے تاج بادشاہ اور میرے حسن کا شیدا۔ بس اس کی اگلی فلم میں آ رہی ہوں۔ وہ خود فلموں میں کام نہیں کرتا بلکہ فلمیں اس کے رقص کی وجہ سے چلتی ہیں۔''

''تمہیں کچھ احساس ہے، تم کیا کہہ رہی ہو، کیا کر رہی ہو؟'' تزئین کو غصہ آ گیا۔

''میرا کس نے احساس کیا؟ وہ شفق کتنی مکار، شادی سے پہلے سارے عیش کر لیے اپنے یار کے ساتھ اور بعد میں اس فراڈیے کے ذریعے بلیک میلنگ کی اور پاپا کی ساری جائیداد ہتھیا لے گئی۔ فیکٹری، کوٹھی، کار، بینک بیلنس سب اور عزت بچانے کے نام پر سال بھر انگلینڈ میں عیش کر لیے۔ اس نے خیال کیا میرا کہ وہ یہ سب کچھ لے گئی تو میرے لیے کیا بچے گا؟ اور وہ شبیر بھائی۔ میرا اس نے خیال کیا، وہ یونہی امریکہ نہیں گیا۔ پاپا سے اس نے اپنے اکاؤنٹ میں اتنی رقم جمع کرائی تھی کہ وہاں وہ پانچ سال تک بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے عیش کی زندگی گزار سکتا ہے۔ اس نے جاتے ہی شادی کر لی تھی۔ پڑھنے کا تو محض بہانہ تھا، آیا وہ باپ کے مرنے پر؟ نہیں نا۔ اسے کیا ضرورت مردے کو دیکھ کر اپنی زندگی کے مزے خراب کرنے کی اور ممی پاپا نے میرا کتنا خیال کیا کہ کچھ تو میرے لیے بھی بچا لیتے۔ اب...... اب تمہیں پتا ہے اس گھر میں کیا بچا ہے صرف فاقے، نحوست اور بیماری۔ کیا میں ان کے لیے یہاں رہوں۔ جب کسی کو میری پروا نہیں تو میں کیوں کسی کی پروا کروں۔ بھاڑ میں جائے یہ گھر اور جہنم میں جائے اس کی عزت۔ ویسے بھی سبین اور شفق اس گھر کی عزت کو کافی زیادہ چکا چکی ہیں، اس لیے اب میرے ایسا کرنے سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔

اور تم کیا سمجھتی ہو، تم بہت پارسا ہو، بہت نیک، بہت اچھی ہو؟ سچ بھی ہے بھلا تمہیں کیا فکر۔ وہ ثمینہ پھپھو کا اکلوتا، کروڑوں کا وارث جو تم پر لٹو ہے۔ کتنا ممی نے پھپھو کی منتیں کیں کہ عاشو سے شادی کر لو مگر [illegible] نے بیٹے کی ضد کو ڈھال بنا لیا اور سنو، تم بھی پروا مت کرو، تم بھی بھاگ جاؤ، اس کے ساتھ کورٹ میرج کر لو، عیش کرو گی۔ پھپھو نہیں مانتیں، نہ مانیں۔ پروا مت کرو، وہ آٹھ دس سالوں میں مر ہی جائیں گی۔ سعد کو فون کرو، اس کے ساتھ بھاگ جاؤ۔ بس چند دن میں اس گھر کا سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔ وہ ہذیانی انداز میں چیخ رہی

تھی۔

''جاؤ، چلی جاؤ، بھاگ جاؤ عیش کرو۔ سب عیش کر رہے ہیں۔'' اس نے پلٹ کر اسٹریو کا والیوم آن کر دیا۔ آسٹریو چیخ اٹھا۔

''شرارہ شرارہ...... شرارہ شرارہ میں ہوں اک شرارہ......''

وہ دوبارہ پورے جوش سے ناچ رہی تھی۔ تزئین دل گرفتگی سے اسے دیکھے گئی۔ عاشو اس کی موجودگی سے بے خبر ہو چکی تھی۔ تزئین مڑ کر اپنے کمرے میں آ گئی پھر رات بھر اس سے پڑھا ہی نہ جا سکا۔



اس دن اس کا آخری پیپر تھا۔ وہ جانے کے لیے پچھلی سیڑھیاں اتری تو فاطمہ بی نے کچن کے پچھلے دروازے سے اشارہ کر کے اسے اندر بلایا تو وہ ان کے پیچھے چلی آئی۔ لاؤنج میں اس کی نگاہوں کے سامنے اسی لڑکے کے ساتھ تنی کھڑی تھی۔ تائی امی صوفے پر بیٹھی تھیں۔ ان کی پشت تزئین کی طرف تھی۔

''ممی! میں نے وکی سے کورٹ میرج کر لی ہے۔'' عاشو نے بم گرایا۔ ''ابھی کچھ دیر پہلے کیونکہ مجھے معلوم تھا آپ کے پاس مجھے رخصت کرنے کے لیے ایک دھیلا بھی نہیں ہے اور میں آپ کی دونوں اولادوں کی طرح بے حس اور بے رحم نہیں کہ آپ کو بیچ کر اپنا حصہ وصول کروں۔ یوں بھی آپ کو بیچ کر ملے گا بھی کیا بلکہ اس گھر میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے جسے بیچ کر میں کوئی بھی مادی خوشی خرید سکوں، اس لیے میں نے وکی سے کورٹ میرج کی ہے۔ داد دیں اپنے داماد کو جس نے آپ کی بیٹی کو خالی ہاتھ قبول کر لیا۔ میں شفق جیسی ہوں، نہ شبیر بھائی جیسی۔''

پھر وہ اس رات والی تقریر دہرانے لگی تھی۔ تزئین تیزی سے مڑ کر باہر نکل گئی۔

ایگزامینیشن ہال پہنچنے تک اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، سوائے ایک جملے کی گردان کے۔

''ممی! میں نے کورٹ میرج کر لی ہے۔''

''اس وقت مجھے پورے دھیان سے صرف پیپر دینا ہے اس گھر کا یا گھر والوں کا مجھ سے کیا تعلق۔'' خود کو بمشکل سمجھا کر اس نے پیپر شروع کیا۔

"تزئین ایکسکیوزمی!" وہ پیپر دے کر باہر نکلی تو حیدر راستے میں کھڑا تھا۔

"جی!"

"مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے، اگر کہیں بیٹھ جائیں تو۔"

"نہیں حیدر صاحب! مجھے ذرا جلدی جانا ہے، آپ کہیں جو کہنا ہے۔" حیدر نے ایک شکایت بھری نظر اس کے پتھر چہرے پر ڈالی۔

"میری مدر آپ کے گھر آنا چاہتی ہیں۔" وہ چپ ہو گیا۔

"اگر میں پوچھوں کیوں؟"

"آپ لڑکی ہیں، آپ کو علم ہونا چاہیے۔" وہ نروٹھے پن سے بولا۔

"سوری، میری انگیجمنٹ ہو چکی ہے۔" کہہ کر وہ رکی نہیں بھاگی ہوئی گیٹ تک پہنچی۔



آج اس کا اوپر جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر اس نے اپنے دل کو ڈانٹا اور پہلی سیڑھی پر قدم رکھا۔

"تزئین اوپر مت جاؤ، دیکھو آ کر تائی کو صبح سے بت بنی بیٹھی ہیں۔ کچھ بولتی ہی نہیں۔ نہ کچھ کھا رہی ہیں۔" فاطمہ بی پیچھے سے آ کر روہانسے لہجے میں بولیں تو وہ پلٹ آئی۔ تائی امی صبح والی پوزیشن میں صوفے پر بیٹھی تھیں۔ ہاتھ گود میں دھرے کسی بت کی طرح ساکن۔

"ڈاکٹر صاحب کو بلا کر لائی تھی۔ انہوں نے کہا ہے کہ کوئی ذہنی دھچکا لگا ہے انہیں رلائیں، کچھ کریں ورنہ شام تک یہ ایسے ہی رہیں تو خدانخواستہ ان کے دماغ کی شریان پھٹ سکتی ہے۔ ڈاکٹر کو گئے ہوئے بھی دو گھنٹے ہونے کو آئے، کہہ گئے تھے ایسا نہ ہوا تو انہیں ہاسپٹل لے جائیں۔" فاطمہ بی کی تفصیل پر بھی تائی امی کے اندر کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی۔ تزئین قدرے جھجکتے ہوئے آگے بڑھی اور آہستگی سے ان کا کندھا ہلاتے ہوئے بولی۔

"تائی امی! آپ کو پتا ہے عاشو نے کورٹ میرج کر لی۔ تائی امی! کورٹ میرج۔ عاشو کی ماں تو ہماری ماں کی طرح بدکردار نہیں تھی پھر اس نے کورٹ میرج کیوں کر لی؟ کیوں

گھر سے بھاگ گئی؟ تائی امی! عاشو بھاگ گئی، بھاگ گئی عاشو۔"

تائی امی نے قہر آلود نگاہوں سے اسے گھورا۔ ہاتھ اٹھا کر تزئین کے منہ پر تھپڑ مارنا چاہا مگر ان کا ہاتھ فضا میں ہی لہرا کر رہ گیا اور دھڑام سے ان کی گود میں آ گرا۔

"جھوٹی، نمک حرام، بکواس ....." ان کے منہ سے رال بہنے لگی۔ چہرہ ایک طرف سے ٹیڑھا ہوتا گیا۔ انہوں نے دائیں کندھے کو بائیں ہاتھ سے تھامنا چاہا مگر ان کا دایاں پورے کا پورا حصہ دائیں طرف لڑھک گیا، گردن صوفے کی پشت سے باہر کی طرف ڈھلک گئی۔ آنکھیں باہر کو ابل رہی تھیں اور منہ سے جیسے کف نکل رہا تھا۔



فالج کا شدید اٹیک ہوا تھا تائی امی پر، نیچے کا سارا دھڑ، اوپر کا پورا دایاں حصہ، چہرہ اور زبان مکمل طور پر مفلوج ہو کر رہ گئے تھے۔ صرف بائیں ہاتھ میں ذرا سی لرزش ہو رہی تھی۔ چہرہ دائیں طرف لٹکائے کھلے منہ سے ٹپکتی رال ڈھلکی گردن اور غوں غاں کر کے بولتی تائی امی عبرت کا نشان بن کر رہ گئی تھیں، جو دیکھتا کانوں کو ہاتھ لگاتا، دل میں سو بار استغفراللہ پڑھتا۔ شفق صرف دو دفعہ ماں کو دیکھنے آئی، عاشو صرف پندرہ منٹ کے لیے، شبیر بھائی کو اطلاع کر دی گئی مگر وہ آ نہ سکے۔ یہ قدرت کا کیسا انتقام تھا۔ ثمینہ پھپھو دو روز کے لیے آئیں۔ صرف چند گھنٹے ہی ٹھہریں پھر اپنی نند کے گھر چلی گئیں۔

"کہا تھا بھابھی! بیٹیوں کو اس قدر چھوٹ نہ دیں، پچھتائیں گی۔" وہ بھی صرف طعنے دینے کے لیے آئی تھیں۔ اور تزئین کو دیکھتے ہی انہوں نے منہ پھیر لیا تھا۔

فاطمہ بی کے اصرار کے باوجود اس کا قیام ابھی بھی اوپر ہی تھا۔ اس کا رزلٹ اناؤنس ہو گیا تھا۔ اس بار بھی قدرت نے بڑی کامیابی اس کے حصے میں لکھ دی تھی۔ گولڈ میڈل پہنے ہوئے اس کے دل نے اس کامیابی کی خوب ہنسی اڑائی جس پر خوش ہونے والا اس کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا۔

سعد کی طرف سے خوبصورت کارڈ اور پارسل اسے دوسرے دن ٹی سی ایس کے ذریعے مل گیا تھا اور حسب وعدہ جلد آنے کا وعدہ۔ اسے کوئی بھی چیز خوش نہ کر سکی، اس نے دونوں چیزیں اٹھا کر الماری میں رکھ دیں۔

ایک بینک نے اسے جاب آفر کی جو اس نے فوراً قبول کر لی تھی۔ وہ نیچے ابھی بھی کم جاتی تھی۔ تائی امی کا سامنا کرنے کا اس کا جی نہیں چاہتا تھا۔ ان کی بے بسی دیکھ کر اسے خوف سا آنے لگتا تھا پھر جاب کی مصروفیت شروع ہو گئی۔ فاطمہ بی بھی اب بیمار رہنے لگی تھیں پھر تائی امی کو سنبھالنا ان سے دشوار ہوتا جا رہا تھا۔ رضیہ کے علاوہ سب ملازم چھٹی کر گئے تھے اور گھر اب اس کی تنخواہ ہی سے چل رہا تھا۔



اسی طرح تین سال بیت گئے۔ زندگی جیسے ٹھہری گئی تھی۔ گھر میں سناٹے روتے تھے۔ وہ اکثر شام کو گھبرا کر گاڑی لے کر باہر نکل جاتی۔ بینک کی طرف سے اسے گاڑی مل چکی تھی۔ گھر بھی مل رہا تھا اس نے انکار کر دیا۔ سعد کا فون کبھی کبھار آ جاتا تھا۔

''میں اب مما کو منا کر ہی ساتھ لاؤں گا، تم فکر نہ کرو۔'' ہر فون پر اس کی ایک ہی بات ہوتی۔

اس روز موسم بے حد سہانا تھا۔ شام ڈھلے وہ گاڑی لے کر فورٹریس کی طرف نکل گئی۔ ضرورت کی ایک دو چیزیں خرید کر وہ یونہی ونڈو شاپنگ کرنے لگی۔ ایک خوبصورت کا کھلونوں کی دکان پر بجی گڑیاں اس قدر حقیقی لگ رہی تھیں کہ وہ انہیں یک ٹک دیکھنے لگی۔ گڑیوں کی قطار میں اوپر دیکھتے ہوئے ایک چہرے پر اس کی نگاہیں اٹک سی گئیں۔ وہ سیمین تھی۔ اس کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ سیمین بھی اسے دیکھ رہی تھی۔ شاید اس نے تزئین کو پکارا تھا۔

اور کچھ ہی دیر بعد اس کی گاڑی پل پر تیز رفتاری سے اڑی جا رہی تھی۔

''سیمین! تم اب میرے لیے کہیں بھی نہیں ہو۔'' گھر آ کر گاڑی لاک کر کے اس نے خود سے کہا، موسم اچھا خاصا تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ رات میں خنکی اب خاصی بڑھ گئی تھی۔ وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگی۔

''بیٹا! آج نیچے رہ جاؤ، تمہاری تائی کی طبیعت آج اچھی نہیں۔ ابھی ڈاکٹر چیک کر کے گیا ہے۔'' فاطمہ بی نے اسے پہلی سیڑھی پر روک لیا تو وہ گہرا سانس لے کر نیچے اپنا کمرے کی طرف مڑ گئی۔

دو تین دن میں تائی امی کی طبیعت اچھی خاصی بگڑ چکی تھی۔ یوں بھی سردی شروع ہوتے ہی ان کا عارضہ بڑھ جاتا تھا۔ تین سال بستر اور وہیل چیئر پر رہنے کی وجہ سے ان کی کمر کا بہت سا حصہ گلتا جا رہا تھا۔ شفق اور عاشو مہینوں بعد آتی تھیں۔ شفق کے شوہر نے دوسری شادی کر لی تھی اور عاشو کے آج کل وکی سے زبردست جھگڑے چل رہے تھے اور چوتھے دن جب تائی امی کی طبیعت بگڑی تو ڈاکٹر نے جواب دے دیا۔

''ڈاکٹر صاحب! ہاسپٹل لے جائیں؟'' فاطمہ بی نے پوچھا۔

''کوئی فائدہ نہیں۔ یہ شاید آج کی رات بس گزار سکیں۔ اگر آپ لے جانا چاہیں تو لے جائیں۔ پتا نہیں کیا چیز جس نے ان کی سانسوں کو باندھ رکھا ہے۔'' تائی امی نیم بے ہوش تھیں اور ان کے سینے میں سانس یوں چل رہا تھا جیسے ریل کا انجن ہو۔ ایک دھمک، ایک شور کے ساتھ۔

''آپ لوگ دعا کریں، اللہ ان کی مشکل آسان کرے۔'' ڈاکٹر چند دوائیں لکھ کر چلا گیا تو وہ اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئی۔

''اور جو انہوں نے لوگوں کی زندگیوں کو برزخ بنایا ہے وہ۔'' سوچتے سوچتے نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

''تزئین! جلدی اٹھو تمہاری تائی کا وقت آ گیا ہے۔ شاید، تمہیں بلوا رہی ہیں۔'' تائی امی کی غوں غاں کی سمجھ صرف فاطمہ بی کو آتی تھی۔

''تزئین سرخ آنکھوں کے ساتھ چل پڑی۔ تائی امی زور زور سے دائیں طرف سر مار رہی تھیں۔ ان کا بایاں ہاتھ مسلسل لرز رہا تھا۔ اور آنکھیں جیسے پھٹ رہی تھیں۔ حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکل رہی تھیں۔ تزئین کو اتنا خوف آیا اس کا جی چاہا ادھر سے بھاگ جائے۔ فاطمہ بی آگے بڑھ کر تائی کا سر تھپکنے لگیں۔ وہ مسلسل سر پٹخ رہی تھیں۔ ان کی غوں غاں کے شور پر فاطمہ بی نے کچھ توجہ سے انہیں سنا۔ وہ اپنے کمرے کی الماری کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔

''اچھا اچھا، میں سمجھ گئیں۔'' فاطمہ بی سر ہلا کر اٹھیں اور الماری کھول کر اوپر والے لاکر میں چابی گھمانے لگیں۔

"یہ کہہ رہی ہیں تائی بیگم صاحب!" فاطمہ بی نے ایک منقش مستطیل شکل کی صندوقچی لے کر ان کے پاس پہنچیں تو جیسے تائی امی کو قرار آ گیا۔ پھر ان کی غوں غوں پر فاطمہ بی نے صندوقچی کو تزئین کی طرف بڑھا دیا، اس نے حیران ہوتے ہوئے صندوقچی کا ڈھکن اٹھایا، اس کے اندرونی مخملیں حصے میں ڈھیر سارے زیورات پڑے تھے اور اسے یاد آیا یہ تو وہی زیور تھے جو دادا نے اس کی ماما کو مرنے سے پہلے دیے تھے، اور جو تیمن کے پاس تھے اور بعد میں تائی امی نے کہہ دیا تھا کہ تیمن لے گئی ہے۔ تب ہی فاطمہ بی نے ایک تہہ شدہ کاغذ اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ کیا ہے فاطمہ بی!" تزئین نے حیرت سے پوچھا۔

"تمہاری امانت ہے مجھے معاف کر دینا بیٹا! تیمن کا یہ خط اس کے جانے کے ایک سال بعد آیا تھا اور خط تمہیں یا تمہارے تایا ابو کو دے دیتی تو جانے کیا ہوتا میں تو بے سہارا بوڑھی عورت تمہاری تائی سے ڈر گئی میری خود غرضی سمجھو یا مجبوری مگر مجھے معاف کر دینا بیٹا۔"

"تزئین نے کانپتے ہاتھوں سے خط کھولا۔

تایا ابو!

السلام علیکم، مجھے معلوم ہے آپ مجھ سے ناراض ہیں، شاید میرا خط بھی پڑھنے سے پہلے پھاڑ دیں لیکن میری درخواست ہے کہ ایک بار اسے ضرور پڑھ لیں۔ میں بے قصور ہوں تایا ابو! جس دن آپ لوگ شادی پر گئے تائی امی نے مجھے بتایا کہ آپ میری شادی اپنے کسی کروڑ پتی دوست سے کرنا چاہتے ہیں جس سے آپ نے بہت سا قرض لے رکھا ہے اور یہ کہ تائی امی ایسا نہیں چاہتیں اور آپ شادی سے واپس آتے ہی میرا نکاح کر دیں گے، اپنے اس ساٹھ سالہ دوست سے۔ پھر تائی امی نے خود ہی فون کر کے احمر کو بلوایا اور نکاح خواں کو بھی۔ فاطمہ بی کو اپنی دوائیں لینے بھیج دیا، انہوں نے مجھ اس طرح میرا برین واش کیا کہ میں احمر سے نکاح پر راضی ہو گئی پھر انہوں نے احمر کی منت سماجت کی ایک یتیم لڑکی کی زندگی تمہاری وجہ سے بچ سکتی ہے تو نیکی کما لو۔ تایا ابو! تائی امی ہمارے نکاح میں ولی سرپرست کی حیثیت سے شامل تھیں، ان کے سائن نکاح نامے پر موجود ہیں جو انہوں نے اپنے پاس رکھ لیا تھا اور پھر ہمیں گھر سے بھگا دیا۔

مجھے چند گھنٹوں بعد ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ میں نے فون کر کے تائی امی سے گھر آنے کا پوچھا وہ تو مکمل طور پر بدل چکی تھیں۔ انہوں نے مجھے اور احمر کو گالیاں دیں کہ ہم گھر سے بھاگ گئے ہیں اور یہ کہ تھانے میں ہمارے خلاف لاکھوں کی نقدی اور زیورات چرا کر لے جانے کی ایف آئی آر درج ہو چکی ہے۔ پولیس ہماری تلاش میں ہے، میں اور احمر اس قدر خوفزدہ ہوئے کہ ہم نے چند گھنٹوں میں ہی شہر چھوڑ دیا اور بلوچستان کے ایک دور افتادہ گاؤں میں یہ چند سال گزارے، مگر تزئین کی یاد اور آپ سے معافی کا خیال سکون نہیں لینے دیتا تھا۔ احمر بہت اچھے ہیں، میرا انہوں نے بہت خیال رکھا۔ مگر میری وجہ سے ان کی اپنی زندگی مشکل ترین ہو گئی۔

تایا ابو! میں آپ سے معافی مانگنا چاہتی ہوں۔ تایا ابو ان سب باتوں میں ایک بات بھی جھوٹ نہیں۔ آپ تائی امی سے پوچھ لیں۔ اگر انہوں نے سچ بتایا تو......؟"

"ایک گناہ گار تیمن"

اس خط کے نیچے نکاح نامہ پڑا تھا۔ جس میں تائی امی کے سائن سرپرست کے خانے میں موجود تھے۔ سن اور تاریخ بھی وہی تھی۔

تزئین نے دھندلائی آنکھوں سے تائی امی کو دیکھا۔ ان کی نظروں میں جانے کیا تھا کہ اس کا جی چاہا انہیں کبھی معاف نہ کرے۔ وہ اسی طرح بستر نزع پر پڑی تڑپتی رہیں۔ قضا تو آنی ہے۔ اس کو تو کوئی نہیں روک سکتا اور جو برزخ قضا کے بعد ہے وہ ......؟ اس کی تکالیف کی کوئی انتہا نہیں۔

تزئین! تمہاری تکالیف تو کٹ جائیں گی، تائی امی کی روح کو اس کبھی نہ ختم ہونے والی سزا سے کون نجات دلائے گا؟"

اس کا سدا کا حساس دل تائی امی کی حالت دیکھ کر پگھل گیا۔ وہ آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھی، تائی امی کی آنکھوں میں آنسو جیسے جمے ہوئے تھے۔

"میں نے آپ کو معاف کیا، اللہ بھی آپ کو معاف کرے۔" کہہ کر وہ مڑ گئی اس سے زیادہ حوصلہ اس میں نہیں تھا۔

○

رات کو خوب بارش ہوئی، صبح تک سردی بہت بڑھ چکی تھی۔ جب تائی امی کے جنازے کے گرد بیٹھے لوگ گرم کپڑوں میں لپٹے آئے تو اس نے حیرت سے سوچا۔

''موسم اتنی جلدی بدل جاتے ہیں، ہاں پل گزارنا محال ہوتا ہے، سال تو یونہی گزر جاتے ہیں۔'' تائی امی کے مرنے کا ملال کس کو ہوتا تھا، لوگ دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ گھٹنوں پر سر رکھے نم آنکھوں کے ساتھ دکھ بھرے لمحوں اور سالوں کا حساب کرتی رہی، تبھی شفق اور عاشو خوب روتی دھوتی آئیں۔ پھپھو کے واویلے پر مجمع مڑ مڑ کر دیکھتا رہا۔ ثمینہ پھپھو کے آنے کے تھوڑی دیر بعد اس نے تیمن اور احمر کو آتے دیکھا، اور جنازہ اٹھنے سے محض چند منٹ پہلے شبیر بھائی اپنی گڑیوں جیسی دو جڑواں چار سالہ بچیوں کے ساتھ آئے تو شفق اور عاشو کی چیخوں میں تیزی آ گئی۔ جیسے ہی جنازہ اٹھا، وہ چپکے سے اٹھ کر اوپر آ گئی۔ کمرے میں آ کر وہ راکنگ چیئر پر جھولنے لگی۔

''تو تائی امی! یہ ہے زندگی کی ہوس، اس کی آسائشوں اور بہت زیادہ کی تمنا کرنے کا انجام۔ یہی انجام ہے، انسان کی تمام تر آرزوؤں کی تکمیل کا، سب کچھ خاک میں جائے۔'' وہ دل گرفتہ سی سوچتی رہی۔

''ترئین!'' اس کی جھولتی کرسی رک گئی۔

''ترئین! میں تمہاری مجرم ہوں، تمہاری اس تکلیف دہ زندگی کی۔ میں دو بار پہلے بھی آئی تھی مگر تم آفس میں تھیں۔ فاطمہ بی نے مجھے سب بتا دیا تھا۔ ترئین آئی ایم سوری، ترئین! تم ٹھیک کہتی تھیں۔ مجھ میں عقل کی کمی تھی۔ میں تھوڑا رک جاتی۔ تایا ابو سے مل لیتی! ترئین مجھے معاف کر دو، میں نے تمہارا دل دکھایا ہے۔''

وہ اس سے لپٹی روئے جا رہی تھی۔ اور اس کے قلب و ذہن کی تھکن جیسے تیمن کے آنسوؤں کے ساتھ ہی بہہ گئی۔

''تم نے جو کیا وہ تقدیر میں لکھا تھا مگر کم از کم تم مجھ سے رابطہ تو کر سکتی تھی نا؟؟''

نے تیمن کا کمزور چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

''رابطہ کرتی تو تم کیا بات کر لیتیں؟ اس روز تو فورٹریس میں، میں تمہاری کے پیچھے بھاگی تھی مگر تم نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔''

''اتنی ناراضی کا حق تو تھا نا مجھے۔'' وہ ذرا سا مسکرائی۔

''ماما! ماما!'' تیمن کے دونوں بچے اسے پکارتے ہوئے اوپر آ گئے تھے انہیں دیکھ کر ترئین جیسے سب کچھ بھول گئی۔

''کتنے پیارے ہیں یہ تیمن...'' اس نے دونوں کو کھینچ کر گلے سے لگا لیا۔



''بی بی! آخر کب تک اس بچی کو سزا دیں گی۔ اس قدر ہمت و حوصلے سے اس نے تمام مصائب کا مقابلہ کیا ہے، جس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ اللہ بخشے بڑی بیگم کو! ارتضیٰ صاحب کو انہوں نے گھر سے نکلوایا تھا۔''

''اس وقت تم ہی تو تھیں ڈیڈی کو سب سچ بتانے والی، پھر کیوں نہیں بتایا؟'' پھپھو چیخ کر بولیں۔

''غریب کس قدر مجبور ہوتا ہے بی بی! آپ کو کیا معلوم میری بیٹی کی شادی تھی اور بیگم صاحبہ نے مجھے اس کام کے دس ہزار روپے دیے تھے۔ نہ لیتی تو بیٹی ساری عمر گھر میں بیٹھی رہتی، اس جرم کا تو تاوان ادا کرتی رہی ہوں ترئین بیٹی کی خدمت کر کے۔ خدا مجھے معاف کرے۔''

فاطمہ بی کی آواز پر ترئین کا دل جیسے ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا۔

کیا اس دنیا میں کہیں بھی بے غرض محبت نہیں ہوتی؟ تو فاطمہ بی اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرتی تھیں۔'' وہ کمرے میں آ کر بیٹھ گئی۔

سب مہمان جا چکے تھے۔ پھپھو کو بھی آج چلے جانا تھا۔ پرسوں سے رمضان کا مہینہ شروع ہو رہا تھا۔ اسی لیے سب کو جانے کی جلدی تھی۔ عاشو اپنے خاوند سے خلع لے رہی تھی۔

''عاشو! اگر تم خلع لے لو تو پھر پلیز ادھر مت آنا۔ تمہیں معلوم ہے نا یہ گھر میرے اور تیمن کے نام ہے۔ اتنا عرصہ میں نے محض تایا ابو کی محبت میں تم لوگوں کو رہنے کی اجازت دی، مگر اب نہیں۔ تیمن کے پاس اپنا گھر نہیں۔ وہ کرائے کے فلیٹ میں رہ رہی ہے۔ چند دنوں تک وہ ادھر آ جائے گی، تم لوگوں نے دادا جان کی جائیداد پر خوب عیش کر لیے۔ بہر حال اب حقدار کو اس کا حق ملنا ضروری ہے۔ میرا خیال ہے آپ سب کو مجھ سے اتفاق ہو گا۔ کل

وکیل صاحب آ کر سب پیپرز چیک کروا دیں گے۔"

تزئین کا جملہ زور و شور سے اپنی خلع کے بارے میں سب کو بتاتی عاشو کے لیے اس قدر اچانک تھا کہ ایک لمحے کو کمرے میں جیسے موت کا سناٹا چھا گیا۔ شفق، عاشو، پھپھو، سعد، راحیل انکل، تیمن احمر اور شبیر بھائی سب حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔

"یہی وہ حق تھا جو تایا ابو ساری زندگی پاپا کو دینے کا حوصلہ نہ کر سکے۔ تائی امی کی غاصبانہ طبیعت کی وجہ سے، جس کا بوجھ وہ دونوں اپنی قبروں میں لے کر گئے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ تیمن! تم کل پرسوں تک اپنا سامان لے کر ادھر آ جاؤ۔" وہ اٹھی اور بڑے وقار سے چلتی کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

"یہ...... یہ کہاں سے آ گئی وارث ہمارے گھر کی۔ ان کی ایسی کی تیسی میں دیکھ لوں گی اسے شبیر بھائی آپ کیوں نہیں بولتے۔"

عاشو اس کے جاتے ہی بھڑک اٹھی۔

وہ تو پتا نہیں، کبھی کسی نے ذکر نہیں کیا۔" شبیر بھائی بولے۔

"پھپھو! اب آپ بھی سعد کی شادی کر دیں۔ اب کیا اس کو بوڑھا کر کے بیاہیں گی؟" شفق کچھ دیر بعد سعد کی طرف دیکھ کر طنز سے بولی۔

"تمہیں میری فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" وہ بھلا چپ رہنے والا تھا۔

یہ سن کر تیمن اٹھ کر باہر نکل گئی۔



"ہیلو مینجر صاحب! کیا حال ہے؟ آپ سے ملنے کے لیے تو باقاعدہ ویٹنگ روم میں بیٹھنا پڑتا ہے۔" سعد نے اس کے آفس میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"اے محترمہ! ٹائم چاہیے تھوڑا آپ کا۔" اس نے ٹیبل بجایا۔

"مسٹر سعد راحیل! یہ آفس ہے۔" وہ زور دے کر بولی۔

"معلوم ہے مجھے، گھر پر ملتی ہی نہیں ہو ہر وقت کمرہ بند اور نہ گھر میں موقع ملتا بات کرنے کا، میں آج جا رہا ہوں۔"

"پھر......؟" وہ قلم ہاتھ میں گھما کر بولی۔

"چائے وائے نہیں پوچھو گی؟" تزئین نے اسے گھورا۔

"بہت بے ایمان ہو، بے مروت۔ ویسے لنچ ٹائم ہے۔ چلیں کہیں......"

"پلیز سعد! آپ کو جو بات کرنی ہے کریں۔"

"وقت میرے پاس بھی نہیں ہے لیکن تزئین ایسے کب تک چلے گا۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"کیا"

"مما خواہ مخواہ ضد پر اڑی ہوئی ہیں، لیکن میں انہیں منا سکتا ہوں۔ رہ گئی بات کہ وہ دل سے راضی ہوں تو وہ بعد میں ہوتی رہیں گی۔ بارات میں کورم پورا ہو گا مما سمیت، بس تم ہاں کہو۔"

"نہیں، جب تک پھپھو خود پہلے کی طرح دل سے میری طرف نہیں آئیں گی، اس وقت تک نہیں۔" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

"ایسی کی تیسی تمہاری ضد کی۔" وہ دانت پیس کر بولا۔ "شادی تو تمہاری مجھ سے ہو گی۔ بس یہ رمضان گزر جائے، تمہاری یہ ضد بھی میں پوری کروں گا اور آخری بات۔" وہ کھڑا ہو گیا "تم جب بھی پکارو گی مجھے اپنے پاس پاؤ گی، اللہ حافظ۔" وہ جھٹکے سے نکل گیا۔

اس دن سولہواں روزہ تھا۔ تیمن اور احمر چند دن پہلے یہاں شفٹ ہو چکے تھے۔ شبیر بھائی اپنی دونوں بچیوں کے ساتھ یہیں رہ رہے تھے۔ ان کی بیوی نے طلاق لے لی تھی اور آج کل وہ جاب کی تلاش میں تھے تیمن دونوں بچیوں کو بخوشی سنبھال رہی تھی۔ ویسے بھی دونوں بچیاں بہت خوبصورت تھیں تزئین کو بھی بے ساختہ ان پر پیار آیا کرتا تھا وہ آفس سے آنے کے بعد ان کو کمپنی دیتی تھی۔

اس دن افطاری کے بعد تیمن اس کے پاس آ کر بیٹھی۔ اسے لگا تیمن کل سے اس سے کچھ کہنا چاہ رہی ہے۔ اسی وقت اس کی کولیگ کا فون آ گیا۔ تیمن کی الجھن پھر درمیان میں رہ گئی، پھر کچھ مہمان آ گئے؟ بات کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔

صبح وہ جلدی جلدی آفس کے لیے تیار ہو رہی تھی، جب تیمن اس کے کمرے میں چلی آئی۔

"تزئین! ایک ضروری بات کرنی ہے۔" وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

"ہاں بولو......" وہ تیزی سے جوتوں کے اسٹریپس بند کرتے ہوئے بولی۔

"تزئین!" وہ چپ کر گئی۔

"ہاں بولو، مجھے دیر ہو رہی ہے۔" وہ دوپٹہ اوڑھتے ہوئے بولی۔

"تزئین! تمہیں شبیر بھائی نے پرپوز کیا ہے۔" سیمی کی بات اس قدر اچانک تھی کہ تزئین......ایک لمحے کو ساکت ہو گئی۔

"کیا مطلب؟" کافی دیر بعد اس کے منہ سے نکلا۔

"پرپوزل کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ وہ اب پاکستان میں رہنا چاہتے ہیں...... جلدی ہی جاب بھی مل جائے گی، ویسے تم بھی ٹھیک ٹھاک کما لیتی ہو۔"

یہ سیمی اس سے کس لہجے میں بات کر رہی تھی۔ اس نے کچھ حیرت سے دیکھا۔

"ہاں تاکہ پھر انہیں مستقل رہائش کے لیے بھی یہاں رہنے کا جواز مل جائے۔" چبا چبا کر بولی۔

"اور جو چند سال پہلے تمہارے دل کا خبط تھا۔ پوچھا کرتی تھیں تم اس اپالو کے کو وہ جذبات۔"

"وہ تو عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔ اچھی چیز خواہ مخواہ حاصل کرنے کو جی چاہتا ہے۔" سیمی نے جیسے اپنی ہی ہنسی اڑائی۔

"پہلے انہیں تم بھی نظر نہیں آتی تھیں۔ اب مجھ سے بھی راضی ہیں۔ اس کو علم کیوں؟" اسے بہت غصہ آ رہا تھا۔

"اس میں حرج بھی کوئی نہیں تزئین! وہ خود خواہش مند ہیں تمہارے لیے۔ اپنے ہیں، دوسرے تمہاری بھی تو اب ٹھیک ٹھاک عمر ہو چکی ہے۔ ایک دو سال اور گزر گئے تو بہت مشکل ہو جائے گی۔ "کل کو اگر میں انہیں پسند کرتی تھی اب انہوں نے تمہیں کیا ما اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

اس کی اتنے سالوں کی لیاقت، نیک نامی کے لیے جدوجہد سب خاک میں آ رہی تھی۔ بس ایک ہی جملہ بڑے بڑے حرفوں میں اس کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہا

"کیا فرق پڑتا ہے، کیا فرق پڑتا ہے۔"

وہ ان ہی حرفوں کے بگولوں میں اڑتی نہ جانے کب گھر سے باہر نکل آئی، اسے اردگرد کا کچھ پتہ نہیں تھا، دیوانوں کی طرح ایک ہی جملے کے تعاقب میں جیسے بھاگی جا رہی تھی۔

"کیا فرق پڑتا ہے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔"

شاید چلتے چلتے وہ ساری زندگی ہی تمام کر دیتی کہ گاڑیوں کا بے ہنگم شور جیسے اسے ہوش میں لایا۔

وہ جی پی او کے سامنے حواس باختہ سی کھڑی تھی۔ اس نے جی پی او کی پروقار عمارت کو دیکھ کر ایک گہرا سانس لیا جیسے اس کا سفر تمام ہوا۔



"سعد! تمہاری کوئی ارجنٹ میل آئی ہے۔ آفس سے صابر نے دی ہے، ابھی ابھی۔ تم نکلے ہوگے گھر کے لیے، تو یہ آئی ہوگی۔" ثمینہ پھپھو نے لفافہ اس کی طرف بڑھایا تو جوتوں کے تسمے کھولتے اس کے ہاتھ رک گئے۔ اس نے میل کھول کر پڑھی۔

"اوہ!" وہ فوراً اٹھا اور فون پر کوئی نمبر ملانے لگا۔

"کیا لکھا ہے؟" ثمینہ بے قراری سے بولیں۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"جی ایمرجنسی ہے۔ یار! ابھی دو ٹکٹیں لاہور کے لیے کنفرم کر کے بھیج دو، ایک گھنٹے بعد ہے نا فلائٹ، چانس پر، اوکے بس ہم پہنچ رہے ہیں۔" اس نے فون رکھ دیا۔

"خیریت، کیا بات ہے مجھے تو بتاؤ۔"

"مما! آپ تیار ہیں نا، ہمیں ابھی لاہور جانا ہے، تزئین نے بلایا ہے۔ میں اب مزید دیر نہیں کر سکتا۔ پہلے ہی آپ کی ضد نے اتنے سال لگا دیے ہیں۔ میرا آپ کو ذرا بھی خیال نہیں آیا تو کیا مجھے آپ کا، آپ کی ضد کا مزید خیال رکھنا چاہیے؟" وہ تیکھی نظروں سے سوال کر رہا تھا۔

"نہیں......" وہ جیسے تھک کر بولیں۔

وہ پلٹ کر جلدی جلدی وارڈ روب سے اپنے چند جوڑے نکال کر سوٹ کیس میں

رکھنے لگا۔

"کیا لکھا ہے۔ تزئین نے؟ دکھاؤ مجھے۔ خیر تو ہے؟" وہ پریشان ہو کر سیل اٹھا کر پڑھنے لگیں۔

"اس میں تو کچھ بھی نہیں لکھا۔" وہ حیران نظروں سے کاغذ کو دیکھ کر بولیں۔

"ممی! لکھا تو ہے۔" وہ بریف کیس بند کرتے ہوئے بولا۔

"صرف ایک لائن۔ غم دنیا سے گھبرا کر تمہیں دل نے پکارا ہے۔"

مگر تزئین کا پیغام سعد کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ انہوں نے مسکرا کر سعد کو دیکھا وہ بھی ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کچھ سمجھیں آپ؟"

"بالکل، بہت اچھی طرح سے، میں تمہارے پاپا کو فون کر دوں، وہ بھی جلدی پہنچنے کی کوشش کریں۔ اب تاخیر تو میں چند گھنٹوں کی بھی برداشت نہیں کروں گی۔ تم گاڑی نکالو میں آ رہی ہوں۔ ڈرائیور کو لے لینا تاکہ وہ گاڑی واپس لے آئے۔"

وہ مسکراتے ہوئے باہر نکل گئیں تو سعد ایک مدت بعد جیسے کھل کر مسکرایا۔

گھر ہونے تک

"ٹو۔ٹو۔ٹو۔ٹو۔ٹو۔ٹو۔ٹو۔ٹو۔ ......" فون کی گھنٹی بجے جا رہی تھی اور سارے گھر والے جیسے بھنگ پی کر سوئے ہوئے تھے۔ اس نے کوفت سے پہلو بدلا "بجتی رہے، میں کیا کروں۔" فون کرنے والا بھی ڈھیٹ تھا یا مستقل مزاج۔ اس نے تکیہ سر کے نیچے سے نکال کر کانوں میں گھسیڑنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ بیل بجے جا رہی تھی۔ "ٹو۔ٹو۔ٹو۔ٹو۔ ......" وہ مارے غصے کے اٹھ بیٹھی۔

"آخر اس پورے گھر میں میری نیند ہی اس قدر ہلکی کیوں ہے؟"

آج اپنی نیند پر بھی بے حد غصہ آیا حالانکہ نیند تو بہت آ رہی تھی مگر یہ فون کمبخت۔ وہ پیر پٹختے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ڈیڈی تو کلینک سے آ چکے ہیں۔ ان کا فون نہیں ہو سکتا۔" کاریڈور سے باہر ان کا اے سی چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ اے سی ڈیڈی ہی آ کر چلاتے تھے۔ امی کو تو اے سی سے چڑ تھی۔ دانیال کے کمرے کا دروازہ بھی بند تھا۔

تین بج کر چالیس منٹ ہو چکے تھے۔ باہر کڑکتی دھوپ لشکارے مار رہی تھی۔ لاؤنج کی کھڑکی کا پردہ ذرا سا سرکا ہوا تھا۔ "اف توبہ" کتنے دنوں سے تو سورج آگ اگل رہا تھا۔ لگاتار ایک ہفتے سے شدید گرمی پڑ رہی تھی، بارہ نہیں بجتے تھے کہ باہر الو بولنے لگتے تھے، صرف گھروں میں ہی سکون تھا۔ گھر سے باہر تو نار جہنم دہک رہی تھی۔

"ہاں۔ اس بھری دوپہر میں بھلا کون فون کی فریاد سنے گا۔" ریسیور اٹھاتے ہوئے اس نے خود ہی سب کے سونے کے حق میں ووٹ دیا۔

"ہیلو" کوشش کے باوجود بیزاری اس کے لہجے سے عیاں ہو ہی گئی، حالانکہ وہ

بڑے سے بڑے موقع پر بھی اپنے احساسات عیاں نہیں ہونے دیتی تھی۔ دوسری طرف اس کا "ہیلو" سنتے ہی کوئی پرسکون ہو گیا، جیسے لاونج کی ٹوٹو سے گونجتی فضا پرسکون ہو گئی تھی۔ اسے اور غصہ آ گیا، کہاں تو مسلسل فون کی بیل سے دماغ خراب کر رکھا تھا اور اب۔

"ہیلو۔ بولیں نا اب؟" اس نے ذرا زوردار آواز میں ڈپٹ کر کہا۔ ایرپیس میں کسی کے گہرا سانس لینے کی آواز ابھری۔

"درشہوار!" گمبھیر زنانہ آواز میں ایک لمحے کا توقف۔ "آپ درشہوار ہیں نا؟"

آواز اس کے لیے قطعاً اجنبی تھی اور کسی اجنبی کا اس طرح اسے اپنائیت و محبت سے پکارنا چہ معنی۔ وہ لمحہ بھر کو چپ سی رہ گئی۔

"ایم آئی رائٹ۔ آپ درشہوار ہیں نا؟" آواز کی گمبھیرتا نے اسے جیسے کسی سحر میں جکڑ لیا۔ سرخ ڈوروں والی آنکھوں سے نیند اڑنچھو ہو گئی۔ خوابیدہ حواس چاق و چوبند ہو گئے۔

"ہاں۔ ہاں۔ جی۔" اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولنے کی کوشش کی۔

"اس بے وقت فون کرنے پر معذرت خواہ ہوں درشہوار!" اتنی محبت سے اس کا نام بھی کسی نے نہ لیا تھا۔ وہ عجیب سی کشمکش میں گھر گئی۔

"آپ۔ آپ کون؟" اس کی زبان خواہ مخواہ ہکلا گئی۔

"آپ مجھے نہیں جانتیں؟" لہجے میں کچھ مایوس کن حیرت تھی۔

"سوری۔ میں نے آپ کو نہیں پہچانا۔" وہ اندر تک اپنی اس نااہلی پر شرمندہ ہو گئی، حالانکہ اس کی یادداشت بہت تیز تھی۔ بچپن کے واقعات جو باقی بہن بھائیوں کو فراموش ہو چکے تھے۔ اسے بمعہ سیاق و سباق وسن کے یاد تھے اور سب اس کا مذاق اڑاتے تھے کہ تم تو باوا آدم کے زمانے کی پیداوار ہو۔

"درشہوار!" اتنی توجہ، اتنی محبت پر وہ کسمسا کر رہ گئی۔ اس کی مخاطب اس کا نام انتہائی عقیدت سے لے کر بار بار اسے اسیر کر رہی تھی۔ نام لینے کے بعد تھوڑا خاموشی کا وقفہ ضرور ہوتا تھا۔

"میں شیریں ہوں۔ آپ کے گھر آئی تھی نا۔"

اس نے اسی میٹھے سحرزدہ لہجے میں اپنا تعارف کرایا اور درشہوار بی بی منہ کھولے ہونق

بی سوچتی رہ گئیں۔

"کون، شیریں؟" ایک بار اپنے حافظے کو ملامت کیا جہاں ہنوز پردہ اسکرین منظر و چہرے سے خالی اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

"نہیں پہچانا!" امیدوار کی امید جیسے دم توڑ گئی۔

"سوری۔ مجھے افسوس ہے۔" اس نے شرمندہ شرمندہ لہجے میں پھر معذرت کی حالانکہ اس میں شرمندگی کی کوئی بات نہ تھی۔ اکثر ایسا ہو جاتا ہے کوئی فون کرے تو اٹینڈ کرنے والا کبھی کبھار پہلے سے تعارف ہونے کے باوجود بالکل پہچان نہیں پاتا مگر جب دوسری طرف سے آپ کو بصد تکرار اور اس محبت سے پکارا جا رہا ہو تو شرمندگی تو ہوتی ہے ناں۔

"اگرچہ ہماری ملاقات کو بہت دن تو نہیں ہوئے مگر چونکہ ہم ایسے حالات میں ملے تھے کہ آپ کا مجھے یاد رکھنا ضروری نہیں، پھر بھی مجھے آس سی تھی کہ آپ مجھے پہچان لیں گی۔" اس نے بھی اس کی شرمندگی کا حظ اٹھایا بلکہ مزید شرمندہ کیا۔

"ہم کب ملے تھے" یک نہ شد دو شد۔ گویا وہ اس سے مل بھی چکی ہے۔

"آپ کے گھر درشہوار۔" اف پھر وہی تراس زدہ لہجہ اس نے ریسیور دائیں ہاتھ اور کان سے بائیں طرف منتقل کیا۔

"کب؟" اس کی حیرت و شرمندگی بڑھتی جا رہی تھی۔

"کب سے تو آپ کو یاد نہیں آئے گا۔ اصل میں درشہوار! کچھ ملاقاتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان میں ملنا اہم نہیں ہوتا۔ ملنے کی وجہ اہم ہوتی ہے اور ہماری ملاقات میں بھی ملنے سے زیادہ وجہ ملاقات اہم تھی۔" دھیما دھیما شہد میں ڈھلا لہجہ درشہوار کی سماعتوں میں قطرہ قطرہ اترا اور بائیں کان کی فعالیت اتنی پر اثر تھی۔

اس نے جھٹ سے پھر ریسیور دائیں ہاتھ اور کان میں منتقل کیا۔

"جی!" وہ اتنی عالمانہ بات کے جواب میں یہی کہہ سکی۔

"جتنی معصوم آپ کی صورت ہے۔ اسی قدر خوبصورت آپ کا نام ہے۔ جس دن سے آپ کو دیکھا ہے جی کرتا ہے۔ آپ کو سامنے بٹھا کر آپ کا نام جپتی رہوں۔ بے تابا پاگلوں جیسی خواہش۔" لہجے کی پرسکون ندی میں ہنسی کا ہلکا سا بھنور اٹھا اور درشہوار کے حواس ساتھ چھوڑ رہے تھے اس قسم کی تعریف تو صنف مخالف سے متوقع ہے اگر یہ کوئی خاتون نہ ہوتی تو اب تک

درشہوار ریسیور میں سے ہی اس کا منہ نوچ لیتی۔

''ہم لوگ آپ کے گھر آئے تھے پچھلے ماہ کی ستائیس تاریخ کو یعنی آج سے ٹھیک بارہ دن پہلے فرائی ڈے کی شام کو۔ میں اور بلقیس آپا آپ کے ڈرائنگ روم میں۔ کچھ یاد آیا۔'' دل میں اتر جانے والی مدھم سروں میں بولتی آواز۔ درشہوار کی شامت شائستہ لہجے کو دل میں سموئے یا گفتگو کا ماحصل سمجھے۔

''جی!'' وہ بے دھیان لہجے میں بولی فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ''جی نہیں۔''

''ویری انوسینٹ (بہت معصوم)'' ہلکی سریلی ہنسی۔ ''ہم آپ کو دیکھنے آئے تھے۔ میں اپنے بھائی یوسف جاہ کے لیے۔ آپ نے پیلے رنگ کا امبر ائیڈڈ کاٹن کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ جس کا دوپٹہ دھنک رنگ کا تھا۔ آپ کچھ دیر کے لیے میرے پاس آ کر بیٹھی تھیں۔ آپ کے ڈرائنگ روم میں جو مخمل کا صوفہ سیٹ کارنر میں پڑا ہے۔ اس کے تو سیٹڈ صوفہ پر آپ آ کر میرے پاس بیٹھی تھیں۔ آپ نے جاسمین کی ہلکی خوشبو لگا رکھی تھی۔ میک اپ سے بے نیاز آپ کا نکھرا ہوا سا روپ سیدھا میرے دل میں اتر گیا تھا۔ میں نے آپ کو پہلی نظر میں ہی او کے کر دیا تھا۔ میں نے لائٹ پرپل کلر کا سوٹ بلیک شوز کے ساتھ پہنا ہوا تھا۔ یاد آیا؟'' اتنی تفصیل سے اگر کوئی نیند میں بھی بتاتا تو وہ فوراً اٹھ بیٹھتی اور وجہ ملاقات نے اس کی زبان پر قفل دیے۔ وہ چپ رہی۔

''درا! آپ نے جواب نہیں دیا'' وہ تو جیسے اس کے سامنے بیٹھی اس کا ایک ایک انداز دیکھ رہی تھی۔ درشہوار کے ہاتھ خواہ مخواہ ہی ٹھنڈے ہو گئے۔ جیسے اس جمعہ کی شام کو ہوئے تھے۔

''جی!'' پھنسی پھنسی سی آواز اس کے خشک حلق سے برآمد ہوئی۔ اسے یاد آیا، اس نے لنچ کے بعد پانی بھی نہیں پیا تھا۔ سخت پیاس لگی ہوئی تھی۔

''اسی ''جی'' کا تو مجھے جی جان سے انتظار تھا۔ اس جمعہ کے بعد اگلے فرائی ڈے کو آپ کے پیرنٹس ہمارے گھر آئے۔ انہوں نے یوسف جاہ کو دیکھا، پسند بھی کیا۔ اس کو دیکھ کر کوئی بھی ناپسند نہیں کر سکتا۔ درا میرے بھائی کو جو ایک نظر دیکھ لیتا ہے۔ وہ اس کی وجاہت کا متوالا ہو جاتا ہے، پہلے زمانوں میں اگر کسی یوسف کی خاطر مصر کی عورتوں نے اپنی انگلیاں کٹوائی تھیں تو آج کے زمانے میں اسی طرح اگر عورتیں یوسف جاہ کو دیکھ لیں تو اپنے سر کٹوا

لیں۔ درا میں جھوٹ نہیں بولتی ذرا بھی۔'' پر تاثر اپنائیت بھرا انداز جیسے وہ اس سے زمانوں سے شناسا ہے۔

''پھر بھی نامعلوم کیوں درا۔'' شیریں لہجے میں یاس اتر آئی۔ ایک گہرا افسردہ سانس لیا گیا۔ ''پھر بھی نامعلوم کیوں آپ کے پیرنٹس نے انکار کر دیا۔ میرا بھائی اگر مردانہ حسن و وجاہت میں بے مثال ہے تو ہمارا گھر بھی بے مثال ہے۔ گھر میں اماں، میں، بابا اور یوسف جاہ ایک ہی چھت کے نیچے محبت کی کڑیاں ہیں اور درا یوسف کی پرکشش جاب۔ کوئی بھی والدین انکار نہیں کر سکتے۔''

درشہوار کیا جواب دیتی۔ وہ چاہتی بھی تو اپنی پرخلوص مخاطب کو اس سلسلے میں کوئی دلاسا، کوئی تسلی نہیں دے سکتی تھی۔

''درا اس کے باوجود میں مایوس نہیں ہوں۔ میں ایک بار، دو بار، دس بار پیغام بھیجوں گی۔ آپ کے لیے۔ آپ کی خاطر اگر مجھے آپ کے گھر کی دہلیز پر ناک بھی رگڑنی پڑی تو رگڑوں گی۔ درا میں نے پہلی نظر میں آپ کو اپنا بنا لیا ہے۔ اپنے خوبرو بھائی کے لیے پسند کر لیا ہے۔ اب چاہے کچھ ہو جائے میں آپ کے والدین کی بے وجہ ''نہ'' کو محبت بھری ''ہاں'' میں بدل کر رہوں گی۔''

دھیمے لہجے میں الفاظ سخت تھے مگر ان کا استعمال انتہائی نرم طریقے سے کیا گیا تھا۔

وہ چپ رہی۔

''درا میں آپ کو بھی کبھار فون کر لوں جب تک ''نہ'' ہاں میں نہیں بدل جاتی۔ اس وقت تک۔'' محبت بھری التجا۔

''جی!'' وہ بری طرح سے چونکی۔ ''جی نہیں۔''

''درا! آپ میرے بھائی سے ملیں گی؟ لوگ سارے دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں۔ اپالو زمین پر آ گیا۔ وہ بنا بنایا شہزادہ ہے۔ ہاتھ لگاؤ تو ڈر لگتا ہے۔ حسین سپنا ٹوٹ نہ جائے اور درا میں اس حسین سپنے کو آپ کا مقدر بنا کر رہوں گی۔ میں دن رات اس کے ساتھ آپ کو چلتا پھرتا ہنستا بولتا دیکھ رہی ہوں درا! آپ کو ہمارے گھر ہی آنا ہے۔ آئی نو۔''

مضبوط انداز، پر یقین لہجہ۔ درشہوار کے ہاتھوں میں پسینہ آ گیا اور وہ مروت کی ماری اس کو ڈانٹ بھی نہ سکی نہ جھڑک سکی نہ جھنجھلا کر فون بند کر سکی۔ بس اس کے ارادوں کو کان

سے لگائے سُنتی رہی۔

''درشہوار! آپ کو یوسف جاہ سے ملنا ہے۔ آپ میرے بھائی کو دیکھیں گی تو آپ کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آئے گا کہ قدرت نے اتنا حسین مقدر آپ کا بنایا ہے۔ رنگیلی ورا! آپ یوسف جاہ کو دیکھ کر خود اپنی قسمت پر رشک کریں گی۔''

''پلیز! فون بند کریں۔ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ میرا اس معاملے سے کیا تعلق۔ اگر میرے والدین انکار کر چکے ہیں۔'' مگر وہ یہ سب محض دل ہی میں کہہ سکی ''پلیز'' کے بعد اس کی زبان پر تالے پڑ گئے۔ کوشش کے باوجود وہ خشک زبان کو تالو سے جدا نہ کر سکی۔

''میں ایک دو روز میں پھر آپ کو فون کروں گی اور بے وقت ڈسٹرب کرنے پر ایک بار پھر معذرت۔'' ''اللہ حافظ۔''

اس نے درشہوار کے جذبات، خیالات یا احساسات کسی کو بھی جاننے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اپنا مدعا بیان کر کے اس نے کھٹ سے فون بند کر دیا اور درشہوار بے جان ریسیور ہاتھ میں لیے بیٹھی رہ گئی۔

ہاں اس روز جب صائمہ نے اس سے کہا تھا۔

''آہا تو تمہاری بیری پر بھی پہلا پتھر آن گرا۔''



آفاق بھائی سب سے بڑے تھے بہن بھائیوں میں۔ اس کے بعد سیما آپی پھر دانیال پھر درشہوار۔ ڈیڈی ہارٹ اسپیشلسٹ تھے۔ ڈسٹرکٹ ہاسپٹل میں ہاؤس سرجن تھے۔ اس کے علاوہ شہر کے معروف ترین علاقے میں ان کا کلینک تھا۔ آفاق بھائی ڈیڈی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ڈاکٹر بنے تو ڈیڈی کی خواہش تھی کہ وہ ان کی طرح گورنمنٹ جاب کریں اور ان کے کلینک میں جا کر بیٹھا کریں۔ آفاق بھائی شروع ہی سے ڈیڈی کو آئیڈیلائز کرتے تھے۔ ڈیڈی کی خواہش ان کے سر آنکھوں پر۔ انہوں نے ای این ٹی اسپیشلسٹ کی حیثیت سے ان کا کلینک جوائن کیا اور ڈسٹرکٹ ہاسپٹل میں بھی ڈیڈی نے انہیں اپائنٹ کرا لیا۔ مگر چند ہی دنوں میں وہ جیسے دونوں جگہ سے فیڈ اپ (بیزار) ہو گئے انہیں ہر پل، ہر لمحہ بات بے بات غصہ آنے لگا۔ خواہ مخواہ وہ ہر کسی سے الجھنے لگے۔ امی کی محبت بھری نصیحتیں بھی انہیں آگ بگولہ کر دیتیں۔

''بیٹا! اتنا کام کرتے ہو، اپنی صحت کا بھی دھیان رکھو دن بدن کمزور ہوتے جا رہے ہو۔ ہاسپٹل سے تم اتنا لیٹ آتے ہو اور آتے ہی کلینک بھاگ جاتے ہو نہ کھانے کا ہوش نہ آرام کا۔ اس طرح تو تم بیمار پڑ جاؤ گے۔''

وہ ان دنوں واقعی کمزور ہو رہے تھے۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑنے لگے تھے۔ رات گئے تک ان کے بیڈ روم کی لائٹ جلتی رہتی، پہلے بھی وہ رات گئے تک بلکہ اکثر ساری ساری رات پڑھا کرتے تھے مگر اب جبکہ وہ ایک مرتبہ حاصل کر چکے تھے دن بھر اپنے پروفیشن سے بقول امی جی بھر کے انصاف بھی کرتے تھے اور آرام نہ کرنے کے برابر کرتے تھے۔ تو رات یا کم از کم آدھی رات تو انہیں ضرور آرام کرنا چاہیے۔ صبح صبح اٹھ کا جاگنگ اور ایکسرسائز میں بھی غفلت نہیں برتتے تھے اور سچ تو یہ تھا وہ سب بہن بھائیوں میں سب سے زیادہ ایکٹو تھے۔ ذہنی طور پر بھی اور جسمانی طور پر بھی۔ مگر ان دنوں جب ان پر بیزاری کا بھوت سوار تھا، انہوں نے جاگنگ اور ایکسرسائز ترک کر دی جو کہ بہر حال سب کے لیے تشویش ناک عمل تھا۔ اسی لیے امی ان کو نصیحت کر بیٹھیں اور وہ تو بھڑک ہی اٹھے۔

''کمزور دکھائی دیتا ہوں میں آپ کو؟'' اپنی شہادت کی انگلی سے اپنے سینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے زوردار آواز میں کہہ کر وہ ایک دم سے کرسی سے کھڑے ہو گئے۔ ''امی! تو پھر آپ کو معلوم ہی نہیں کہ کمزور کہتے کس کو ہیں۔ جائیں جا کر دیکھیں۔ سرکاری اسپتالوں میں لوگ نیم جان، نیم زندہ، نیم مردہ حالتوں میں برآمدوں میں، کاریڈور میں، گراؤنڈز میں ڈاکٹرز کی ایک نظر التفات کے محتاج پڑے ہیں اور ڈاکٹرز کے پاس اتنا ٹائم نہیں کیونکہ انہیں ہاسپٹل میں اپنی حاضری لگانے کے بعد فوراً اپنے کلینک کا رخ کرنا ہوتا ہے، جہاں وہ موٹی موٹی فیسوں سے اپنی جیبیں بھرتے ہیں تو پھر انہیں ذرا بھی تھکاوٹ نہیں ہوتی۔ بے آرامی بھی نہیں ہوتی اور وہ خالی پیٹ کام میں مصروف رہیں تو امی! انہیں کمزوری بھی نہیں ہوتی تو پھر مجھے کیسے کمزوری ہو سکتی ہے۔ میں تو آج کل ڈیڈی کے ساتھ مل کر خوب جیبیں بھر رہا ہوں پھر میں کمزور کیسے ہو سکتا ہوں۔''

طنز، غصہ، نفرت نامعلوم ان کے لہجے میں کیا کیا تھا، درشہوار، دانیال اور امی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے بے حس انہیں دیکھتے رہے۔

''کمزور تو امی! وہ ہیں جو دور دراز علاقوں سے اپنے کندھوں پر اپنے بیماروں کی

بیماری نے نیم جان لاشیں اٹھائے شہر کے مسیحاؤں کے پاس لاتے ہیں۔ سارا سارا دن گرمی سردی کی شدتوں کو جھیلتے ہوئے ہاسپٹل کے برآمدوں میں، گراؤنڈز میں ان کے بھلے ہونے کی آس میں دیوانہ وار پھرتے ہیں۔ اپنی عمروں کے سرمائے بیچ بیچ کا ڈاکٹرز کی عطا دوائیں اور ٹیسٹ کرواتے ہیں اور اگر ان کی قسمت اچھی ہو تو مریض اچھا ہو جاتا ہے قسمت سے اچھی جیب ہو تب ورنہ ہاسپٹل کے ڈاکٹرز، وہاں کا بے حس عملہ ان کے پیارے کو قبر میں اتارنے میں ان کی خوب مدد کرتے ہیں۔ امی! وہ کمزور لوگ ہیں اور پھر اس کھلے عام پر وہ کوئی بھی احتجاج کیے بغیر ان لاشوں کو کندھوں پر اٹھا کر آنسو بہاتے سر جھکائے پسماندہ علاقوں کو لوٹ جاتے ہیں۔ کسی سے شکایت کے بجائے سب کچھ اللہ کی مرضی اور تقدیر لکھا جان کر۔"

ان کا سانس پھول گیا۔ "مگر امی انصاف سے بتائیں، کیا یہ اللہ کی مرضی ہے۔ علاج کی سہولتوں کے فقدان کے باعث ڈاکٹرز کے بے حد رویے اور عملے کے ظالمانہ سلوک بنا پر لوگ بستر پر پڑے پڑے بلکہ اکثر کو تو بستر بھی نصیب نہیں ہوتا۔ ننگی زمین پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے دیتے ہیں۔ کیا یہ سب اللہ کی مرضی ہے بولیں؟"

"آفاق! کیا ہو گیا ہے بیٹا تمہیں؟" امی ان کی جذباتیت پر پریشان ہو اٹھیں۔

"پاگل ہوا ہوں میں۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسے۔ "لیکن اگر یہ حالات اسی طرح رہے جو کہ رہیں گے تو امی! میں پاگل ہو جاؤں گا۔ پاگل ہو جاؤں گا میں۔ معاشرے کی گلی سڑی لاش سے اٹھتی بدبو مجھے پاگل کر دے گی۔ بالکل پاگل۔"

وہ ناشتہ ادھورا چھوڑ کر بڑبڑاتے ہوئے تقریباً بھاگتے ہوئے ڈائننگ روم سے نکل گئے۔

"کیا ہو گیا ہے اس لڑکے کو؟" امی نے ٹھنڈی چائے کا کپ پرے سرکا دیا۔

"امی! بھائی کو انسانیت کی ہمدردی کا بخار چڑھا ہے۔ آپ فکر نہ کریں، صرف چھ ماہ جب وہ ان سارے مناظر کے عادی ہو جائیں گے تو خود ہی بخار اتر جائے گا جیسے روز بکرے اتارتا ہے پھر نہ تو وہ کسی بکرے کے ذبح ہونے کی تکلیف پر بے چین ہوتا ہے۔ ان کی مظلومیت پر لمبی لمبی تقریریں جھاڑتا ہے۔ بس بکرے کو ٹانگ کے نیچے دباتا ہے اور اکبر" چھری چلا دیتا ہے۔ اب اس کے آگے خون کی نہر بہہ رہی ہو، وہ کیجے گا پانی ہے

ادھر ادھر بکرے کے گردے، رانیں، گردن علیحدہ کیے جاتا ہے۔ بڑی تندہی سے۔"

دانیال نے جس تفصیل سے بکرے کے ذبح کا نقشہ ان کی آنکھوں کے آگے کھینچا۔ درشہوار کو لگا اس کی پلیٹ میں آملیٹ نہیں تازہ تازہ کٹے بکرے کے گردے اور دل پڑا ہے۔ اسے ایک دم سے ابکائی آنے لگی۔

"بکواس کیے جاؤ فضول۔ بھلا یہاں کیا تک ہے بکرے کو ذبح کی تفصیل کرنے کی۔" امی کو بھی غصہ آ گیا۔ ہاتھ میں پکڑی چھری انہوں نے زور سے ٹیبل پر پٹخی۔

"امی! یہ دانی کا بچہ پچھلے دو ہفتوں سے فضل کے ساتھ گوشت لینے قصاب کی دکان پر جو جا رہا ہے اس لیے۔" درشہوار نے اس کی معلومات کا ماخذ بتایا۔

"امی! ہم لوگ تو یونہی قصائیوں کو برا بھلا کہتے ہیں یا انہیں کمتر جانتے ہیں۔ امی! وہ تو پورے آرٹسٹ ہیں۔ بکرے کو ذبح کرنا اور پھر جس مہارت اور نفاست سے ان کے جسم کے حصے قصاب بھائی اتارتا ہے۔ یہ تو بڑا فن ہے۔ امی! ہر بندہ یہ کام نہیں کر سکتا۔ ہاں ڈاکٹرز اس معاملے میں ان سے کسی حد تک مطابقت رکھتے ہیں۔ چیر پھاڑ کھال، خون، گردے، پسلیاں، آنتیں، دل، پھیپھڑے......"

"دانی! شٹ یور ماؤتھ۔" درشہوار کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ وہ زور سے چیخی؟

"بہنا! اتنی جیلسی اس فن سے۔ کسی دن چلنا تم میرے ساتھ۔ ایمان سے، تم بھی مان جاؤ گی کہ یہ فن کتنا قدیم اور کتنا محنت و توجہ طلب ہے۔ ذرا چھری بہکی نہیں کھال پر، ذرا سا کٹ بھی کھال کو بیکار کر دیتا ہے۔ مجھے بھولا قصائی بتا رہا تھا۔" اس نے امی کی بے تحاشا گھورتی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ذرا کھسیانے لہجے میں کہا۔

"اٹھو!" امی نے غصے سے اسے ہاتھ کے اشارے سے کہا "نکلو ادھر سے۔ تمہارے کالج سے تمہیں دیر ہو رہی ہے۔ چلو یہاں سے فوراً سے پیشتر۔" امی کے تیور بے حد خطرناک تھے۔ وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

"امی! میں تو بتا رہا تھا کہ بھائی بھی قصاب کی طرح جلد ہی عادی......" وہ گھبرا گھبرا کر صفائی پیش کرنے لگا۔

"دانیال! خاموش ہو جاؤ۔" امی اتنا اونچا بہت کم بولتی تھیں۔ "نکل جاؤ یہاں

سے۔ مجھے مزید غصہ مت دلاؤ۔" وہ واقعی بہت غصے میں تھیں۔

"امی وہ میں۔" وہ ابھی جانا نہیں چاہ رہا تھا۔ "امی! ابھی تو ناشتہ کرنا ہے میں نے۔ پیٹ خالی ہوگا سارا دن تو آنتیں......"

"دانیال!" امی گرجیں۔

"سوری امی، اب کچھ نہیں بولوں گا۔ بس چائے پی لوں۔" اس نے فوراً صورت بنا کر دونوں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے چائے کا لبالب بھرے کپ کی طرف ہوئی نظروں سے دیکھا۔ چائے اس کی کمزوری تھی۔ جس کو دیکھے بغیر وہ آنکھیں نہیں کھولتا۔ امی کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔

"چلو پی لو مگر ایک لفظ منہ سے نہ نکالنا۔"

انہوں نے سختی سے کہتے ہوئے اجازت دے دی۔



ان کی بی ایس سی کی ڈیٹ شیٹ آ چکی تھی۔ آج وہ کالج میں اپنی رول نمبر لینے آئی تھی۔ آج وہ کتنے دنوں بعد مل رہی تھیں۔ شاید مہینے بعد۔ پڑھ پڑھ کر چاروں چہرے اترے ہوئے تھے۔ اپنی کلاس کی چاروں ہی بہترین اسٹوڈنٹس تھیں۔ "ویسے ڈیٹ شیٹ مجھے تو بہت پسند آئی ہے صرف ایک پیپر میں گڑبڑ ہے۔ جس کا مجھے پہلے ہی ڈر تھا۔" ربیعہ ہاتھ میں پکڑی ڈیٹ شیٹ کو ایک جگہ مارک کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔ تمہاری گڑبڑ کدھر ہے۔" ثنا نے بے نیازی سے دائیں طرف بیٹھی فرسٹ ایئر کی الیلی لڑکیوں کو دیکھا۔

"کدھر؟" ربیعہ نے ڈیٹ شیٹ فولڈ کرتے ہوئے پوچھا۔

"میکانکس میری جان۔ جس سے تمہاری جان جاتی ہے۔ کیوں درشہوار! میں نے ٹھیک کہا نا؟" اس نے چپ بیٹھی درشہوار سے کہا۔ درشہوار گم صم بیٹھی رہی۔

"ارے کدھر ہو تم؟" درشہوار اپنی کلائی میں پڑی بلیک واچ کو گھما رہی تھی ربیعہ نے اسکی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا۔

"کہیں بھی نہیں۔" وہ چونک کر بولی۔

"ربیعہ! یہ اپنی درشہوار کچھ بدلی بدلی نہیں نظر آ رہی۔" صائمہ کی نظر غضب کی تھی۔

"کچھ نہیں بلکہ بہت بدلی بدلی نظر آ رہی ہے۔" ربیعہ کون سا کم تھی

"کیا بکواس ہے۔ میں کیوں بدلوں گی بھلا۔ بدلنے کے لیے یہ کتابوں کا بوجھ کیا کم ہے جس نے سارے حواس سلب کر رکھے ہیں۔" درشہوار نے مضبوط وجہ بتائی مگر تینوں کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

"تم ہم سے کچھ چھپا رہی ہو، یہ تم مان لو۔" ربیعہ اس کا ہاتھ جھٹک کر بولی۔

"یہ ہمارا وہم نہیں۔ تم یہ مان لو۔" ثنا بھی بولی۔

"یار! بات کیا ہوئی ہے۔ کل شام امی کی جاننے والی بلقیس آنٹی کسی خاتون کے ساتھ ہمارے گھر آئی تھیں۔ میں پچھلے لان میں پڑھ رہی تھی۔ شریفاں مجھے بلانے آ گئی۔ امی کچن میں چائے کی ٹرالی لیے میری منتظر تھیں۔

"یہ مہمانوں کے آگے سرو کر آؤ۔" ان کے کہنے پر میں غصہ میں آ گئی۔

"امی! شریفاں کس لیے ہے۔ میں پڑھ رہی ہوں۔"

"پانچ منٹ کی بات ہے۔ گھر آئے مہمانوں کو اٹینڈ نہ کرنا مینرز کے خلاف ہے۔ بلقیس تمہیں یاد کر رہی تھی۔ انہیں سلام کر آؤ اور بس۔"

انہوں نے کچھ سختی سے کہا تو میں بڑبڑاتی ہوئی ٹرالی لے کر ان کے پیچھے چل پڑی۔ بلقیس آنٹی کے ساتھ خاتون عجیب سی تھیں۔ انہوں نے بس مجھے ایک نظر دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔ میں وہاں سات منٹ بیٹھی رہی کہ آج کل مجھ سے زیادہ منٹوں کا حساب کون رکھ سکتا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے سات منٹ برباد ہو رہے ہیں اور ان سات منٹوں کے دوران اس خاتون نے ذرا دیر کو بھی سر اٹھا کر مجھے نہیں دیکھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سر جھکائے کسی تسبیح میں مگن ہوں۔ ریگی میں نے ان کے ہونٹ بھی ہلتے دیکھے۔ مگر میں نے ان کی آواز نہیں سنی۔ انہوں نے میرے سلام کا جواب بھی آنکھ کے اشارے سے دیا تھا اور بس میں اٹھ کر آ گئی۔ یہ ہے کل کی بات۔" وہ تینوں دوستوں کو اپنی الجھن بتا کر چپ ہو گئی۔

"تو تمہاری دیری پر بھی پہلا پتھر آن ہی گرا۔" صائمہ کا لہجہ اور جملہ دونوں ہی اسے عجیب لگے۔ ان خطوط پر تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ تو ان خاتون کو بلقیس آنٹی کی کوئی جاننے والی سمجھ کر ملی تھی اور ایسا کوئی تاثر ان خاتون نے یا امی نے بھی نہیں دیا تھا۔

صائمہ کی بات پر اس نے حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔



"ٹو۔ٹو۔ٹو۔ٹو......" وہ پورے دھیان سے لاؤنج میں بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ جب فون کی مسلسل بیل نے اسے ڈسٹرب کیا۔ اس دن کی عجیب وغریب فون کال کے بعد اس نے اس سائنسی آلے کے قریب پھٹکنا بھی کم کر دیا تھا۔ جیسے ہی فون کی بیل بجتی، وہ اس جگہ سے کھسک کر کسی انتہائی ضروری کام میں مصروف ہو جاتی۔ اس فون کو آئے بھی تو پورے پندرہ دن ہو چکے تھے۔ اس پوری رات اسے نیند بھی ڈھنگ سے نہ آسکی تھی۔ ان خاتون کی رس گھولتی آواز اسے بار بار ڈسٹرب کرتی رہی، پہلے اس نے سوچا۔ امی سے ذکر کرے پھر عجیب سی جھجک مانع آگئی۔

"دفع کرو۔ ذہن پر سوار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" اگلے روز اس نے سر جھٹک کر سب فراموش کر دینے کا خود سے عہد کیا اور بری طرح سے پڑھائی میں جت گئی اور واقعی کچھ دنوں بعد وہ اس فون کال کو تقریباً بھول چکی تھی لیکن ابھی جو بیل بجی اس کا دل پل بھر کو دھڑکا۔

"اندر چلی جاؤں۔" وہ مسلسل بجتی بیل کو نظر انداز کر کے کھڑی ہو گئی۔ امی نماز پڑھ رہی تھیں۔ ڈیڈی ابھی کلینک سے نہ لوٹے تھے۔ کیا پتا ان کا ہی فون ہو، اس آخری سوچ پر اس نے لپک کر ریسیور اٹھا لیا۔

اس کی ہیلو"" پر دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"ہیلو!" دوسری بار اس نے کہہ کر ریسیور کریڈل پر رکھنا چاہا کہ دوسری طرف زندگی کے آثار سنائی دیے۔

"درشہوار! کیسی ہیں آپ؟" وہی آواز وہی لہجہ۔

"آپ!" وہ جھجک کر یہی کہہ سکی "آپ کون ہیں؟" یہ تو وہ کوشش کے باوجود کہہ ہی نہ سکی۔

"پہچان لیا نا!" فاتحانہ مدھم ہنسی۔ "مجھے معلوم تھا جسے میں دن میں چوبیس گھنٹوں میں چوبیس لاکھ بار یاد کرتی ہوں، وہ مجھے کیسے بھول سکتی ہے۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا در۔"

"مجھے مس کیا تھا؟" ٹھوڑی کو انگلی سے چھو کر پوچھنے کا پیار بھرا انداز۔ اسے لگا وہ

ریسیور میں سے سب کچھ آبزرو کر رہی ہیں درشہوار کے چہرے کے ہر رنگ، ہر کیفیت کو۔ اس کی ٹانگیں بے جان سی ہونے لگیں اور ریسیور کو تھامنے والا ہاتھ خفت سے پسینے میں تر ہو گیا۔

"بولیں نا درشہوار! آج میں نے کافی دنوں بعد فون کیا۔ میں نے سوچا، آپ مجھے ذہنی طور پر اپنا لیں۔ پھر میں آپ کو دوبارہ فون کروں گی۔ دوسرے مجھے معلوم ہے، آپ ایگزام کی تیاریوں میں مصروف ہوں گی۔ آج بھی زیادہ ٹائم نہیں لوں گی۔ صرف آپ سے ایک اجازت لینی ہے۔" جیسے وہ دونوں جنم جنم کی شناسا ہوں۔

"دیکھیں، میں پڑھ رہی ہوں۔" خشک حلق سے پوری کوشش صرف کر کے اس نے کہہ ہی دیا کہ آخر ایسی بھی کیا مروت حالانکہ ذہن تو مسلسل پھنکار رہا تھا۔ کہ انہیں اچھی سی جھاڑ سنا کر فون بند کر دیا جائے۔ یہ دل ہی خانہ خراب تھا جو اپنی تعریف سن کر آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا۔

"مجھے معلوم ہے ڈیر! اسی لیے کہا نا، زیادہ ٹائم نہیں لوں گی صرف یہ کہنا ہے کہ جس تاریخ کو جب آپ آخری پیپر دے کر کالج سے باہر آئیں تو میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں صرف چند منٹ کے لیے۔" انہوں نے ٹھہرے ٹھہرے انداز میں مدعا بیان کیا۔

"سوری میں۔" اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا بہانا گھڑے۔

"کوئی مسئلہ ہے کیا در؟" میٹھا محبت بھرا انداز جیسے اس کے سارے مسئلوں کو اپنے سینے میں سمو لیں گی۔

"مجھے پیپر کے بعد ڈیڈی خود لینے آئیں گے۔ انہیں یہ پسند نہیں پھر کسی۔" اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ بے ربط بہانوں کے درمیان بھی دل نے انہیں "لارا" لگا ہی دیا "پھر کسی کا۔" جو دوسری طرف کلک بھی کر گیا تھا۔

"او کے نیور مائنڈ۔ کوئی بات نہیں۔ ہم ہیں تاریخ کے بعد آنے والے منڈے کو مل لیں گے۔ آپ نے ملنے کی ہامی تو بھری۔ مجھے بس یہی اجازت چاہیے تھی آپ سے اور مجھے یقین تھا آپ مان جائیں گی اَب خوب جی لگا کر پڑھو، میں نے آپ کے لیے ڈھیر ساری دعائیں کی ہیں۔ بہت اچھا گریڈ آئے گا آپ کا۔ او کے منڈے کو ملیں گی فی امان اللہ۔"

پچھلی دفعہ کی طرح انہوں نے خود ہی خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

"میں پاگل ہوں جو منڈے کو ملوں گی۔ بھلا کیوں خواہ مخواہ۔" اس نے کڑھتے

ہوئے ریسیور کریڈل پر پٹخا اور کتاب اٹھا کر اپنے کمرے میں آ کر بیڈ پر دھم سے بیٹھ گئی۔

''احمق عورت! خود ہی سوال، خود ہی جواب۔ بھلا میں کیوں ملوں گی اور منڈے کو نہ کوئی ٹائم نہ کوئی جگہ، لگتا ہے یہ مجھے فول بنا رہی ہے۔'' اس نے خود ہی سر ہلایا اور کتاب کھول کر مطلوبہ نتائج نکالنے لگی۔

''پتا نہیں کون سینٹل ہے۔ اب امی کو بتانا چاہیے۔'' وہ توازن کے اصول پر نظریں دوڑاتے ہوئے سوچنے لگی۔

''امی ڈانٹیں گی۔ پہلے فون کا کیوں نہیں بتایا۔'' بے توازن سوچ بولی۔

''دفع کرو۔ اب فون ہی اٹینڈ نہیں کروں گی۔ خود ہی جان چھوڑ دیں گی۔''

''منڈے کو ہم ملیں گے۔'' دل میں گھر کرنے والی آواز چہکی۔ اس نے کھٹ سے کتاب بند کر دی۔

''ہیلو! ہیلو! کیا ہو رہا ہے بھئی؟'' وہ سنگ کر بولی۔

''کتاب بند کر کے۔ ہاؤ اسٹرینج۔'' فرحین کو بھی تنقید کا موقع چاہیے۔

''چائے بنانے کا سوچ رہی تھی، اس لیے کتاب بند کی ہے۔'' فرحین ہمیشہ اس کے ٹھنڈے مزاج کا امتحان لیتی تھی۔

''مگر ابھی تو تم فون پر گپیں لگا رہی تھیں۔'' اس کی حسیں ساری تائی جی پر گئی تھیں ہر بات کی ٹوہ لگانا۔ دل میں چڑ گئی مگر چہرہ نارمل رکھا۔ یہ امی کی اسے خاص نصیحت تھی کہ تائی جی اور فرحین کو ڈیل کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ ''کول ڈاؤن۔''

''صائمہ کا فون تھا، ایک کونسیپٹ کلیئر کروانا تھا اس نے۔'' وہ اب پوری طرح صرف فرحین کو ڈیل کر رہی تھی۔

''مگر لگتا ہے کونسیپٹ تم کلیئر کر رہی تھیں۔ وہ بول رہی تھی اور تم بے حس و حرکت کھڑی سن رہی تھیں۔'' درشہوار کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے سن تو نہیں لیا کہیں۔ اس نے غور سے فرحین کی آنکھوں میں ناچتے تھرکتے ''ڈیلوں'' کا جائزہ لیا۔ فساد ہمیشہ ان میں ہوتا تھا مگر اس وقت ان کی تھرتھراہٹ غیر معمولی نہیں تھی۔ اس کے دل نے سکون کا سانس لیا۔

''چائے بناؤں۔ پیو گی؟'' اس نے موضوع سمیٹنا چاہا۔

''نہیں۔ اس وقت موڈ نہیں۔ تم پڑھو۔ میں تو آئی تھی کہ بیس تاریخ کو تمہارے

ایگزام ختم ہوں گے تو اس کے بعد جو منڈے آ رہا ہے، مجھے بازار جانا ہے۔ گرمیوں کی شاپنگ کرنی ہے۔ تمہیں ساتھ لے کر۔ تمہارے بغیر شاپنگ کا مزہ نہیں آتا۔ اور امی اور راحین نے اپنی شاپنگ مکمل کر لی ہے۔ میں تمہارے ایگزام ختم ہونے کے انتظار میں بیٹھی ہوں۔''

اور یہ حقیقت بھی تھی کہ اس کی یہ نک چڑھی کزن اس کی شمولیت کے بغیر شاپنگ نہیں کرتی تھی کہ درشہوار کا ٹیسٹ سب سے بہتر ہے۔ یہ اس کا قول تھا۔ منڈے کے ذکر پر اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

''فرحین! منڈے کو تو نہیں۔ بدھ یا جمعرات کو چلیں گے۔''

''او کے۔ جہاں اتنا انتظار کیا۔ وہاں کچھ اور سہی۔ واؤ یہ کیا ہے؟'' وہ جانے کے لیے پلٹی تو بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر پڑی خوبصورت نازک کرسٹل کی گڑیا پر اس کی نظر ٹھہر گئی تو پل بھر کو اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ڈول کے ایک ہاتھ میں گلاب کی ادھ کھلی کلی تھی اور دوسرے ہاتھ میں چھوٹا رومن ہندسوں والا گولڈن خوبصورت ٹائم تھا۔ گڑیا کا ڈریس وائٹ کرسٹل کا تھا۔ جس کے کنارے گولڈن تھے۔ وہ واقعی اتنا خوبصورت تھا کہ دیکھنے والا مسحور رہ جائے۔

''یہ کہاں سے لی تم نے؟'' گڑیا کو ہاتھ میں لیتے ہوئے بولی۔

''طلیعہ آپی نے بھیجی ہے پچھلے مہینے۔ میری برتھ ڈے تھی ناں، آفاق بھائی کے ایک دوست کے ہاتھ وہ۔ ذرا لیٹ پہنچے، اس لیے گفٹ بھی لیٹ ہو گیا۔ پرسوں شام کو دے کر گئے ہیں۔ اچھی ہے ناں۔'' درشہوار اس کے چہرے کے تاثرات سے محظوظ ہوتے ہوئے بولی۔ فرحین کا بس چل رہا تھا کہ گڑیا لے کر بھاگ جائے۔

''اچھی ہے، سات آٹھ سو کی ہوگی۔'' گڑیا کی نزاکت و خوبصورتی اور ننھے ننھے نگوں سے چمکتا ڈائل گواہ تھا کہ گڑیا کی قیمت چار پانچ ہزار سے کیا کم ہوگی۔ اس نے سات آٹھ سو کی کہہ کر دل کو گویا تسلی دی۔

''تم نے دکھائی نہیں پرسوں سے۔ ہم نے کیا چھین لینی تھی؟'' اب اسے تنقید کا ایک اور موقع اور پہلو سوجھ گیا تھا۔

''بھائی! کے دوست ڈیڈی کے کلینک آئے تھے، ڈیڈی گھر لانا بھول گئے۔ کل رات کو انہوں نے مجھے دی اور میں نے ابھی لا کر ادھر سجائی ہے۔'' وہ ابھی بھی فرحین کے جلے کٹے تاثرات کو انجوائے کر رہی تھی۔

''ہونہہ! جیسے ہم جلتے ہیں، ایسا دل نہیں ہے ہمارا۔'' اس کی نظریں ابھی بھی گڑیا کے اردگرد بھٹک رہی تھیں۔

''میں چلتی ہوں تم پڑھو۔ جب فارغ ہو جاؤ تو بازار کے لیے بتا دینا۔''

انداز خواہ مخواہ لڑنے والا تھا۔ درشہوار چپ رہی۔ وہ اس کی خاموشی پر بھی جلی تھی۔ وہ پیر پٹختی کمرے سے نکل گئی۔ درشہوار کتاب میں منہ چھپا کر ہنسنے لگی۔



پھر آفاق بھائی مکمل طور پر چپ ہو گئے تھے کسی سادھو کی طرح خدا جانے کون سے گیان دھیان میں گم رہتے۔ خاموشی سے کھانا کھاتے اور چپ سادھے اپنے کمرے میں چلے جاتے نہ ہاسپٹل جانے کا شور نہ واپس آ کر کسی قسم کی گھن گرج نہ ناراضی نہ اعتراضات۔ دوپہر کو سب کی طرح قیلولہ کرنے لگے۔ شام کی چائے پی کر ڈیڈی کے کلینک، وہاں بھی کسی قسم کی تنقید کے بغیر ڈیڈی کے سارے کام کرتے۔ کسی مریض کی بے کسی یا بے بسی پر ان کا دل کڑھتا نہ وہ خود کو جلاتے۔ اگر مریض کے پاس فیس ہے تو اس کو اٹینڈ کرو، نہیں ہے تو اسے سرکاری ہسپتال کا رستہ دکھا دو۔ ڈیڈی نے اپنے اسسٹنٹ کو آرڈر کر رکھا تھا۔ آفاق بھائی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

انہوں نے ان سے بھی الجھنا چھوڑ دیا۔ دانیال کے کسی مذاق، کسی ہنسی پر چہرے پر ''نو رسپانس'' کا لشکارے مارتا سائن بورڈ چپکا رہا۔ وہ تو کسی بے زبان بے سینگ کے جانور کی طرح بے ضرر ہو گئے تھے اس جن کی طرح جس کی تمام تر طاقت زائل ہو چکی ہو تو بچے بھی اس سے چھیڑ چھاڑ کر جائیں تو وہ برا نہیں مانتا۔ ان کی اس خاموشی نے گھر بھر میں کھلبلی مچا دی۔

''ہائے دانیال! میرا تو دل ہول رہا ہے۔ یہ آفاق کو کیا ہو گیا ہے میرے بچے کو کس دشمن کی نظر لگ گئی۔ چپ ہونٹوں پر تالے۔ اس کی تو جون ہی بدل گئی ہے۔ مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے۔ دوستوں سے بھی میل، ملاپ ختم۔ دس بار ڈاکٹر مراد، ڈاکٹر عامر اور کبیل کے فون آ چکے ہیں۔ وہ نہ ان سے ملتا ہے، نہ ان کے فون اٹینڈ کرتا ہے۔ ملنے آتے ہیں تو ملنے سے انکار کر دیتا ہے۔ تمہارے ڈیڈی سے بات کرتی ہوں تو مجھے وہی کہہ کر چپ کرا دیتے ہیں۔'' امی ہاتھ مل مل کر کہے جا رہی تھیں۔

''ڈیڈی ٹھیک کہتے ہیں۔ یہ آپ کا وہم ہے۔ اصل میں جب پرندے کو کسی

پنجرے میں نیا نیا بند کرو تو وہ اڑنے کے لیے پھڑپھڑاتا ہے۔ پنجرے پر مارتا ہے پھر ہوتے ہوتے شانت ہو جاتا ہے۔ بھائی بھی اب عادی ہو گئے ہیں، اس لیے اتنے مطمئن دکھائی دیتے ہیں۔''

''مطمئن کے بچے۔'' امی نے دانت پیسے ''مطمئن لوگ ایسے ہوتے ہیں، چپ شاہ کا روزہ رکھے ہوئے۔ نہ ہنستا ہے، نہ بولتا ہے نہ کوئی فرمائش، نہ کوئی ضد۔ جیسے کوئی روبوٹ۔''

''امی! غلطی آپ کی ہے، جب وہ بولتے تھے۔ شور مچاتے تھے۔ لڑتے جھگڑتے تھے۔ آپ انہیں ڈانٹ دیتی تھیں کہ وہ غلط کر رہے ہیں۔ سب طرف ایسے ہی ہوتا ہے اور اب جبکہ وہ اس عالمگیر حقیقت کو مان گئے ہیں۔ تو اب آپ کو چین نہیں آ رہا۔''

دانیال کی آفاق بھائی سے یوں بھی کم ہی ملاقات ہوتی تھی۔ اس لیے اسے حالات کی سنگینی کا احساس نہیں تھا۔

''دانی! امی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ بھائی بہت چپ ہو گئے ہیں۔'' درشہوار بھی ان کی اتنی طویل چپ سے عاجز آ چکی تھی۔

''تو پھر اس کی کوئی وجہ ہو گی۔'' اس نے نقطہ نکالا اور درشہوار نے اسے گھور کر دیکھا۔

''آہا! سمجھ میں آ گئی وجہ۔'' اس نے اگلے ہی لمحے چٹکی بجائی۔ وہ دونوں اس کا منہ تکنے لگیں۔

''کیا مطلب؟'' امی ماتھے پر بل ڈال کر بولیں۔

''دیر میرا گھوڑا چڑھیا۔'' اس نے ہاتھوں کو بھونپو بنا کر منہ کے آگے بجایا تو پیچھے ڈھول کی آواز پر درشہوار نے دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔

''امی! بھائی گھوڑی چڑھنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے تو سب سے روٹھے روٹھے پھر رہے ہیں۔ آخر آپ کا برسرروزگار بیٹا ہے۔ کچھ تو خیال کریں۔'' وہ آنکھیں مٹکا کر بولا۔

''تو بھلا خیال کیوں نہیں۔'' امی برا مان کر بولیں۔ ''میں تو ہزار بار کہہ چکی ہوں۔ خود ہی ٹالے جا رہا ہے۔ اس موضوع پر مجھے آنے ہی نہیں دیتا۔ مجھے تو اس کی خاموشی کے پیچھے کوئی بڑا طوفان چھپا لگ رہا ہے۔'' امی پر تشویش انداز میں بولیں۔

اور وہ طوفان اگلے روز رات کے کھانے پر آ ہی گیا۔ چھٹی کا دن تھا۔ رات کو سب نے دنوں بعد اکٹھے کھانا کھایا۔

''ڈیڈی! میں اسٹیٹس جا رہا ہوں۔ اسپیشلائزیشن کے لیے اور اس کے بعد بھی کچھ عرصہ ادھر ہی رہوں گا۔'' آفاق بھائی نے کھانے کے بعد نیپکن سے ہاتھ اور منہ صاف کرتے ہوئے با آواز بلند ڈیڈی کو مخاطب کرتے ہوئے سرسری لہجے میں کہا۔ جیسے اسٹیٹس نہیں وہ نائی کی دکان پر جانے کا ذکر کر رہے ہیں۔ امی کے ہاتھ سے ڈرائفل کا ڈونگا چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ دانیال نے ان کی بات سن کر سر ہلایا اور مزے سے کباب رائتے میں ڈبو کر کھانے لگا۔ جیسے بھائی نے اجازت اس سے مانگی ہو۔

''وہاٹ!'' ڈیڈی کے لیے یہ نیوز واقعی شاکنگ تھی، وہ ان کی دھاڑ کے جواب میں چپ رہے۔ سعادت مندی سے نظریں جھکائے، ہاتھ گود میں دھرے ایسے بیٹھے رہے۔ جیسے یہ بات دانیال نے کی ہو۔

''مگر بیٹا کیوں؟'' امی عاجزی سے بولیں۔

''میں بتا چکا ہوں۔'' وہ باادب لہجے میں بولے۔

''تمہیں معلوم ہے۔ تم کیا کہہ رہے ہو۔'' ڈیڈی نے پانی کے دو گھونٹ بھر کر خود کو ٹھنڈا کرنے کی ناکام کوشش کی کیونکہ ان کے ابرو تن چکے تھے اور غصے میں نتھنے پھڑپھڑا رہے تھے۔

''جی!'' آفاق بھائی نے ایک بار بھی نگاہیں اوپر نہ کیں۔

''لگتا ہے، اتنی بڑی بات کہنے کے بعد بھائی کی بینائی چھن گئی ہے۔ دیکھو لو، وہ اوپر دیکھ ہی نہیں رہے تھے۔'' دانیال نے درشہوار کے کان میں سرگوشی کی تو اس نے زور سے اس کے بازو میں چٹکی بھری۔

''ہائے میں مر گیا۔'' دانیال کے منہ سے چیخ نما نکلا۔ ڈیڈی کو اور پتنگے لگ گئے۔

''دانیال! یو اسٹوپڈ...... دفع۔ ہو جاؤ یہاں سے۔'' کتنی ساری گالیاں ڈیڈی نے حلق سے نیچے اتاریں۔

''کھانا کھا کر چلا جاؤں گا ڈیڈی! بہت بھوک لگی ہے۔ صبح ناشتہ بھی نہیں کر کے گیا تھا اور میرے کھانا نہ کھانے سے یا یہاں سے چلے جانے سے بھائی جان مان تو نہ جائیں

گے۔'' دانیال نے منمناتے ہوئے پھر لمبی بات کی۔

''تمہاری ساری اولاد نافرمان اور گستاخ ہے۔'' ڈیڈی کا بھائی اور دانیال پر بس نہ چلا تو امی کی ساری عمر کی تپسیا پر پانی پھیر گئے۔

''جی!'' ان پر تو گویا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اولاد کی تربیت کے معاملے میں تو ویسے ہی بہت حساس تھیں۔ اتنا بڑا طعنہ۔ ڈاکٹر کی بیوی نہ ہوتیں تو شاید اب تک بے ہوش ہو چکی ہوتی۔ معلوم تھا تا ڈیڈی فوراً ہوش میں لے آئیں گے۔

''میں نے تو ان کی پرورش میں اپنی زندگی کی ساری خوشیاں اور آرام خود پر حرام کر لیا کہ انہیں کامیاب اور اچھے انسان بناؤں۔ مجھے کیا معلوم تھا۔ آج یہ طعنہ بھی سننے کو ملے گا۔'' امی دوپٹے کے پلو میں منہ چھپا کر رونے لگیں۔ کھانے کی ٹیبل پر نیا کیس کھل گیا۔ بھائی اور ڈیڈی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ سیلاب پر قابو پانا آسان تھا مگر امی کے آنسو اگر ایک بار بہنا شروع ہو جاتے تو سیلاب روکنے والا محکمہ بھی بے بس تھا۔

''د...... دیکھو میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' ڈیڈی کی ساری اکڑفوں غائب ہو گئی ''تم چپ کرو۔ مجھے اس ناخلف، گستاخ۔'' وہ جھنجلاہٹ میں پھر امی کی کمزوری پر پاؤں رکھ گئے۔

''میرا مطلب آفاق سے بات کرنے دو۔''

''مجھے کیا معلوم تھا۔ میری زندگی میں ایسا بھی دن آئے گا جب آپ مجھے یوں الزام دیں گے۔ وہ بھی میری اولاد کے سامنے۔'' امی کی سوئی اسی نکتے پر اٹکی ہوئی تھی۔ آنسو روانی بلکہ ارزانی سے بہنے لگے۔

''امی پلیز!'' درشہوار نے اپنے درجے کے مطابق چھوٹی سی کوشش کی جو نقش بر آب ثابت ہوئی۔ امی روئے جا رہی تھیں بغیر کومے اور فل اسٹاپ کے۔ دھواں دھار!

''لاحول ولاقوۃ۔ سب کا ہی میٹر الٹا چل رہا ہے۔''

ڈیڈی نے چمچہ زور سے آگے پڑی چٹنی کی پلیٹ پر پٹخا۔ پلیٹ اتنی توہین برداشت نہ کر سکی اور تڑاخ سے دو حصوں میں تقسیم ہو کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔ امی کی دل خراش چیخ ہونٹوں سے آدھی نکل کر دوپٹے کے گولے کے پیچھے گم ہو گئی۔ ان کے جہیز کا یہ قیمتی سیٹ تھا۔ آج دانیال ضد کر کے شوکیس میں سے نکال کر لایا تھا کہ آج کھانا آ تار قدیمہ کے ان قیمتی اور نایاب برتنوں میں تناول کیا جائے گا اور امی کو جس چیز کا ڈر تھا۔ وہی ہوا ڈیڈی پیر پٹختے غصے

میں اپنے کمرے میں چلے گئے اور امی کو اب چپ کرانا واقعی ان کے بس سے باہر کا کام تھا۔
یوں آفاق بھائی کا مسئلہ امی کی شورش میں دب کر رہ گیا۔



اور بعد میں اس خاتون یعنی شیریں کے فون نے بھی یہ ثابت کر دیا کہ وہ واقعی اس کی بیری پر گرنے والا پہلا پتھر تھا اور یہ بات اسے صائمہ کے منہ سے سن کر برا لگا تھا۔ اس نے سوچا کہ صائمہ کی سوچ اور ذہنیت دونوں گھٹیا ہیں کہ وہ چاروں دوستوں میں سب سے زیادہ انڈین فلمیں دیکھتی تھی۔

پہلی بار اس کی نیند اس رات اڑی جب اس نے صائمہ کے جملے پر سوچنا شروع کیا اور دوسری بار اس خاتون کے فون پر اس رات تو صبح کے چار بجے تک وہ آنکھ نہیں جھپک سکی تھی۔ اس کا سحر زدہ لہجہ انوکھے میٹھے جملے پتا نہیں اس کے دل پر کیا سحر طاری کر گئے تھے۔ دل کوئی نہ کوئی جملہ ریوائنڈ کر کے دہراتا جاتا۔ وہ دل کو جھڑکتی اور آنکھیں بند کرتی تو پھر وہی گردان۔

اس رات اسے پہلی بار معلوم ہوا کہ رت جگا کسے کہتے ہیں۔ صبح چار بجے اسکے اعصاب جواب دے گئے۔ ذہن اور بدن تھکن سے چور ڈھیلے پڑ گئے تو آنکھوں نے بھی کھلے دریچوں کے پٹ بند کیے۔ دل نے دہائی دی مگر کسی نے اس کی دہائی نہ سنی اور وہ آنکھیں موند کر سو گئی۔

امی نے نماز کے لیے اسے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔ وہ پھر بھی نہیں اٹھی۔ صبح گیارہ بجے کلاک پر نگاہ پڑتے ہی وہ یوں زور سے بستر سے اچھلی جیسے اسے ہزار واٹ کا کرنٹ لگا ہو۔

''گیارہ بج گئے۔ او مائی گاڈ۔ مجھے تو پڑھنا ہے۔ آج پیپرز میں صرف بارہ دن رہ گئے۔'' وہ اندھا دھند باتھ روم میں طرف بھاگی۔

اور اس دن اس نے دل کو خواب ڈانٹا۔ فون کے کمرے سے دور صرف اپنے کمرے اور پچھلے لان تک خود کو محدود کر لیا۔ کھانا بھی اپنے کمرے میں کھانا شروع کر دیا۔ خدا خدا کر کے دل خوشامد کا پیاسا اس واقعے کو بھولا اور اس نے جی جان سے پیپرز کی تیاری کی۔ اس کے سارے پیپرز اس کی توقع سے بھی بڑھ کر اچھے ہوئے تھے۔ ایک ماہ بعد پریکٹیکل تھے۔ وہ ایک ماہ اس نے سو کر گزارا۔ خوب عیش کیے ٹی وی، میوزک، ویڈیو خوب انجوائے کیا

اور کل اس کا آخری پریکٹیکل تھا۔ کہ پھر سے شیریں بیگم کا فون آ گیا۔ وہی میٹھی میٹھی دل کو بھانے والی باتیں، پاگل کر دینے والا لب و لہجہ اور یہ کہ کل اس کے پریکٹیکل کے بعد وہ اس سے کالج کے باہر ملیں گی اور اس کی ''نہ نہ'' سنے بغیر فون کھٹ سے بند ہو گیا اور وہ حیران کتاب لیے بیٹھی رہ گئی۔

''امی سے بات کرتی ہوں۔'' وہ اٹھ کر ان کے کمرے میں آئی تو وہ سو رہی تھیں۔

''کیا مصیبت میرے گلے پڑ گئی ہے۔'' وہ جھنجھلا کر رہ گئی۔ دل پھر سے تڑپ رہا تھا۔ اسے وقت کی نزاکت کا بھی احساس تھا کہ کل اس کا آخری پریکٹیکل ہے۔ اس نے پھر سے دل کو سامنے بٹھایا۔ اس کے آگے ہاتھ جوڑے۔ دو جھوٹ موٹ کے آنسو بھی گرائے۔

''بھائی دیکھ! کل میرا آخری پریکٹیکل ہو جائے پھر جو تو کہے گا، وہ میں کروں گی۔ بس ان چند گھنٹوں کے لیے اپنی زبان بند کر لے۔ تجھے درشہوار کی قسم جس کے سینے میں تو دھڑکتا ہے اور اگر تو نے اپنی یہ بے وقت کی راگنی بند نہ کی تو یاد رکھنا میں تجھے اپنے سینے سے نکال کے............''

''کہاں رکھوں گی۔'' وہ سوچ میں پڑ گئی کہ دل تو ناگزیر ہے۔ ''لیکن چند گھنٹوں کے لیے بطور سزا الماری میں۔ تمہیں جوتوں کے ڈبے میں رکھ دوں گی تاکہ تمہیں اپنی اوقات کا علم ہو سکے۔'' اس نے من من کرتے ہوئے دل کو تاڑا اور ہونہہ کہہ کر کتاب کھول لی۔



پھر دن گزرتے چلے گئے۔ ایک مہینہ خاموشی سے گزر گیا۔ آفاق بھائی اور ڈیڈی کے درمیان کیا معاملہ طے پایا۔ اسے کچھ خبر نہ تھی۔ بظاہر دونوں نارمل تھے مگر فضا میں کشیدگی کے آثار بہرحال موجود تھے پھر نا معلوم کیسے آفاق بھائی کے اسٹیٹس جانے کی خبر پھپھو کو مل گئی تو وہ دوڑی دوڑی آ گئیں۔

''ہیں بھابھی! یہ میں نے کیا سنا ہے۔'' انہوں نے آتے ہی رسمی دعا سلام کے بعد فوراً ہی کہہ ڈالا اور امی جو درشہوار کو کولڈ ڈرنک لانے کا اشارہ کر رہی تھیں، چونک اٹھیں۔

''کیا؟''

''آفاق امریکہ جا رہا ہے۔'' وہ بولائے بولائے انداز میں بولیں۔

''ہاں، کہہ تو رہا ہے۔'' امی کا لہجہ اتنا ہی سرسری اور بیزار سا تھا جیسے امریکہ پچھلے

لان میں ہو۔

''ایں!'' پھپھو کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ درشہوار دوڑ کر گئی اور فرج سے کولڈ ڈرنک اٹھا کر دوبارہ لاؤنج میں بھاگی آئی۔ مبادا کارروائی مس نہ ہو جائے۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ اس کی کوئیک سروس کے نتیجے میں پھپھو کا منہ ابھی بھی کھلا ہوا تھا۔

''پھپھو! کولڈ ڈرنک۔'' انہوں نے چونک کر منہ بند کیا۔ اب پھپھو بوتل پی رہی تھیں۔ امی کچھ سوچے جا رہی تھیں اور وہ دونوں کا باری باری منہ تکے جا رہی تھی۔

''ہاں تو بھابھی! آپ نے بتایا نہیں۔'' پھپھو نے تین منٹ پچیس سیکنڈ میں کولڈ ڈرنک ختم کر کے بوتل پٹر پٹر دیکھتی درشہوار کے حوالے کی اور ایک بڑی سی ڈکار لے کر امی سے پوچھا۔

''میں کیا بتاؤں۔'' امی کا لہجہ ہنوز بیزار سا تھا۔

''یہی کہ آفاق اسٹیٹس جا رہا ہے۔'' پھپھو اب رو دینے کو تھیں۔

''بھابھی بیگم نے بتایا ہوگا۔'' امی نے ان کے سورس آف انفارمیشن کا پتا لگانا چاہا۔

''اس کو چھوڑیں۔'' لگتا تھا، تائی جی نے خوب قسمیں دے کر اپنا نام نہ بتانے کا وعدہ لیا ہوا تھا۔ درشہوار نے ان کی پہلو تہی سے اندازہ کیا۔

''کیوں چھوڑوں۔ پتا تو چلے گھر کی بات گھر سے باہر کیسے نکلتی ہے۔'' امی گرجیں۔ درشہوار ڈر گئی۔

''بھابھی حد کرتی ہیں آپ بھی۔'' پھپھو ان کی اکھوائری سے جھنجلا کر بولیں۔

''تو بتا دو نا۔ کس نے تمہارے کان بھر کر بھیجا ہے۔''

''کیا یہ واقعی افواہ ہے؟'' پھپھو چونک کر بولیں۔

امی لمحے بھر کو چپ رہ گئیں۔ ایک نظر درشہوار کو دیکھا جو بڑے انہماک سے وال کلاک دیکھ رہی تھی۔

''خالد بھائی جان کے کلینک گئے تھے۔ ان کا بی پی چند دنوں سے گڑ بڑ کر رہا تھا تو بھائی جان نے انہیں بتایا۔ انہوں نے آج صبح ہی مجھے بتایا تو مجھ سے ناشتہ کرنا محال ہو گیا۔ خالد نے بھی رات بے چینی سے بتائی۔ ان کے آفس جاتے ہی میں ادھر نکل آئی۔'' پھپھو نے بتایا۔

''میں کیا بتاؤں سائرہ! معلوم نہیں اس لڑکے کو کیا ہو گیا ہے۔ تمہارے بھائی نے جب اس نے ایم بی بی ایس کیا تو اتنا اصرار کیا کہ باہر جا کر اسپیشلائزیشن کر آؤ مگر یہ نہیں مانا۔ اب ڈیڑھ سال بعد یہ باہر جانے کا بخار چڑھ گیا ہے اسے۔ اب جبکہ ہاسپٹل زیر تعمیر ہے۔ کلینک پر بھی اس کی ضرورت ہے۔ تمہارے بھائی دونوں تو نہیں سنبھال سکتے مگر یہ اپنی ضد پر اڑ گیا ہے۔ عجیب سی طبیعت ہو گئی ہے اس کی۔ پل میں تولہ پل میں ماشہ۔ ادھر زرا کچالو، پل بھر میں لڑنے مرنے کو تیار۔ میں تو خود اس کی وجہ سے پریشان ہوں۔'' امی نے سر تھام لیا۔

''بھابھی! ایک بات میں آپ کو صاف بتا دوں۔'' پھپھو نے گلا صاف کیا ''مجھے خالد نے کہہ کر بھیجا ہے کہ آفاق چاہے دو ماہ کے لیے باہر جائے، چاہے دو سال کے لیے۔ علینہ اس کے ساتھ جائے گی۔ خرچ وغیرہ کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو ڈاکٹر بننے کی آفاق کی ضد تھی ورنہ منگنی تو بچپن سے طے ہے۔ اس وقت سے خالد نے کہہ رکھا ہے، میری مشینوں فیکٹریوں اور مل کا مالک آفاق ہے۔ اسی کو سب سنبھالنا ہوگا۔ اللہ نے ہمیں بیٹا نہیں دیا تو ہم نے بیٹی دے کر بیٹا لیا ہے۔ بھابھی! آپ گواہ ہیں۔'' پھپھو خواہ مخواہ رونے کی کوشش کرنے لگیں۔ ان کی آواز گلوگیر ہو گئی تھی۔ مگر آنسو کوشش کے باوجود کوئی نہ نکل سکا تو وہ چابکدستی سے دوپٹے کے کونے میں آنکھوں کے نادیدہ بھیگے گوشے صاف کرنے لگیں۔

''معلوم ہے، مجھے سائرہ! یہی تو ہم کہہ رہے ہیں۔ میں تو ایم بی بی ایس کے بعد ہی شادی کر دینے کے حق میں تھی۔ مگر تمہارے بھائی جان نے ہاسپٹل کی رٹ لگا دی۔ ہمیشہ اپنی منواتے ہیں۔ میری کب سنتے ہیں۔ اماں نے ان کی تربیت ہی ایسی کی ہے۔''

امی نے دادو کی تربیت پر تنقید کی۔ پھپھو نے کوئی خاص دھیان نہیں دیا ورنہ اس بات پر ٹھیک ٹھاک تو تو میں میں ہو سکتی تھی۔

''ہاں تو اور کیا، دونوں بچے ہیں کیا۔ ماشاء اللہ علینہ نے پچھلے سال بی اے کر لیا تھا۔ آگے اسے پڑھنا نہیں۔ آفاق بھی اللہ کے فضل سے تعلیم مکمل کر چکا ہے۔ اب کس بات کا انتظار ہے۔ بھابھی! میں نے صاف کہہ دیا۔ آپ شادی کی تاریخ مقرر کریں بس۔'' وہ ضدی لہجے میں ٹھنک کر بولیں جیسے شادی کی تاریخ نہ ہوئی پکنک پارٹی کا پروگرام ہوا۔

''مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔ اپنے بھائی سے بات کر لو۔ رات کو کھانا ان کے ساتھ کھاؤ۔ میری بات کون سنتا ہے، گھر کی مرغی دال برابر۔ میں تو اپنی اولاد کے آگے بے بس

ہوں۔'' ان کے الزام پر درشہوار نے کسمسا کر انہیں دیکھا۔

''یہی ہوتا ہے بھابھی! اولاد کو ڈھیل دینے کا نتیجہ۔'' پھپھو بھی امی کی کمزوری دیکھ کر شیر ہو گئیں۔

''میں نے کون سی ڈھیل دی ہے۔ میرے بس میں کیا ہے۔'' امی رو دینے کو تھیں۔

''امی! قورمہ تیار ہے۔ ساتھ میں کچھ اور بنا لوں۔ پھر پھپھو ادھر ہی لنچ کریں گی۔ ڈیڈی کو بھی فون کر کے گھر بلوا لیتے ہیں۔ ذرا تو وہ بہت لیٹ کرتے ہیں۔'' درشہوار نے فوراً موضوع بدلا۔

''ہاں کھانے کا کیا ہے۔ صبح سے کچھ حلق کے نیچے جا ہی نہیں رہا۔'' پھپھو نے فوراً سفید جھوٹ بولا۔

''اماں کو بھی لے آتیں ساتھ۔ ماں کی بات سمجھ جائیں گے۔'' امی بولیں۔

''کہا تھا، اماں سے، کہنے لگیں شام تک آؤں گی۔'' وہ منہ بنا کر بولیں ''جلتی آگ میں کون کودتا ہے، چاہے سگے ماں باپ ہوں۔'' وہ بڑبڑائیں۔

''بہت ضدی لڑکا ہے، تمہارے بھائی مان بھی گئے تو وہ مشکل سے مانے گا۔'' امی پھر انہیں گرم موضوع کی طرف لے گئیں۔

''اگر نہیں مانے گا تو بھی علیہ کو ساتھ لے کر جائے۔ ہم کب تک آس لگا کر بیٹھیں۔ یہ تو صرف میری محبت ہے ورنہ آپ کو تو معلوم ہے خالد اکثر کہہ بیٹھتے ہیں۔'' پھپھو ادھورے جملے بول کر چپ کر گئیں۔ امی ناسمجھی سے انہیں تکنے لگیں۔

''بھابھی! آپ خود سمجھدار ہیں۔'' امی کے مسلسل اس طرح دیکھنے پر وہ جھنجلا کر بولیں۔

''تو کیا کروں میں نہیں ہوں پریشان۔'' امی کرسی سے اٹھ کر ان کے ساتھ والے صوفے پر جا بیٹھیں تو ان کی نظر درشہوار پر پڑی جو بڑی دلچسپی سے نند بھاوج کا ون ڈے میچ دیکھ رہی تھی۔

''چلو تم ادھر سے۔ اچھا امتحان دیا ہے۔ ہر وقت سر پر سوار۔ جا کر کچھ کچن کی خبر لو۔ شریفاں کو ساتھ لگا کر بریانی اور......'' وہ سوچنے لگیں۔ ''کوئی سبزی ہاں کریلے پڑے ہیں فریج میں بنا لو جا کر۔ میٹھے میں کیا لو گی سائرہ؟'' وہ پھپھو سے بولیں تو غیر دلچسپی سے ان کا مینو سن

رہی تھیں۔

''کچھ نہیں۔'' وہ برا سا منہ بنا کر بولیں۔

''فرنی بنا لینا۔ اب جاؤ ادھر سے۔'' امی اسے ادھر سے بھگانا چاہ رہی تھیں۔ وہ بھی ان کی بیٹی تھی۔ سمجھ گئی، کوئی کوئی خفیہ بات بھی ہے۔ وہ باہر نکل کر دروازے سے چپک کر کھڑی ہو گئی۔ ''ایسے معاملوں میں اخلاقیات کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔'' اس نے ضمیر کی گھورتی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا اور اپنے کانوں کو ہوشیاری سے دروازے کے ساتھ چپکا دیا۔

''بھابھی بیگم کے ارادوں کی کچھ خبر ہے؟'' امی دھیمے والیوم میں پھپھو کے قریب ہو کر بولیں۔ مگر اس کے کانوں نے سن لیا۔ اس نے کانوں کی لوئیں چھو کر شاباش دی اور کیری آن (جاری رکھو) کہہ کر پھر متوجہ ہو گئی۔

''کس سلسلے میں؟'' پھپھو انجان پن سے بولیں۔

''مہران کے سلسلے میں۔ ایم بی اے تو ہو گیا اس کا۔''

درشہوار کے ہوشیار دل نے کچھ غیر معمولی بیٹس دیں۔

''باہر جانا چاہتا ہے وہ آگے پڑھنے کے لیے۔ بابا کی وکالت جو خوب چل پڑی ہے۔'' پھپھو تایا جی سے کبھی خوش نہیں ہوتی تھیں۔

''اچھا!'' امی جیسے ٹھنڈی ہو گئیں۔ ''مگر میں تو سنا تھا۔ وہ آج کل ادھر ادھر لڑکیاں دیکھتی پھر رہی ہیں۔''

''کیوں لڑکیاں دیکھیں گی بھلا؟'' پھپھو چونک کر بولیں۔ ''اماں نے کہہ نہیں رکھا ان سے درشہوار کے لیے۔'' درشہوار کے دل نے ریس لگا دی۔

''وہ تو اماں کہتی ہیں نا۔'' امی بے یقین سی تھیں۔

''تو کیا اماں کا کہنا کافی نہیں۔ آفاق اور علیہ کی نسبت بھی تو انہوں نے طے کی تھی۔'' پھپھو غصے میں اونچا بولیں۔

''وہ تو صحیح ہے مگر۔'' امی جھجک کر چپ کر گئیں۔

''مگر کیا؟''

''وہ دانیال سے فرحین کا کرنا چاہ رہی ہیں شاید۔'' یہ خبر ان کو تائی جی کی نزدیکی زن نے دی تھی۔

"وہ تو نہیں کریں گے ہم۔" پھپھو فوراً بولیں۔

"اگر ہو بھی تو سائرہ! فرحین نہیں۔ وہ تو تمہیں معلوم ہے نا۔" فرحین طبعاً ساری کی ساری تائی جی تھی جس کی بنا پر کوئی بھی اسے پسند نہیں کرتا تھا۔

"بھابھی! آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔ ہم ہیں نا۔ میں اماں سے بات کروں گی، آج کل میں یہ دونوں معاملات نپٹا لیتے ہیں۔" پھپھو جلدی سے بولیں۔

"فکر کیوں نہ کروں۔ درشہوار نے بی ایس سی کر لیا ہے۔ تمہیں معلوم ہیں ناں سیما تو ابھی سیکنڈ ایئر میں تھی جب اس کے پٹاپٹ دس رشتے آ گئے تھے۔ بے چاری کو تھرڈ ایئر میں داخلہ لینے کی مہلت بھی نہ ملی۔

انیس سال کی تھی جب میں نے اس کی شادی کر دی اور آج کل کے حالات بہت خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ اچھے رشتوں کا تو جیسے کال پڑتا جا رہا ہے۔ شرافت اور وضع داری ختم ہوتی جا رہی ہے۔ لوگ منہ پھاڑ کر جہیز مانگتے ہیں۔ آج کل تو وہی سکھی ہے۔ جو اپنوں میں کھپ گیا ورنہ تو۔" امی کی پریشانی اسے ایک آنکھ نہ بھائی۔

"درشہوار کی ابھی عمر ہی کیا ہے۔ سیما کو بھی آپ نے کم عمری میں بیاہ دیا۔ وہ تو شادی کے تیسرے مہینے سے آسٹریلیا جا بیٹھی۔ ہم تو اس کی شکل کو ترس گئے۔ سالوں بعد کوئی فیکس یا فون آ جاتا ہے۔ اور بس۔ اسی لیے کہتے ہیں، بیٹیوں کے معاملے میں اتنی جلد بازی نہیں کرنی چاہیے۔" پھپھو نے متضاد رویے کا مظاہرہ کیا۔ امی کو غصہ تو آیا مگر پی گئیں۔

"اللہ کا شکر ہے۔ مجھے سیما کی کوئی فکر نہیں جیسے اس کے نصیب ہیں۔ اللہ سب بیٹیوں کے ایسے نصیب کرے۔ جمشید نے دنیا بھر کی خوشیاں اسے دی ہیں۔ دو چاند سے بچے ہیں۔ آسٹریلیا میں ان کا گھر نہیں محل ہے۔ سال بعد باپ بھائی میں ہم میں سے کوئی بھی جا کر مل آتا ہے۔ ایک آدھ بار وہ بھی چکر لگا لیتی ہے۔ بس دوری کا دکھ ہے۔ اس لیے تو چاہ رہی ہوں۔ دوسری کو اپنی نظروں کے سامنے رکھوں۔" وہ ایک پل کو رکیں۔ "تم اماں سے بات کرنا۔"

"کیوں نہیں بھابھی! درشہوار مجھے علینہ کی طرح عزیز ہے۔ میں خود بڑے بھائی سے بات کروں گی۔ اماں کے سامنے۔" پھپھو انہیں دلاسے دینے لگیں تو وہ خالی ذہن کے ساتھ دروازے سے ہٹ گئی۔



آج وہ کتنے دنوں بعد بازار آئی تھی۔ صائمہ کی برتھ ڈے تھی۔ اس کے لیے گفٹ خریدنا تھا۔ راحین اور فرحین اس کے ساتھ تھیں۔ فرحین کی نکتہ چین طبیعت نے دونوں کو شروع ہی میں بیزار کر دیا۔ ہر چیز میں سو کیڑے نکال کر وہ مزے سے آگے چل دیتی۔ راحین اور وہ ایک گھنٹے میں اپنی شاپنگ مکمل کر چکی تھیں۔ اس نے صائمہ کے لیے ایمبرائیڈڈ سوٹ اور میچنگ جیولری لی۔ اپنے لیے اسی طرح کا ایک سوٹ لیا۔ گھر کے چپل ٹوٹ گئے تھے وہ خریدے۔ امی کے لیے پرنٹڈ لان کا سوٹ اور بس۔ اس کی شاپنگ مکمل ہو گئی۔ اب وہ دونوں تھکے تھکے قدموں اور بگڑے موڈ کے ساتھ فرحین کے پیچھے ایک سے دوسری دکان کی سیڑھیاں چڑھ اور اتر رہی تھیں۔

"اوہ فری! تمہیں کچھ کیوں نہیں پسند آتا۔ آخر اور کتنا تھکاؤ گی۔" راحین بول ہی پڑی۔

"لو چیز لینی ہے تو بندہ پسند سے اچھی اور یونیک سی چیز لے۔ کوئی پیسے یونہی تو اٹھا کر نہیں پھینک دینے ہیں۔ تم لوگوں کی طرح دکانداروں کا کچرا نہیں سمیٹتی پھرتی۔" وہ ناک چڑھا کر آگ برساتی دھوپ کی شدت سے بے نیاز بولی مگر فرحین سے بحث کرنے کا کچھ فائدہ نہیں تھا۔ اس لیے دونوں سست قدموں سے چلتی رہیں۔

آخر خدا خدا کر کے فرحین بی بی کو ایک سوٹ پسند آ ہی گیا۔ دکاندار سے خوب جھک جھک کرنے کے بعد سوٹ خریدنے پر دونوں خوش خوش دکان سے باہر نکلیں۔

"چلیں اب گھر۔ قسم سے بہت بھوک لگ رہی ہے۔ تپش نے پیاس کو اور بڑھا دیا ہے۔" راحین بہن سے بولی۔

"جی نہیں۔ مجھے تو ابھی جوتی بھی لینی ہے اور میچنگ جیولری بھی۔ یہ سوٹ میں نے شہلا کی انگیجمنٹ پر پہننا ہے۔ اسی لیے جیولری زبردست قسم کی ہونی چاہیے۔ سپر اسٹور پر چلتے ہیں۔" ان کے ہوش اڑ گئے۔ سپر اسٹور یہ پوری مارکیٹ کراس کر کے آگے اگلی دو سڑکیں کراس کرنے کے بعد تھا۔ درشہوار تو دل میں پچھتائی کہ ان دونوں کے ساتھ آئی کیوں۔ آج تو اس فرحین کی بچی نے اس کی چوائس کو بھی رجیکٹ کر دیا تھا۔ فرحین انہیں سپر اسٹور لے ہی گئی۔ یہ شکر تھا کہ اسٹور ایئر کنڈیشنڈ تھا۔ فرحین جیولری پسند کرنے لگی۔ راحین بھی اپنے لیے

تابیں دیکھنے لگی۔ درشہوار اسٹور میں گھومنے لگی بہت بڑا اسٹور تھا دنیا کی ہر چیز اسٹور میں سجی ہوئی تھی۔ وہ ایک قطار سے گھوم کر دوسری طرف آئی۔ تیسری رو کتابوں کے شلف تھے۔ وہ اس طرف بڑھ گئی۔ وہ ''اداس نسلیں'' اٹھا کر دیکھ رہی تھی۔

''آہا! یہ تو درشہوار ہے۔'' کچھ جانی پہچانی قریب سے آتی آواز پر وہ اچھل ہی پڑی۔ سفید رنگ کے کاٹن کے سوٹ میں ملبوس کوئی خاتون نگاہوں کے حصار میں اسے لیے کھڑی تھیں۔ وہ ایک پل تو کیا کافی دیر کوشش کے باوجود انہیں پہچان نہ سکی۔

''کی حال ہے در!'' وہ اس کے قریب آ کر مخصوص لہجے میں بولیں تو اس کے جسم کے رونگٹے ایک پل کو کھڑے ہو گئے وہ کنفیوزی ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔ ''یہ تو شیریں ہیں۔'' اس کے دل نے سرگوشی کی۔

''ٹھ۔ ٹھیک ہوں۔'' اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

''پہچانا نہیں؟'' وہ بڑی محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر بولیں۔

''میں شیریں ہوں، پہچانا۔'' وہ ابھی جواب دینے کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ وہ خود ہی بول پڑی اور بڑی محبت سے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کھڑی ہو گئیں۔

''مجھے یقین تھا کہ تم ملو گی۔'' وہ جوشیلے مگر مدھم لہجے میں بولیں۔

''آپ!'' اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کیا کہنا چاہیے۔ اس نے خود کو ان کے حلقہ محبت سے آزاد کرانا چاہا۔ شیریں نے اسے اور خود سے قریب کر لیا۔

''چشم بددور، ماشاء اللہ بہت پیاری لگ رہی ہو۔ میرے تصور کی طرح۔'' وہ ایک دم سے اس کے بہت قریب بالکل سامنے آ کر کھڑی ہو گئیں۔ ایک لمحے کو ان کے ہونٹ بڑبڑانے کے سے انداز میں متحرک ہوئے اور پھر انہوں نے ایک ہلکی سی پھونک درشہوار کے چہرے پر ماری اور آگے بڑھ کر اس کی پیشانی چوم لی۔ یہ سب انہوں نے اتنی جلدی کیا کہ درشہوار ایک قدم پیچھے بھی نہ ہٹ سکی۔

''سدا خوش رہو، ہمیشہ میری نظروں کے سامنے۔'' وہ آہستگی سے کہہ کر پیچھے مڑیں۔

''یہ میرے بھائی یوسف جاہ ہیں۔ یوسف! یہ درشہوار۔'' درشہوار کی اب تک اس پہ یا تو نگاہ نہیں پڑی تھی یا وہ بندہ ابھی آ کر ادھر کھڑا ہوا تھا۔ لائٹ گرے پینٹ پر اسکائی بلیو

شرٹ میں اس کا قد چھ فٹ تک تو ضرور ہوگا اور خدوخال

اگر شیریں کہتی تھیں ان کے بھائی کی خاطر عورتیں اپنے سر کٹوا لیں گی تو غلط نہ کہتی تھیں۔ مردانہ وجاہت کا اتنا مکمل نمونہ اس سے پہلے اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ محض ایک پل کو ہی اس کی آنکھوں میں دیکھ سکی اور پھر نظریں جھکا کر کھڑی ہو گئی اور اس وقت وہ کس قدر احمق لگ رہی ہو گی۔ اس کا اسے اندازہ تھا۔

''مم۔ میں چلتی ہوں۔'' وہ چار آنکھوں کی تپش سے گھبرا کر کتاب ریک میں رکھتے ہوئے بولیں۔

''اوکے ڈیر! ہم بھی جا رہے ہیں۔ میں فون کروں گی تمہیں جلد ہی۔ بلکہ گھر آؤں گی۔ ایک بار پھر دامن امید پھیلا کر۔'' وہ آہستہ آہستہ بولیں۔

اس کا دوپٹہ سر سے ڈھلک کر کندھوں پر آ پڑا تھا اور کوشش کے باوجود وہ ہاتھ اوپر لے جا کر دوپٹہ درست نہ کر سکی۔

''اوکے در! پھر ملیں گی انشاء اللہ۔'' وہ اس کا سیاہ بالوں سے ڈھکا سر تھپتھپاتے ہوئے اسی میٹھے لہجے میں کہہ کر چل پڑیں۔ جدھر رامین اور فرمین کو وہ چھوڑ کر آئی تھی۔ دونوں وہاں موجود نہیں تھیں۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ شیریں اور یوسف جاہ بھی غائب تھے۔ بیرونی دروازے کی طرف جاتے بھی وہ نہ دکھائی دیے۔

''توبہ ہے۔ تم تو نہ جانے کہاں گم ہو گئیں۔ ہم تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہلکان ہو گئے۔ آخر ایسا کون مل گیا تھا۔ جو تمہیں ادھر کھڑا کر کے اسٹیچو بنا گیا۔''

فرمین کی طنزی آواز پر وہ اچھل ہی پڑی۔ ''ان دونوں نے انہیں دیکھ لیا ہوگا۔ اب یہ گھر جا کر سب کو بتا دیں گی۔ تائی جی کو ایک کی چار لگا کر۔'' وہ پریشان ہو گئی۔

''او ہو اب چلو بھی درشہوار! پہلے ہی اس فری کی بچی نے چار گھنٹے لگا دیے۔ اب تم ادھر فکس ہو گئی ہو۔ کوئی کتاب خریدنی ہے تو لو۔ قسم سے آج تو میرا بھوک اور پیاس سے حشر ہو گیا۔ آئندہ سے فری کے ساتھ نہیں آنا۔'' رامین کانوں کو ہاتھ لگا کر بولی۔

''میں کسی سے ملنے تو نہیں آئی تھی۔ میں تو کتابیں دیکھنے۔'' اس نے شاکی نظروں سے دونوں بہنوں کو دیکھا۔

''ارے تو اتنی بھری دوپہر میں بھوت پریت ہی ملا کرتے ہیں۔ تم نے اور کس سے

منا تھا۔ چلو اب بس۔" راحین نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا تو وہ ڈھیلے قدموں سے چل پڑی۔ دروازے سے باہر نکلتے ہوئے اس کی نگاہ یونہی ریسپشن پر پڑے میجل کیلنڈر پر پڑی۔

"آج منڈے تھا۔" اسے جھرجھری سی آ گئیں۔

"اوکے ڈیر! ہم منڈے کو ملیں گے۔" خوش باش اپنائیت بھری آواز اس کے کانوں میں چہکی۔ وہ خوفزدہ سی ہو گئی۔



اس روز پھپھو رات گیارہ بجے گھر گئیں۔ رات کے کھانے پر ہی اجلاس ہو گیا۔ دونوں فریقین اپنا اپنا موقف بیان کرنے کے لیے اس قدر بے تاب تھے کہ دانیال اور درشہوار کے اٹھنے کا بھی انتظار نہیں کیا گیا۔

"بھائی جان! میں یہ نہیں کہتی کہ آفاق اسٹیٹس نہ جائے، اسے جانا چاہیے اپنے پروفیشن میں مہارت حاصل کرنے کے لیے۔ ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں۔" آفاق بھائی بے نیازی سے کھانا کھاتے رہے۔

"اور جو میں نے ہاسپٹل کی درد سری ہے وہ۔" ڈیڈی تڑخے۔

"بھائی جان! کوئی مسئلہ نہیں ہاسپٹل کے کام کی نگرانی کے لیے خالد دو چار لوگوں کو بھیج سکتے ہیں پھر دانی تو ہے۔ کالج سے فارغ ہو کر یہ ادھر جا سکتا ہے۔ ہاسپٹل کا کام کتنے عرصے کا رہ گیا ہے۔"

"دو تین ماہ تو لگیں گے۔" ڈیڈی جلے ہوئے لہجے میں بولے۔

"تو اتنا ٹائم تو آفاق کو بھی لگ جائے گا باہر جانے میں۔ پھر شادی بھی تو ← درمیان میں۔ علینہ کے پیپرز بنوانے میں بھی اتنا عرصہ لگ جائے گا۔"

پھپھو کا ٹھنڈا لہجہ آفاق بھائی پر بجلی کی طرح گرا۔ چمچ ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ڈیڈی بھی کچھ نا سمجھی سے پھپھو کی طرف دیکھنے لگے۔

"وٹ رفل۔" دانیال کے منہ سے نکلا۔

"شٹ اپ۔" ساتھ بیٹھے آفاق بھائی آہستہ سے غرائے۔

"سائرہ کہہ رہی ہے کہ آفاق اور علینہ کی شادی باہر جانے سے پہلے ضروری ہے۔"

امی نے وضاحت کی۔

"ضروری نہیں بھابھی! بے حد ضروری۔" پھپھو زور دے کر بولی۔

"اچھی تجویز ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" ڈیڈی غیر معمولی طور پر ٹھنڈے ہو گئے۔

"مگر میں اس کے لیے تیار نہیں۔ میں وہاں پڑھنے جا رہا ہوں۔ سیر سپاٹے کرنے نہیں۔" آفاق بھائی چڑ کر بولے۔

"پڑھنا۔ تمہیں کون روکے گا۔ علینہ تمہارے ساتھ ہو گی تو تمہیں سہولت رہے گی۔ خود تمہیں ایک انڈہ ابالنا نہیں آتا اور چائے کے بغیر تم سے ایک سطر نہیں پڑھی جاتی۔" امی نے علینہ کے وجود کی افادیت بیان کی۔

"مگر امی! میں نہیں کر سکتا ابھی شادی۔" وہ جز بز ہو کر بولے۔

"میاں صاحبزادے! بات سنو میری۔" ڈیڈی نے کسی گرم جوش وکیل کی طرح زور سے میز پر مکا مارا۔ سارے برتن تھرتھرانے لگے۔

"تمہاری ایک بات مانی جا سکتی ہے۔ باہر جانا ہے تو شادی کر کے جاؤ ورنہ تم ابھی کم از کم تین سال تک باہر نہیں جا سکتے۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے آفاق بھائی کا ردعمل دیکھے بغیر اس زور سے کرسی دھکیل کہ کرسی پیچھے جا الٹی اور وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

پھر آفاق بھائی خوب چیخے چلائے سر پٹخا۔ ہاتھ جوڑے مگر کسی نے ان کی ایک نہ سنی اور انہیں سہرا باندھتے ہی بنی۔



اگلے مہینے علینہ جگمگ کرتا حسین روپ لیے ان کے گھر میں موجود تھی۔ علینہ کے ساتھ ہی ان کا گھر جہیز کے قیمتی اور بے تحاشا سامان سے بھر گیا کہ گھر میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ امی نے ایک ٹرک سامان کا پھپھو کے گھر واپس بھجوا دیا۔ کہ علینہ باہر سے آئے گی تو پھر خود ہی سیٹ کرے گی۔ پھپھو نے جو فرنشڈ کوٹھی علینہ کو دی تھی۔ وہ تو ویسے ہی بند تھی۔ ادھر علینہ نے صرف مہینہ ڈیڑھ مہینہ تو رہنا تھا۔ پھپھو نے اتنا کچھ دیا تھا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں محاورتاً نہیں حقیقتاً جیسے پھٹ گئی تھیں۔ ان کا دیا کسی بھی شمار قطار سے باہر تھا۔ گھر، گاڑی لاکھوں

کا بینک بیلنس اور انکل کی ساری جائیداد علینہ اور آفاق بھائی کے نام تھی اور یہ تو سب کو معلوم ہی تھا۔ کہ علینہ ان کی کروڑوں کی پراپرٹی کی اکلوتی وارث ہے۔ لیکن پتا ہونے اور نہ ہونے میں بڑا فرق ہوتا ہے اور یہ بات جب ہو گئی تو لوگ جیسے دنگ رہ گئے۔ سب سے بڑھ کر تایا جی اور ان کی فیملی جیسے دنگ ہو کر رہ گئی۔ "اتنا جہیز اور ہیرے جیسی دلہن۔"

علینہ نہ صرف شکل و صورت بلکہ مزاج کی بھی ہیرا تھی۔ وہ چند ہی ماہ میں سب کے ساتھ گھل مل گئی۔ درشہوار کے تو پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ اتنی پیاری اور خوش اخلاق بھابی پا کر۔

سیما اس کی دیوانگی پر ہنستی۔

ایک ماہ پلک جھپکتے میں گزر گیا۔ سیما واپس چلی گئی۔

علینہ اور آفاق شمالی علاقہ جات کی سیر کے لیے چلے گئے۔ ایک ماہ تک روانگی تھی۔

درشہوار تو ان کی روانگی کا سوچ سوچ کر ہی اداس ہو رہی تھی۔ دانیال کہتا۔

"امی! اس کو بھی کہیں رخصت کر دیں اب۔" تو امی آہ بھر کر چپ سی ہو گئیں۔ کتنا انہوں نے چاہا تھا کہ شادی کے دوران تائی جی کوئی شگن کر دیں تو ان کی ٹینشن کم ہو جائے۔ دادو اور پھپھو نے تائی جی سے بات کی تو وہ صاف ٹال گئی۔

"امی سے بات کا ذکر کروں؟" چپکے سے اس کے دل نے سوچا۔

"نہیں۔ بات کا کوئی سر پیر نہیں۔ امی کیا سوچیں گی۔" وہ اٹھ کر رامین کے ساتھ گپ شپ کرنے تائی جی کے پورشن میں آ گئی۔

"کس قدر دوغلی دنیا ہے، مطلب پرست۔ ہم نے تو لوگوں کا خدا جانے کیا بگاڑا ہے۔ جانو ہمارے تو نمک میں اثر ہی نہیں۔ اماں تمہاری بھی اماں اور تمہارے بھائی بہن بھی۔ مگر ساتھ ہمیشہ ان دونوں کا دیں گے۔ لوگ بڑے بیٹے کو جی جان سے بڑھ کر عزیز جانتے ہیں مگر تمہاری اماں نے ہمیشہ ڈنڈی ماری ہے۔" تائی جی زہر خند لہجے میں شاید تایا جی سے مخاطب تھیں۔ ان کی دادو سے کبھی نہیں بنی تھی۔ اسی لیے وہ زیادہ تر پھپھو کی طرف رہتی تھیں۔

"ایسا کیا کر دیا اب بے چاری اماں نے۔ اب تو وہ ادھر ہی رہتی ہیں سائرہ کی طرف۔" تایا جی کی بیزاری آواز۔ ان دونوں میاں بیوی کی آپس کی گفتگو تھی۔ وہ مڑ جانا چاہتی تھی کہ اگلے جملے نے اس کے قدم پکڑ لیے اور شیطان نے شانے تھام کر اسے کھڑا رہنے

پر مجبور کر دیا۔

"میں نے کہا اماں جی! آفاق کی شادی میں فرحین اور دانیال کی بات پکی کر دیتے ہیں۔ مگر وہ اپنی بات پر اڑی رہیں اور تمہاری بہن صاحب جو نوٹوں میں سانس لیتی اور سونے میں کھیلتی ہیں، ایک ہی ضد کہ جی درشہوار اور مہران کی بات پکی کر دو۔ سیما آئی ہوئی ہے پھر علینہ اور آفاق بھی چلے جائیں گے تو کیا واپس نہیں آ سکتے۔ کس قدر ہوشیار ہیں تمہارے بھائی اور بھابی۔ خود میسنوں کی طرح پیچھے رہے اور میرے پیچھے ان ماں بیٹی کو لگا دیا تمہاری بھابی لائے بہو کروڑ پتی اور میں لے آؤں اس کی بیٹی کو جو عام سا جہیز لائے۔ وہ پیٹیاں بستروں کی، چار سوٹ کیس، پچاس جوڑے، تیس چالیس تولے سونا۔ ایک فریج، ٹی وی، مشین اور بس۔ ہونہہ!" وہ پھنکار رہی تھیں "ایسا گیا گزرا نہیں میرا بیٹا۔ لاکھوں نہیں کروڑوں میں ایک ہے۔ جدھر نکل جاؤں رشتوں کی قطاریں لگ جائیں گی۔ اور میں تمہیں بتاؤں، نہ میں بھی کروڑ پتی بہو لائی چند ماہ کے اندر تو میرا بھی نام بدل دینا۔"

"تمہارا تو دماغ خراب ہے۔ درشہوار میں کیا کمی ہے۔ گھر کی بچی ہے۔ نیک خوبصورت اور بھابی اسے جہیز بھی خوب دیں گی۔ ایک ہی تو بیٹی رہ گئی ہے ان کی۔ کیوں غیروں میں جا کر پیسے کی خاطر مجھے اور خود کو ذلیل کرواؤ گی۔" تایا جی کا لہجہ مدھم تھا۔

"بس کریں۔ ساری زندگی آپ کے گھر والوں کی جی حضوری کا کیا صلہ ملا مجھے۔ میری بچی اگر عزیز نہیں انہیں تو میں کیوں ان کی لاڈلی کو سر پر اٹھاؤں۔ میرا بیٹا شہزادہ ہے تو بیٹیاں مجھے اس سے بڑھ کر عزیز۔" پتا نہیں تائی جی کس وجہ سے اتنی بگڑی ہوئی تھیں۔ شادی کے تمام فنکشنز میں بھی ان کا موڈ خراب رہا تھا۔

"تو کیا وٹہ سٹہ کریں ہم" تایا جی تیز ہوئے۔

"وٹہ سٹہ بعد کی بات تھی۔ پہلے فرحین اور دانیال کی کرتے اور ہم کوئی جاہل لوگ ہیں جو وٹہ سٹہ بہانہ کہیں اور اس میں ایسا کوئی حرج بھی نہیں تھا۔" یہ تھی تائی جی کے خراب موڈ کی وجہ۔

"ارے اللہ کی بندی! دانیال ابھی پڑھ رہا ہے۔ اس کا بھی کیا قصور ہے تم نے فرحین کو ایف اے کرا کے گھر بٹھا لیا ہے جیسے اس کی ڈولی تیار تھی۔ الٹا بچی کا ذہن خراب کیا رشتے کی آس دلا دلا کر۔ گھریلو سیاست میں اسے قبل از وقت ڈال دیا۔ ہر بات، ہر کام عمر

کے لحاظ سے اچھا لگتا ہے۔ وہ ابھی سے تم سے سب کچھ سیکھ بیٹھی ہے۔ فلاں سے یہ مفاد ہے فلاں سے ملنا ہے فلاں سے کوئی مطلب نہیں، اس سے نہیں ملنا اور رشتے ناتے ہوتے ہیں چاہت سے۔ اگر انہیں چاہت ہوتی تو وہ خود مانگتے۔ یوں کسی کے سر پر تھوپنے سے رشتے نہیں جڑتے اور درشہوار کا رشتہ تم نے خود اماں جی سے کہہ کر مانگا تھا۔ انہوں نے تو آس لگائی تھی۔ اب تم خود اپنی بات سے پیچھے ہٹ رہی ہو۔''

''میں خراب کر رہی ہوں فرحین کو۔ یہی مطلب ہے نا تمہارا۔ میں ہی سب کام خراب کرتی ہوں اگر میں نے رشتہ مانگا تھا تو ان لوگوں کو بھی ہمارا خیال کرنا چاہیے تھا۔'' تائی جی اب چیخ رہی تھیں۔ وہ ڈر کر واپس اپنے پورشن میں آ گئی۔

''یا اللہ! یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ اگر تائی جی ایسا چاہتی ہیں یا دادو کے کہنے پر یہ رشتہ ہو بھی گیا تو میں ساری زندگی تائی جی کو خوش نہیں کر سکتی تھی۔ امی یہ کیوں نہیں سوچتیں۔ تائی جی کبھی بھی کسی سے خوش نہیں رہ سکتیں۔ یہ مجھے معلوم ہے۔'' وہ اپنے کمرے میں آ کر چپ چاپ بستر میں لیٹ گئی۔



پھر آفاق اور علیزہ آپی اٹلانٹس چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی جیسے گھر بھر میں الو بولنے لگے۔ پورے تین ماہ کی خوب رونق کے بعد یہ خاموشی بے حد عجیب اور بری لگ رہی تھی۔ آفاق بھائی کے قہقہے اور علیزہ آپی کی چہکاریں، دانیال کے لطیفے، امی کی مسکراہٹ اور ڈیڈی کی بارعب خاموشی۔ ان دنوں گھر کی دیواریں بھی چہک رہی تھیں اور دانیال آفاق بھائی کی خوشی کو دیکھ کر کہتا۔

''بھائی سارا ڈرامہ اس لیے کرتے رہے ہیں کہ امی ڈیڈی ان کی شادی جلد سے جلد کر دیں۔ اسی لیے تو انہوں نے باہر جانے کی دھمکی دی تھی جو پر اثر ثابت ہوئی۔''

''دانی کے بچے!'' آفاق بھائی اسے ایک ہاتھ جڑ دیتے۔ دانیال کی بات پر جتنے رنگ علیزہ آپی اور آفاق بھائی کے چہرے پر آتے تھے درشہوار کو یقین ہو گیا کہ دانیال ٹھیک کہہ رہا ہے۔

پھر وہ چلے گئے ساری رونقیں جیسے خاموش ہو گئیں۔ ڈیڈی کلینک اور ہاسپٹل میں مصروف تھے۔ دانیل ان کے ساتھ کالج کے بعد رات گئے تک رہتا۔ امی بھی چپ سی ہو گئیں

تھیں۔ اب تو تائی جی کی طرف بھی کم ہی جاتی تھیں اور تائی جان نے تو عرصے سے ادھر آنا چھوڑ دیا تھا۔

اس نے تنگ آ کر کمپیوٹر کورس جوائن کر لیا۔ رزلٹ آنے میں بھی ڈیڑھ ماہ تھے۔ اسی دوران ربیعہ کی جٹ منگنی پٹ بیاہ ہو گیا۔ صائمہ کا نکاح ہو گیا۔ ان دونوں کی شادی پر امی جیسے پھر بے چین ہو اٹھیں۔ ڈیڈی کے سمجھانے کے باوجود ایک ہی بات پر ان کی سوئی اٹک گئی تھی۔

''سیما کی تو میں نے انٹر کے بعد شادی کر دی تھی۔ اس نے تو بی ایس سی بھی کر لیا اور اچھا رشتہ کوئی آ نہیں رہا۔''

''فوزیہ! مجھے حیرت ہو رہی ہے۔ تم پڑھی لکھی ہو کر یہ سب سوچ رہی ہو۔ میری بیٹی میں کس چیز کی کمی ہے۔ تم اس کا ذہن کیوں خراب کر رہی ہو۔ اسے اطمینان سے ایم ایس سی کر لینے دو۔ ایک چھوڑ کر دس رشتے آ جائیں گے۔'' ڈیڈی انہیں دلاسا دیتے۔

''کہاں سے آ جائیں گے۔ پچھلے ماہ آپ کے ڈاکٹر اکرام اور ان کی مسز کیسے خوش خوش گئے تھے اور بعد میں جا کر جیسے سو گئے پوچھا تو بھولپن سے کہنے لگے کہ بیٹا ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔ بھلا گھر سے بیٹے سے صلاح کر کے نکلو۔'' وہ چڑ کر بولیں۔

''کیوں اپنا خون جلاتی ہو۔ ہو جائے گی جب ہونا ہو گی۔ ہماری بیٹی میں کیا کمی ہے۔'' ڈیڈی لاپروائی سے بولے۔ ''اسے آگے پڑھنا ہے۔''

''اور وہ بڑے بھائی کیسے تڑپ رہے تھے آفاق کی شادی میں۔ مجھے ہاں کر دو۔ ابھی فنکشن کر لو اور میں اماں جی کی وجہ سے چپ رہی کہ وہ مجھے مہران کے سلسلے میں کچھ تو کہیں گی۔ شادی بھی گزر گئی۔ دونوں طرف سے جواب بھی ہو گیا۔ نثار بھائی کی بیگم کو اپنی بھانجی پسند آ گئی۔ میرا کتنا دل برا ہوا۔ ان کا بیٹا سی اے تھا اتنا قابل۔'' امی کو سارے پچھتاوے یاد آ رہے تھے۔

''اوہو ایک در بند سو در کھلے۔ اللہ بہتر کرے گا۔ اب سو جاؤ تم۔'' ڈیڈی نے لیمپ آف کر کے کروٹ بدل لی۔ مگر امی کی آنکھوں سے نیند جیسے روٹھ گئی تھی۔ عجیب سے وہم ستانے لگے تھے۔

''سب کی بیٹیوں کی بات چل رہی ہے۔ شادیاں ہو رہی ہیں۔'' بڑے دل جلانے

والے خیالات آتے تھے اور صبح تائی جی مٹھائی کا ڈبہ اٹھائے چلی آئیں۔

''فرحین کی بات طے ہوئی ہے ان کے دوست کے بیٹے سے۔ بڑے اچھے لوگ ہیں۔ لڑکا ایم بی اے ہے۔ لیدر گارمنٹس اور ریڈی میڈ گارمنٹس کی دو فیکٹریاں ہیں۔ ابھی صرف زبانی بات ہوئی، کل ہم لڑکا دیکھنے گئے۔ انہوں نے گیارہ کلو مٹھائی کا ٹوکرا گاڑی میں رکھوا دیا۔ میں نے کہا بھی، ابھی لڑکی کی دادی جان سے بات نہیں کی۔ اتنے چاہت والے لوگ ہیں۔ پیچھے ہی پڑ گئے۔ ناچار مٹھائی لانا پڑی۔'' امی اور دادو حیران رہ گئیں۔ دادو ابھی پھپھو کے گھر سے آئی تھیں۔

''تو بہو بیگم! ایک ہی دفعہ تاریخ طے کر کے بتا دیتیں۔'' دادو بڑی سہولت سے بولیں۔

''تو ہم نے کون سی تاریخ طے کر لی ہے۔ لڑکا ہی تو دیکھا ہے۔ اب یہ ان لوگوں کی خوشی۔ دیکھے بھالے لوگ ہیں۔ اس لیے فرحین کے ڈیڈی مان گئے۔ آپ سے آج بات کر لیں گے۔''

''اب بات کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہر بندہ اپنے گھر میں چوہدری ہے۔ ہماری کیا ضرورت۔'' دادو خفا ہو گئیں۔

''اماں جی! مجھے ایک بات بتایئے۔'' تائی جی ابرو اچکا کر بولیں۔ ''جب ہم کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو اتنے اعتراضات کیے جاتے ہیں اور لوگ منگنیاں چھوڑ کر اندر ہی اندر شادیاں تک طے کر لیتے ہیں اور کسی کو ہوا نہیں لگنے دیتے۔ سیما کی دفعہ شادی کی تاریخ طے ہونے پر ہمیں بلایا گیا تھا۔'' تائی جی پوری طرح لیس ہو کر آئی تھیں۔

''بہو! سیما کی بات اور تھی۔ انہوں نے منگنی کے بجائے سیدھے نکاح کیا تھا۔ بچی کے کاغذات بنوانے تھے۔ انہوں نے اس لیے اس قدر جلدی کی۔ ان لوگوں کا پہلا کام نکاح ہی تو تھا جس کی تاریخ طے کرنے کے لیے سب کو بلوایا تھا۔ باقی لڑکے کو دیکھنے تو عثمار بھی گیا تھا۔ تم غالباً بھول گئیں۔'' دادو کا حافظہ اس عمر میں بھی بلا کا تیز تھا۔

''ہاں۔ میں ہی بھول جاتی ہوں۔ لوگ سب یاد رکھتے ہیں۔ بہر حال آج رات کو ان کے ساتھ جا کر لڑکے سے مل آیئے گا۔ اگلے ہفتے انہوں نے منگنی کرنی ہے جس کو خوشی ہو گی۔ وہ ہمارے ساتھ چل پڑے گا۔'' وہ روٹھے روٹھے انداز میں کہہ کر چل دیں۔

''دیکھا تم نے اس کا حال۔ ہر بات میں مقابلے بازی۔ پتا نہیں اس کی ذہنیت اس قدر منفی کیوں ہے۔ عثمار کو بھی اپنے جیسا کر لیا ہے۔'' دادو افسردہ لہجے میں بولیں۔

''اماں جی! آپ نے بات کی عثمار بھائی سے۔'' امی جھجک کر بولیں۔

''کی تھی۔ وہ کون سا کم ہے۔ بیوی کا ہم خیال۔ ہم زبان۔ پتا نہیں کون کون سے گلے شکوؤں کی پٹاری کھول کر بیٹھ گیا اور آخر میں صاف انکار کر دیا کہ مہران کی ماں نہیں مانتی اور مہران بھی اپنی کلاس فیلو سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ بہو بیگم آج کل میں لڑکی بلکہ اس کا گھر بار دیکھ کر فیصلہ سنائیں گی۔''

دادو بغیر لگی لپٹی کے بولیں۔

''اور میں کہوں چھوٹی دلہن! تم بھی دل سے یہ خیال نکال دو۔ درشہوار کا ادھر ہو بھی جائے تو بھی ان لوگوں کے ساتھ اس کا گزارہ مشکل ہے۔ ہر بات میں شہناز کوئی نہ کوئی فساد کا نقطہ کھڑا کر دیتی ہے اور ہماری بچی تو بہت معصوم ہے۔ اللہ مالک ہے۔''

''اماں جی! جو آتا ہے، پہلے خوش خوش جاتا ہے۔ بعد میں جا کر یا تو کوئی بہانہ کر دیتا ہے یا صاف انکار۔'' امی روہانسی ہو کر بولیں۔

''تم جتنا اس بات کو سر پر سوار کرو گی۔ اتنا ہی پریشان ہو گی۔ اللہ پر چھوڑ دو یہ معاملہ۔''

''اماں جی! فرحین اور درشہوار کی عمروں میں صرف ایک سال کا فرق ہے۔ پھر اس کی دوستوں کی بھی شادیاں ہو گئیں۔ ایم ایس سی کرے گی تو اور مشکل ہو جائے گی۔'' امی خدا جانے آج کل ایسا کیوں سوچے جا رہی تھیں۔

''ویسے فوزیہ! ایک بات کہوں، برا نہ ماننا۔'' دادو کچھ مدھم آواز میں بولیں۔

''اماں جی! آپ کی بات کا کیا برا ماننا۔''

''کہتے ہیں، پہلا رشتہ اللہ کی رحمت ہوتا ہے۔ رحمت کو ٹھکرا دو تو پھر یونہی بندہ خوار ہوتا ہے۔'' درشہوار کے کان کھڑے ہو گئے۔

''پہلا کون سا اماں جی!'' امی رک گئیں۔ ''اوہ وہ ......'' وہ یاد آنے پر بولیں۔ ''اماں جی! وہ میں نے آپ کو بتایا تھا۔'' امی اب بالکل سرگوشی میں بول رہی تھیں۔ وہ کوشش کے باوجود نہ سن سکی۔ دادو سر ہلائے جا رہی تھیں۔ اس کا مارے تجسس کے برا حال تھا۔

''درشہوار! جاؤ اماں جی کے لیے اور میرے لیے چائے کے دو کپ بنا کر لے آؤ اور دیکھو، شریفاں نے ہنڈیا چولہے پر رکھی۔ اس کے ساتھ مل کر کھانا بنایا کرو۔ اب تم بچی تھوڑا ہو۔'' امی نے اسے جھڑکا تو وہ بادل نخواستہ اٹھ کر کچن میں آ گئی۔

''پتا نہیں دادو کس پروپوزل کی بات کر رہی تھیں۔'' اس کا ذہن اسی نکتے پر اٹک گیا۔



وہ اوپر ٹیرس پر کھڑی تھی۔ جب اس نے تائی جی کو گاڑی میں بیٹھ کر کہیں جاتے دیکھا۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی نیچے آ گئی۔

''فرحین کو مبارک باد دے آؤں۔'' امی اور دادو لاونج میں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ ''امی! میں تائی جی کی طرف ہوں۔'' کہہ کر وہ دوسرے پورشن میں آ گئی۔ دونوں بہنیں سٹنگ روم میں بیٹھی فیشن میگزین کھولے ڈریسز کے ڈیزائن دیکھ رہی تھیں۔

''ہیلو کیا ہو رہا ہے۔'' وہ بھی ان کے قریب ہی کشن کھینچ کر بیٹھ گئی۔

''کچھ بھی نہیں۔ یہ ڈیزائن دیکھ رہے تھے۔ اچھا ہے ناں! آج کل یہی فیشن ان ہے پھر سے اونچی قمیضوں اور تنگ پائجاموں جیسی شلواروں کا فیشن آ گیا ہے۔ میں نے اپنا سوٹ دینا تھا ٹیلر کو اس لیے۔'' راحین نے کھلا ہوا میگزین اس کے آگے کر دیا۔

''ہاں، اچھا ہے۔ بنوا لو۔ تمہیں سوٹ کرے گا۔'' اسے بھی ڈیزائن پسند آیا۔

''تائی جی کہیں گئی ہیں۔'' اس نے کچھ محتاط لہجے میں پوچھا۔

''ہاں۔ بازار گئی ہیں۔ ہم دونوں نے بھی جانا تھا مگر ابھی انہوں نے جیولر کی طرف جانا تھا۔ جاتے ہوئے ڈیڈی کو چیمبر سے پک کریں گی۔'' راحین نے جواب دیا تو فرحین نے بہن کو کڑی نگاہ سے دیکھا۔ وہ گھبرا کر پھر سے میگزین دیکھنے لگی۔

''ہاں۔ میں بھی آئی تھی کہ فرحین کو مبارک باد دے دوں۔ دادو آئی ہوئی ہیں وہ ویسے بھی آج کل ہر وقت کچن میں گھسائے رکھتی ہیں ٹائم ہی نہیں ملتا۔ فرحین! مبارک ہو۔'' وہ فرحین کے حسب معمول اکھڑے اکھڑے رویے کی پروا کیے بغیر خوش دلی سے بولی۔

''خیر مبارک، ہیں چچی جان تمہاری بھی تو تیاریاں نہیں کر رہیں اگلے گھر رخصتی کی جو تمہیں ابھی سے خانہ داری میں جھونک دیا ہے۔'' وہ اپنی عادت سے مجبور تھی، طنزیہ لہجے میں بولی۔

''ان کی وہ جانیں ہمیں نے بھی تو ٹائم پاس کرنا ہے، رزلٹ آئے تو کچھ کروں، یوں گھر میں ٹائم پاس کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ کمپیوٹر کورس کے لیے بھی ایک مہینہ ہی گئی ہوں، دانیال اپنا کمپیوٹر لے آیا تو میرا کورس بھی ڈراپ کرا دیا کہ میں...... سکھاؤں گا تمہیں اور اب نواب صاحب کو ٹائم ہی نہیں ملتا۔'' وہ اس کے طنز کی پروا کیے بغیر بولی۔

''شہوار! چائے پیو گی، ہم نے بھی ابھی نہیں پی۔'' راحین اٹھتے ہوئے بولی۔

''ہاں پی لوں گی۔'' اس نے میگزین اپنی طرف کھسکا لیا۔

''اور اپنے فیانسی کے بارے میں تو کچھ بتاؤ فری!'' اگر نہ پوچھتی تو فری نے کہنا تھا، جل گئی۔

''یہ راحین بتائے گی تمہیں۔ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔ یہ تو گرم پانی گھول لائے گی۔''

فرحین پھرتی سے اٹھتے ہوئے بولی تو دونوں نے حیرت سے اسے دیکھا، وہ تو کچن کے نام سے الرجک تھی۔ فرحین چائے بنانے چلی گئی۔

''عاطف نام ہے فرحین کے فیانسی کا۔ اچھے لوگ ہیں، تین بہن بھائی ہیں۔ یہ سب سے بڑے ہیں۔ یہ لوگ جلدی منگنی اور شادی دونوں کرنا چاہ رہے ہیں۔ منگنی تو شاید اسی ہفتہ دس دن میں اور شادی بھی جلد ہی۔ ان کے کوئی ماموں ہیں، انہوں نے اگلے ماہ کے اینڈ میں انگلینڈ جانا ہے۔ اسی لیے ان کو جلدی ہے۔ ویسے آج انہوں نے آنا ہے۔ منگنی کی تاریخ فکس کرنے۔'' راحین نے اسے تفصیل بتائی۔

''یہ تو اچھی بات ہے پر یار! میرے پاس تو کوئی ڈھنگ کا سوٹ بھی نہیں۔ جو ہے وہ میں ربیعہ اور صائمہ کے فنکشنز میں پہن چکی ہوں، اب ہفتے بھر میں کیا تیاری ہو گی بھلا۔'' اسے اپنی فکر پڑ گئی۔

''یہی تو میں نے بھی امی سے کہا ہے۔ مگر انہیں تو آج کل جنون ہوا ہے شادی کا منگنی کا۔ تم اس کو چھوڑو۔ اصل خبر تو مہران بھائی کی منگنی کی ہے۔'' راحین اس کی طرف جھک کر ذرا راز داری سے بولی۔ ساتھ ہی لاونج کے دروازے کی طرف بھی دیکھ رہی تھی۔ فرحین نے اسے اس بات سے منع کر رکھا تھا۔ مگر وہ درشہوار سے کچھ بھی چھپا نہیں سکتی۔

"بھائی کی کوئی کلاس فیلو ہے شانزہ۔ خوبصورت تو بس نارمل ہے مگر دولت ابنارمل ہے۔ یعنی خوب پیسے والی ہیں۔ اکلوتی بیٹی ہے، بہت بڑے انڈسٹریلسٹ احسان احمد کی۔ پہلے تو امی راضی ہی نہیں تھیں بھائی کی پسند وغیرہ کے معاملے میں مگر جب ان کا محل دیکھا، تمہیں معلوم ہی ہے، امی کی کیا حالت ہوئی ہوگی اور اب کہتی ہیں شانزہ کو ابھی گھر لے آؤں۔ ہم دونوں بھی گئے تھے، ڈیڈی کے ساتھ۔ وری! ان کا گھر جیسے کانچ کا محل ہوتا ہے کوئی خوبصورت نازک سا خواب آنکھ کھلی تو سب غائب۔" راحین اسے بتاتے ہوئے جیسے کھو سی گئی۔

"اچھا پھر تو دوہری مبارک باد۔" کہتے ہوئے اس نے اپنے دل کے اندر جھانکا۔ وہاں ٹوٹنے جڑنے والی کوئی بات نہ تھی۔ اسے خوشی ہوئی کہ اس کے دل نے کوئی بھونڈی سی آس نہیں لگائی تھی۔ اس نے دھیرے سے دل کا شکریہ ادا کیا تو اس کا دل پر اسرار انداز میں مسکرانے لگا۔

"تم کہاں پہنچ گئی ہو؟" راحین نے اسے پکارا۔

"جہاں تم سوچ رہی ہو کہ شانزہ کا گھر کتنا خوبصورت ہوگا۔" وہ شرارت سے بولی۔

"مذاق اڑا رہی ہو۔" وہ خفگی سے بولی۔ "دیکھو گی تو تم بھی یہی کہو گی۔"

"مذاق کب اڑا رہی ہوں۔ مجھے تو خود تجسس ہو گیا ہے کہ شانزہ سے پہلے اس کا گھر دیکھ لوں۔"

"مگر ایک مشکل ہے۔" راحین نے اس کی طرف مزید جھکی۔

"وہ کیا؟" فرحین اب یقیناً آنے والی تھی۔

"احسان صاحب کو میرے خیال میں بلکہ ڈیڈی نے بھی کہا ہے کہ انہیں داماد کی نہیں گھر داماد کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے ان کی اکلوتی بیٹی ہے پھر کروڑوں کی وارث، یونہی تو ہماری جھولی میں نہ ڈال دیں گے۔ بلکہ یہ بات تو......"

"توبہ ہے، کچن میں تو بہت گرمی ہے۔ امی نے فضول کی رٹ لگا دی ہے۔ میرے پیچھے کہ کچن کا کچھ سیکھ لوں لیکن ابھی بہت گرمی ہے جو سیکھنا ہے سردیوں میں سیکھوں گی۔ صابرہ کی بچی کو بھی آج ہی چھٹی مارنی تھی۔" وہ چائے کی ٹرے اٹھائے پسینے میں تر بتر باہر نکلتی

ہوئی اندر آئی۔

"سردیوں تک تو تم پیا گھر سدھار چکی ہوگی۔" درشہوار نے اسے چھیڑا۔

"ایسی بھی ایمرجنسی ابھی نافذ نہیں ہوئی۔" وہ ٹرے رکھ کر ٹشو باکس سے ٹشو نکال کر چہرہ صاف کرنے لگی۔

"منگنی میں ایمرجنسی نافذ ہو رہی ہے۔ تو شادی میں بھی ہو جائے گی۔ کیوں راحی!"

"بالکل۔ امی بھی یہی کہہ رہی تھیں۔"

"تم اپنی چونچ بند رکھو امی کی چمچی!" فرحین کو خواہ مخواہ غصہ آ گیا۔ تو راحین آگے بڑھ کر چائے کپوں میں انڈیلنے لگی۔



پھر واقعی جیسے ایمرجنسی نافذ ہو گئی۔ منگنی والے روز ہی وہ شادی کی تاریخ پر اصرار کرنے لگے تو دادو کو غصہ آ گیا۔

"آخر ایسی بھی کیا جلدی۔ لڑکی کو ہم ہاتھ پر لیے بیٹھے ہیں۔ منگنی پھٹنگنی۔ شادی میں کچھ وقت تو ہونا چاہیے۔" اشارے کنایے میں وہ بہت کچھ کہہ گئیں۔ تائی جی کو خواہ مخواہ غصہ آ گیا۔ وہ دادو کو گھور گھور کر دیکھنے لگیں۔ امی نے دادو کو ٹہوکا دیا۔

"ہم نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ہمیں شادی جلد چاہیے اور شہناز مان بھی گئی تھیں۔ اب اگر آپ نہیں تیار تو پھر......" فرحین کی ساس ناک چڑھا کر بولیں۔ دادو کو ان کا ادھورا دھمکی آمیز جملہ آگ لگا گیا۔

"تو پھر کیا؟" انہوں نے عینک مزید ناک کے اوپر چڑھائی۔ "ہماری لڑکی میں کیا کمی ہے جو......"

"ارے شائستہ بہن! آپ بھی کن باتوں میں پڑ گئیں۔ چھوڑیں جب آپ کہیں گی۔ ہم تاریخ مقرر کر لیں گے۔ ہم نے پہلے کہہ جو رکھا ہے پھر یوں لوگوں میں بات کرنے کا فائدہ۔" تائی جی انتہائی گستاخی سے اپنی سمدھن کا ہاتھ پکڑ کر دوسری طرف لے گئیں۔ دادو اتنی بے عزتی پر جیسے بے ہوش ہونے کو تھیں۔

"ہم لوگ..... فوزیہ! یہ کیا کر گئی ہے بڑی بہو!" وہ صدمے سے چور تھیں۔

''اماں جی! عادت ہے بھابھی بیگم کی۔ آپ دل پر نہ لیں۔ وہ اسی طرح اکثر بے سوچے سمجھے بول جاتی ہیں۔ ان کا مقصد آپ کی دل آزاری نہیں تھا۔''

پتا نہیں امی تائی جی کی حمایت کر رہی تھیں کہ دادو کو دلاسا دے رہی تھیں مگر درشہوار کو بھی تائی جی کا انداز بہت برا لگا تھا پھر دادو تھوڑی دیر ہی ادھر بیٹھیں جیسے ہی انگوٹھی پہنانے کی رسم ہوئی وہ امی کا سہارا لے کر ان کے پورشن میں آ گئیں۔

''فوزیہ! میں کچھ دیر آرام کروں گی۔ ادھر کسی کو نہ بھیجنا اور تم بھی جاؤ ادھر پھر بہو کا موڈ بگڑ جائے گا۔'' دادو بستر میں لیٹ گئیں تو امی نے درشہوار کو اشارہ کیا کہ وہ ادھر ہی رہے۔

فنکشن بہت روکھا پھیکا سا تھا۔ تائی جی سارا وقت اپنے سمدھیوں کے ہی آگے پیچھے پھرتی رہیں۔ اپنے رشتہ داروں کی تو جیسے انہیں پروا ہی نہیں تھی۔ کسی کو فرحین کے سسرالوں کے قریب بھی پھٹکنے نہ دے رہی تھیں۔

''یہ بھابھی بیگم کو کیا ہو گیا ہے۔ لگتا ہے آنکھوں پر چربی چڑھ گئی ہے۔ انہیں تو کوئی نظر ہی نہیں آ رہا اور پھپھو ان کے پورشن کی طرف آتے ہوئے امی سے بولیں۔

''امی! دادو کی طبیعت خراب ہے۔ ڈیڈی انہیں چیک کر رہے ہیں۔'' دانیال انہیں کاریڈور ہی میں مل گیا۔

''کیا اماں جی ادھر ہیں؟ انہیں کیا ہوا؟'' پھپھو پریشان ہو گئیں۔

دادو کی طبیعت واقعی خاصی خراب تھی۔ بی پی بے حد لو جا رہا تھا۔

''کیا ہوا اماں جی کو۔ بھابھی! شام تک تو یہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھیں۔'' پھپھو کی تو جان تھی دادو میں۔

''بس شام کو ہی مجھ سے کہنے لگیں کہ ادھر میرا دل گھبرا رہا ہے۔ مجھے ادھر لے جاؤ۔'' امی نے قصداً جھوٹ بولا۔

''ہاں، وہاں تو اچھے اچھوں کا دل گھبرا رہا تھا۔ بھابھی بیگم کی اوچھی حرکتوں سے۔'' وہ بڑبڑائیں۔

دو تین گھنٹوں بعد دادو کی طبیعت سنبھلی تو تایا جی اور تائی جی آ گئے۔ شاید دادو سے معذرت کرنے درشہوار نے سب کو چائے دیتے ہوئے سوچا۔

''اماں جی! ہم نے اگلے ماہ کی انتیس تاریخ دے دی ہے ان لوگوں کو۔ بلند تھے

وہ۔'' دادو کا سرسری سا حال پوچھنے کے بعد تایا جی نے اطلاع بہم پہنچائی۔ پھپھو نے ابرو اٹھا کر بھائی کو دیکھا۔

''بیٹا! تمہارا مال ہے۔ تم بہتر فیصلہ کرنے والے ہو۔ اچھی بات ہے۔ مبارک ہو۔'' دادو نے بڑے تحمل سے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

''ایسی بھی کیا جلدی ہے، خدانخواستہ لڑکی بھاگی جا رہی ہے یا لڑکا۔'' پھپھو منہ پھٹ تھیں۔ رہ نہ سکیں تو بول پڑیں۔

''سائرہ! تم چپ رہو۔'' دادو نے پھپھو کو جھڑکا تو وہ حیرت سے ماں کی شکل دیکھنے لگیں۔

''دیکھ لیا آپ نے نتیجہ اپنوں سے خوشیاں شیئر کرنے کا۔'' تائی جی نے چبا چبا کر تایا جی سے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ''میری بچی کیوں۔ بھاگے گی دوسروں کی، جو خواہ مخواہ کسی کے سر تھوپنے کو تیار بیٹھے ہیں۔ چلیں جی۔''

تائی جی فوں فوں کرتی باہر نکل گئیں۔ امی کو تو جیسے آگ لگ گئی، انہیں معلوم تھا کہ تائی جی کیا کہہ گئی ہیں۔ دادو نے امی کو ہاتھ کے اشارے سے روکا۔

''فوزیہ! کیچڑ میں پتھر پھینکو تو اپنے کپڑے گندے ہوتے ہیں۔'' تایا جی ابھی چوکھٹ پر تھے کہ دادو نے امی سے کہا۔ تایا جی نے ایک شکایت آمیز نگاہ ماں کے چہرے پر ڈالی اور ڈھیلے قدموں سے باہر نکل گئے۔

''پتا نہیں کیا دماغ خراب ہوا ہے ان لوگوں کا اور بھائی جان کو دیکھیں کیا دم ہلاتے گئے ہیں بیوی کے پیچھے۔ بیمار ماں کی بھی پروا نہیں کی۔'' پھپھو کو کون چپ کرا سکتا تھا۔ ''چلیں اماں جی! گھر چلتے ہیں۔'' وہ دادو کے پاس بیٹھ کر بولیں۔ پھر ڈیڈی نے بہت روکا کہ ابھی اماں جی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ یہ دو چار دنوں میں آ جائیں گی۔

''ادھر رہیں گی تو اور طبیعت خراب ہو گی۔ ادھر ڈاکٹر قریشی ہیں برابر میں۔ وہ انہیں ٹریٹ کرتے ہیں اور آپ کے برابر میں بندے کو مارنے کا سامان موجود ہے۔'' وہ تایا جی کے پورشن کی طرف اشارا کرتے ہوئے طنزاً بولیں تو پھر ڈیڈی بھی چپ کر گئے۔



پھر مہینہ بھر میں فرحین کی شادی کی تیاریاں بھی ہو گئیں۔ تائی جی نے دوبارہ ان

کے پورشن میں قدم نہیں رکھا۔ شادی سے تین دن پہلے تایا جی غیروں کی طرح کارڈ تھما کر چلے گئے اور شرمندہ شرمندہ سے لہجے میں آنے کی تاکید کر گئے۔ پھر ڈیڈی نے بھی انہیں غیروں کی طرح سارے فنکشنز میں ان ٹائم بھیجا اور تائی جی انہیں جدھر دیکھتیں منہ پھیر کر چل دیتیں۔ پھپھو تو صرف بارات میں آئیں۔ گھنٹہ بھر بیٹھیں اور دادو کو لے کر واپس چلی گئیں اور اس پورے مہینے میں وہ دونوں بہنیں بھی ادھر نہیں آئیں۔ اس کا کتنا دل چاہتا تھا کہ تینوں مل کر شاپنگ کریں۔

"مجھے تو درشہوار کی چوائس پر مکمل بھروسا ہے۔ میں تو اس کے بغیر شاپنگ کر ہی نہیں سکتی۔"

اور وہ سارا مہینہ منتظر ہی رہی کہ کب فرحین اس سے کہے کہ "چلو ناں مجھے لہنگا پسند کرنے جانا ہے۔ یا جوتا لینے جانا ہے۔" مگر ایسا کوئی بلاوا نہیں اسے آیا ہی نہیں۔ وہ خود ہی ڈھیٹوں کی طرح دو دفعہ گئی۔ تائی جی نے تو اس کے سلام کا جواب بھی نہیں دیا۔ راحین البتہ اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ تائی جی کے گھورنے کے باوجود۔ اور وہ ان کی زہریلی نگاہوں سے گھبرا کر چھ سات منٹوں ہی میں واپس آ گئی۔

تایا جی کا لان ان کے لان سے زیادہ خوبصورت تھا۔ تایا جی کو خود بھی گارڈننگ کا شوق تھا۔ کیاریوں میں لگے پودے خوش رنگ و خوشبودار پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔ گھاس سرسبز اور بالکل ٹھیک کٹی ہوئی تھی وہ شام کو چھیرے سے آ کر ایک گھنٹہ لان کو ضرور دیتے تھے۔ اور ان کے اپنے لان میں تو کوئی خوبصورتی تھی ہی نہیں۔ ڈیڈی نے چار مالی بدلے تھے اور چاروں نکمے۔ کوئی بھی ان کے لان کو تایا جی کے لان جتنا خوبصورت نہ بنا سکا تھا۔ وہ گھنٹوں ادھر آ کر چہل قدمی کیا کرتی تھی۔ لیموں، آم، امرود اور انار کے درخت باؤنڈری وال کی زیبائش کو بڑھا دیتے تھے۔ اور سب سے بڑھ کر کاسنی پھولوں کی بیل سے۔ ڈھکا گیٹ سب کو اٹریکٹ کرتا تھا۔

"وہ لاؤنج سے نکل کر لان میں آ گئی۔ گھاس سوکھی، بدرنگ اور بے ترتیب ہو رہی تھی۔ پھولوں میں ذرا بھی تازگی نظر نہ آتی تھی۔ آموں کا موسم تقریباً گزر گیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے امرود پتوں میں لپٹے جھانک رہے تھے۔ دل ابھی موسم کی کاٹ دار ہواؤں کی زد میں تھا۔ وہ کمرے میں آ کر خواہ مخواہ رو دی۔ جن سے خون کے ہی نہیں دل کے بھی رشتے جڑے

ہوں۔ ان کی بیگانگی پر یونہی دل رویا کرتے ہیں۔

ان ہی تلخ دنوں میں اس کا رزلٹ ہوا کا خوشگوار جھونکا بن کر آیا۔ اس کا اے گریڈ آیا تھا فرسٹ ڈویژن میں۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ دوڑی دوڑی تایا جی کے پورشن میں آئی۔ تائی جی بیٹھی تھیں۔ اس کے قدم ڈگمگا گئے۔

"تائی جی! میرا رزلٹ آ گیا ہے۔ فرسٹ ڈویژن آئی ہے۔" ان کی سرد نگاہوں کے باوجود اس کے ناتواں دل نے حوصلہ کر ہی لیا۔

"مبارک ہو۔ فرحین اور راحین بازار گئی ہیں۔" ٹکا اس کے سر پر مار کر وہ فون کی بجتی بیل کی طرف متوجہ ہو گئیں تو وہ مردہ قدموں سے واپس آ گئی۔



روکھی پھیکی شادی گزر گئی۔ اب اس نے تایا جی کی فیملی کے سرد رویے سے دل برداشتہ ہونا چھوڑا تو نہیں البتہ کم کر دیا تھا کیونکہ ایک دفعہ اسے اس طرح روتے دانیال نے دیکھ لیا تھا اور وہ کئی دن تک اس کا مذاق اڑاتا رہا تھا۔

شادی کے بعد بھی رویوں پر جمی سرد برف کی تہہ نہ پگھل سکی۔ وہ فرحین کو عاطف کے ساتھ سجے سنورے روپ میں ٹیرس پر کھڑے آتے جاتے دیکھا کرتی۔ ڈیڈی نے اسے ایڈمیشن فارم لا دیے تھے۔

"امی! فون کی بیل بج رہی ہے، دیکھیں ذرا۔" وہ شریفاں کے سر پر سوار ہو کر کچن صاف کروا رہی تھی۔ ساری الماریوں میں سے برتن نکال کر دھلوائے تھے اور اب وہ اسٹول پر چڑھی کیبنٹ اندر سے صاف کر رہی تھی جب فون کی مسلسل بجتی بیل پر اس نے امی کو آواز دی۔

"بیگم صاحب جی میری خیال میں نماز پڑھ رہی ہیں۔" شریفاں بولی تو اسے خود اسٹول سے اتر کر فون سننے جانا پڑا۔

"ہیلو!" دوسری طرف مانوس سا سکوت تھا۔ اس کا دل غیر معمولی انداز میں دھڑکا۔

"ہیلو!" اس نے ذرا محتاط انداز میں کہا۔

"درشہوار!" وہی تھیں، اس نے ایک گہرا سانس لیا۔

"اتنا گہرا سانس۔ خیریت؟" دھیمی سی ہنسی۔ وہ چپ رہی۔

"پہچانا، میں کون ہوں۔" لہجہ کھلکھلاتا ہوا سا تھا۔

"جی!"

"تھینک یو! اٹس مائی پلیژر۔ اتنے لمبے گیپ کے لیے معذرت۔ میں کچھ بزی تھی البتہ بھولی بالکل نہیں تھی اور کیسی ہیں پگلی جیسی۔ خوبصورت معصوم۔" خود ہی سوال خود جواب وہ بھی مسحور کر دینے والے۔

"مبارک ہو بہت بہت اور دیر سے مبارک باد دینے پر معذرت بھی۔ اور آپ گفٹ due (ادھار) ہے۔ انشاءاللہ۔ بہت جلد دوں گی سرپرائز کے ساتھ ایسا گفٹ جس ہر کوئی آرزو کرے۔"

"مبارک باد کس بات کی؟" وہ جھجک کر بولی۔

"ایگزام میں ایکسیلینٹ پرفارمنس شو کرنے پر۔"

"تھینک یو۔"

"یو ویلکم۔ مگر اب میں مبارک باد آپ کے پاس آ کر دوں گی۔ بہت جلد پاس۔" اسے گھبراہٹ سی ہونے لگی۔

"میں۔ وہ امی بلا رہی ہیں۔"

"کس کا فون ہے ورشہوار!" امی ایک دم اس کے پاس آ کر بولیں تو ریسیور کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس نے ریسیور کریڈل پر ذرا سا ہٹا کر رکھ دیا۔

"وہ امی!" اس نے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ "میری دوست کا۔"

"تو اسے کیوں بند کر دیا؟" امی کا لہجہ ہی نہیں نظریں بھی مشکوک تھیں۔ انہوں نے آگے بڑھ کر ریسیور ٹھیک طرح رکھ دیا۔ اس نے کچھ پریشانی سے ماں کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"میں کام کر رہی تھی، اس لیے آپ کے بلانے کا بہانہ بنا کر بند کر دیا۔" اسی وقت فون کی بیل بجنے لگی۔ وہ کترا کر کچن کی طرف جانے لگی۔

"فون سنو۔ کس کا ہے۔" امی کچھ بے نیازی دکھاتے ہوئے صوفے پر بیٹھ کر بولیں جو اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"امی کو مجھ پر شک ہو گیا ہے۔ ان کی نظریں کس قدر عجیب سی تھیں۔ اب

انہیں کیا بتاؤں۔ بتانے کو کچھ بھی نہیں۔" وہ جھاڑن اٹھائے گم صم کھڑی سوچ رہی تھی۔

"آخر میں انہیں منع کیوں نہیں کر دیتی کہ مجھے فون نہ کیا کریں نہ جان نہ پہچان۔ فضول میں میرا دماغ خراب کر دیا ہے۔ پتا نہیں ان کی آواز سن کر میں سحر زدہ کیوں ہو جاتی ہوں۔ کچھ بول ہی نہیں پاتی جیسے کوئی مجھے باندھ دیتا ہے۔ میرے اعصاب کو، میری زبان کو۔ نہ جانے وہ کیا جادو پھونک دیتی ہیں مجھ پر۔ اگر امی نے کچھ ایسا ویسا سوچ لیا تو۔" وہ کچن کی کھڑکی سے امی کے چہرے سے عیاں سوچ کی لکیروں کو بخوبی پڑھ سکتی تھی۔



اس کی کلاسز اسٹارٹ ہونے میں ابھی کچھ دن تھے۔ جب تائی جی کی طرف سے نیا شوشہ اٹھا۔ وہ لوگ ادھر سے شفٹ ہو رہے تھے۔ یہ سن کر سارے اپنی جگہ جیسے سن ہو کر رہ گئے۔ ایسا تو کسی نے بھی نہ سوچا تھا۔ شروع سے اکٹھے رہنے کی عادت جو ہو چکی تھی۔

"اگر تم گھر کی قیمت دے سکو تو خرید لو۔ نہیں تو میں کسی پراپرٹی ڈیلر سے کہہ کر اسے فروخت کر دیتا ہوں۔"

ڈیڈی سے بات کرتے ہوئے تایا جی کا لہجہ ان کے رویے سے بھی زیادہ سرد تھا۔ انہوں نے دادو کے زرد پڑتے چہرے کی طرف یا تو قصداً دیکھا ہی نہیں یا انہیں اس بات کی پروا ہی نہیں تھی۔ سارے ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ آفاق بھائی اور علینہ آپی نے اپنی نئی تصاویر بھیجی تھیں۔ جنہیں دیکھتے ہوئے سب تبصرہ کر رہے تھے اور دادو تو ابھی آئی تھیں گھنٹہ بھر پہلے اور تائی جی نے تو ساتھ آنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ امی کے ہاتھ سے تصویریں پھسل پھسل کر ان کی گود میں گر رہی تھیں۔ لاؤنج میں مکمل خاموشی تھی۔ تایا جی بہت جلدی سے ڈیڈی کے جواب کے منتظر تھے۔

"میں کل شام تک سوچ کر جواب دوں گا۔" ڈیڈی بھی ان کے بھائی تھے۔ انہوں نے بھی اتنے اجنبی لہجے میں کہا کہ اب تایا جی کو اٹھ کر چلے جانا چاہیے اور وہ واقعی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"اماں جی! ڈیفنس میں کوٹھی لی ہے ہم نے۔ ایک دو روز میں ادھر شفٹ ہو جائیں گے۔ آپ نے چلنا ہو تو ہمارے ساتھ چلیے گا۔ چلتا ہوں میں۔" کہتے ہوئے وہ بے رخی سے لاؤنج سے نکل گئے۔

"دماغ خراب کر دیا ہے اس کا بیوی نے۔ اسی کی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ اسی کے کانوں سے سنتا ہے۔ بڑے ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ عقل بھی بڑی ہو جائے۔ پچھتائے گا ایک دن۔" دادو کانپ کانپ کر کہہ رہی تھیں۔ "باپ کے ہاتھوں کا بنا سائبان ٹھکرا کر جا رہا ہے۔ ایک دن منہ کی کھا کر آئے گا واپس۔ مجھے لنا دو کمرے میں لے جا کر۔" امی اور ڈیڈی انہیں سہارا دے کر کمرے میں لے گئے۔

پھر ڈیڈی نے دادو کے مشورہ سے تایا جی کے گھر کی پے منٹ کر دی صرف تین دن میں۔ چوتھے دن تایا جی کے پورشن کا سارا سامان ٹرک پر لد کر ڈیفنس چلا گیا۔ تائی جی کھڑے کھڑے ملنے آئیں۔ نروٹھے پن سے خدا حافظ کہہ کر ٹھیک ٹھیک کرتی باہر نکل گئیں وہ سب سے اس قدر خفا کیوں تھیں۔ درشہوار کو ان کا رویہ بہت تکلیف دے رہا تھا۔ راحین رو رہی تھی۔ سوں سوں کرتی سرخ ناک کے ساتھ وہ سب سے گلے مل کر رو رہی تھی۔ تائی جی کی کرخت پکار پر بھی اس نے الوداعی سین کو مختصر کرنے کی کوشش نہیں کی۔

"دری! پتا نہیں کیا ہو گیا ہے امی کو۔ ڈیڈی کو۔ سب کو۔ مجھے سب بہت یاد آئیں گے۔ دری! مجھ سے ملنے آؤ گی۔ مجھے فون کرو گی۔ فون نمبر تو میں نے تمہیں دے دیا ہے نا؟"
وہ اس سے لپٹی روئے جا رہی تھی۔

"بائی داوے۔ تم دونوں میں سے رخصتی کس کی ہو رہی ہے۔" دانیال نے پوچھا۔
"تمہاری۔" درشہوار لال چہرہ لے کر اس کی طرف پلٹی۔
"پھر تو مجھ سے لپٹ کر روؤ۔ آپس میں کیوں رو رہی ہو۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔
"وہ تو تمہاری بیوی روئے گی اپنے نصیبوں کو۔ جب تمہارے پلے بندھے گی۔"
درشہوار کو پہلے ہی غصہ آ رہا تھا۔ وہ دانیال سے الجھ پڑی۔
"کیا پتا، وہ اب بھی رو رہی ہو بیٹھی۔" وہ ذومعنی انداز میں بولا تو راحین بھڑک اٹھی۔

"ذرا سمجھا لو اس کو۔ اس وقت میرے منہ نہ لگے۔ میرا دماغ بہت خراب ہو رہا ہے۔ اس وقت۔ جا رہی ہوں میں۔ خدا حافظ۔" وہ غصے میں تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔
"تمہیں کیا تکلیف تھی جو خواہ مخواہ اسے اس طرح ناراض کر دیا۔ پتا نہیں اب کب آئے وہ۔" درشہوار صوفے پر گر کر از سر نو رونے لگی۔

"دیکھنا تو خود آئے گی اسی طرح سوں سوں کرتی۔ اساں تیری گل کرنی۔ گل کرنی ے ڈیڈی نال، اساں تیری گل کرنی......" وہ گنگناتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔
"رولو جی بھر کے، سارے ڈیم سوکھے پڑے ہیں۔ راوی میں آج کل بچے کرکٹ کھیلتے ہیں۔ شاید تمہارے اشکوں سے اس میں کچھ جولانی آ جائے۔" وہ جاتے جاتے رک کر بولا۔ تو اسے اس نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

اس پر خاموشی اور اداسی کے لمبے لمبے دورے پڑنے لگے۔ امی بھی چپ چپ سی رہنے لگیں۔ گھر میں جیسے کوئی ہوتا ہی نہیں تھا۔



پھر اس کی کلاسز اسٹارٹ ہو گئیں۔ صبح کو ڈیڈی اسے ڈراپ کر جاتے۔ واپسی پر دانیال پک کر لیتا۔ مصروفیت ملی تو دل جیسے ٹھہر سا گیا۔ یونیورسٹی میں ان کے ساتھ صرف ثنا تھی۔ یہ بھی شکر تھا ورنہ نئی فرینڈز بنانے میں بھی وقت لگ جاتا ہے اور اس کا دل تو پہلے ہی تنہائی اور اکلاپے کے دکھ جھیل رہا تھا۔

اس روز ثنا کے ساتھ گیٹ سے نکل کر دانیال کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ ثنا کو پوائنٹ تک چھوڑنے ہی آئی تھی کہ سلور گرے کار ان سے ذرا فاصلے پر آ کر رکی تھی۔ اس میں سے ایک لڑکا باہر نکلا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا شخص بھی اگلے لمحے باہر آ گیا۔

"اوہ یہ تو وہی یوسف جاہ۔ شیری کا بھائی۔" اس کا دل بے ساختہ چونکا۔ لائٹ براؤن شرٹ اور ڈارک پینٹ میں ملبوس جیسے وہ ایک ہی پل میں سارے منظر پر چھا گیا۔ سب کچھ جیسے مٹ گیا بس وہی وہ تھا۔

"دری! اس شخص کو دیکھو۔ کیا پرسنالٹی ہے۔ ہاؤ ڈیشنگ۔ دری! کیا مرد بھی اتنے خوبصورت ہوتے ہیں۔"

ثنا مدھم آواز میں اس سے کہہ رہی تھی اور وہ جواب میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ اگلے پل وہ گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی آہستہ آہستہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئی مگر اس کی شبیہ جیسے آنکھ کے پردے پر نقش ہو کر رہ گئی۔

"میرا پوائنٹ آ گیا۔ میں چلتی ہوں" ثنا ہاتھ ہلاتے ہوئے پوائنٹ کی طرف بڑھ گئی۔

وہ بوجھل دل اور دماغ کے ساتھ جیسے ہی گھر میں داخل ہوئی۔ امی کو اپنا منتظر پایا۔

"او و دری! جلدی سے چینج کر کے آ جاؤ۔ میں نے تمہارے کپڑے نکال دیے ہیں۔ وہی پہننا۔ ڈرائنگ روم میں کچھ مہمان آئے ہیں۔ ان سے مل لو آ کر۔" وہ اس وقت کسی سے بھی ملنا نہیں چاہتی تھی مگر بحث کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ امی نے کون سا مان جانا تھا۔ وہ بے دلی سے تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں آ گئی کہ سلام کر کے دو چار منٹ بیٹھے گی اور واپس دوڑ لگا دے گی۔ اس کے سلام پر دونوں خواتین نے پلٹ کر دیکھا تو وہ جیسے شاک میں رہ گئی۔ فون والی شیریں صاحبہ اپنے پروقار سراپے کے ساتھ پرشوق نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ سلام کر کے بیٹھ گئی تو بلقیس آنٹی اس سے پڑھائی کے متعلق پوچھنے لگیں۔

"جاؤ بیٹا! شریفاں چائے نہیں لائی۔" حالانکہ امی نے اسے چائے لانے کو کہا تھا مگر وہ ضد میں اسی طرح چلی آئی تھی۔ اب ان کے کہنے پر شرمندہ ہو کر باہر نکل آئی۔ شریفاں سے چائے کا کہہ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

شام کو دوسری شاکنگ نیوز موجود تھی۔ تائی اور تایا جی مہران بھائی کی شادی کا کارڈ لے کر آئے تھے۔ صرف ایک ہفتے بعد شادی تھی۔ ان دونوں کا رویہ ابھی بھی ویسا ہی تھا روکھا روکھا۔

"تائی! راحی کو بھی لے آتیں۔" وہ پھر بھی ڈھیٹ بن کر پوچھ بیٹھی۔

"بازار گئی ہوئی تھی وہ فری کے ساتھ۔" انہوں نے بادل نخواستہ جواب دیا تو امی نے اسے گھور کر دیکھا۔ وہ اٹھ کر کمرے میں آ گئی۔

پھر کیا ہوا، اسے نہیں پتا چل سکا۔ امی نے ڈیڈی کو کیسے رام کیا۔ اسے نہیں معلوم۔ ہاں اس سے انہوں نے سرسری لہجے میں ذکر کیا۔

"تمہارے ڈیڈی اور میرا فیصلہ ہے کہ وہ جو اس دن خاتون آئی تھیں جس روز تم یونیورسٹی سے آئی تھیں۔" امی اٹک اٹک کر بول رہی تھیں۔ "ان کا بھائی ہے یوسف جاہ۔ ہم نے اس کے لیے ہاں کر دی ہے۔ یہ تصویر ہے لڑکے کی۔ اسٹیٹ بینک میں بڑی اچھی پوسٹ پر فائز ہے۔ بس یہی ایک بہن ہے۔ بھانجی اور ماں۔ زیادہ لوگ نہیں ہیں۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔" وہ تصویر اس کے تکیے کے پاس رکھ کر کھڑی ہو گئیں جیسے اس رات کے کھانے کا مینو پوچھنے آئی تھیں۔

"مگر امی!" اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ "یہ سب کیسے امی! ابھی مجھے ایم ایس سی کرنا ہے۔"

"بعد میں کر لینا۔" وہ اپنے مطمئن لہجے میں بولیں۔ جیسے اسے پانی پینے جانا ہو، آ کر پی لینا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔

"اور ہاں، شادی ان لوگوں کو جلد چاہیے۔ ایک دو ماہ میں۔ تم خود کو ذہنی طور پر تیار رکھو۔" عجیب سا انداز تھا ان کا جیسے وہ ان پر کوئی بہت بڑا بوجھ ہو۔

"امی! فار گاڈ سیک۔ یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں کیا آپ پر کوئی بوجھ ہوں جو آپ مجھے یوں اتار پھینکنا چاہتی ہیں۔ وہ کون لوگ ہیں۔ کیسے ہیں، مجھے کچھ بھی نہیں معلوم اور آپ مجھے یوں اس طرح اتنی جلدی...... نہیں...... نہیں۔ امی پلیز۔ مجھے یہ سب بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔ آپ ڈیڈی سے کہیں پلیز۔" وہ ان سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"شہوار! بیٹا کیا ہو گیا ہے تمہیں، یہ سب تو ایک دن ہونا ہی ہوتا ہے۔ سب بیٹیوں کے ساتھ اور اچھی بیٹیاں والدین کا مان رکھتی ہیں اور تم تو میری اولاد میں سے سب سے زیادہ فرمانبردار ہو، باقی رہی وہ کیسے لوگ ہیں۔" وہ اس کے بال سہلاتے ہوئے اسے بیڈ تک لے آئیں۔ "اچھے لوگ ہیں۔ سب سے بڑھ کر چاہت والے، قدردان ہیں۔ تمہارے ڈیڈی نے تمام معلومات کرائی ہیں۔ لڑکا بہت اچھا ہے۔ نیک، شریف، سمجھدار اور ترقی کرنے والا۔ چھوٹی سی فیملی ہے۔ والدہ کچھ بیمار رہتی ہیں۔ ان کی دیکھ بھال کے لیے کل وقتی ملازمہ موجود ہے۔ پھر شیریں خود ماں کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ تیسری شیریں کی بیٹی دیبا ہے۔ اے لیول میں پڑھتی ہے۔ کل چار افراد ہیں گھر کے۔ بہت لوگوں کا ہجوم نہیں ہے۔ تم خوش رہو گی۔ مجھے معلوم ہے۔ شیریں بہت عرصے سے بلقیس کے ذریعے میرے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ مجھے ہاں کرتے ہی بنی۔ آج نہیں تو کل۔ کل نہیں تو سال بعد، دو سال بعد بھی تو کرنا ہی ہے نا تمہارا۔ تو کیوں نہ ان لوگوں کے حوالے میں اپنی بچی کو کروں جو اس کی چاہت کریں۔ ٹھیک ہے نا بیٹا۔" وہ ابھی بھی ان سے لپٹی بیٹھی تھی۔ کچھ نہ بولی۔

"اب تم کچھ فکر نہ کرو۔ انشاء اللہ سب بہت اچھا ہو گا۔ ادھر ان کے گھر میں کون سے بہت سے لوگ ہیں۔ تم پڑھتی رہنا۔ شیریں کالج میں پڑھاتی ہے آج کل ماں کی بیماری کی وجہ سے ایک سال کی چھٹی لی ہوئی ہے۔ کہہ رہی تھی۔ ہو سکتا ہے ریٹائرمنٹ ہی لے لوں۔

تمہیں اس کی اچھی کمپنی مل جائے گی۔ اب سب فکریں چھوڑ دو رابی چپی۔ خوش خوش میری بچی اچھی لگتی ہے۔'' امی نے اسے گدگدانا چاہا۔ وہ آنکھیں صاف کرتی ہوئی تھوڑا کھسک گئی۔

''ٹھیک ہے نا۔ اب تو کوئی اعتراض نہیں۔'' امی نے ذرا جھک کر اس کا سرخ چہرہ دیکھا، وہ پھر بھی چپ رہی۔ ہاں یا نہ کچھ بھی تو نہیں کہہ سکتی تھی۔ ماں باپ اولاد کی فرمانبرداری کو اس طرح بھی بلیک میل کرتے ہیں۔ اس کی فرمانبرداری نے اس کی زبان پر قفل ڈال دیے۔



مہران بھائی کی شادی بہت شاندار طریقے سے ہوئی تھی۔ شازہ واقعی تائی جی کے لیے لکی ثابت ہوئی تھی۔ ان کا گھر گیٹ سے لے کر پائیں باغ تک اور پچھلے لان تک سامان سے بھر گیا تھا۔ بلکہ یہ بھی سنا گیا کہ یہ کوٹھی بھی شازہ کی ہے مگر اب ان لوگوں کو اس سے کوئی مطلب نہیں رہا تھا۔ وہ مہمانوں کی طرح شادی میں شریک ہوئے تھے۔

مہران بھائی کی شادی کے ایک ہفتے بعد ہی اس کی ڈیٹ فکس کر دی گئی۔ اس کے احتجاج کے باوجود۔ اس کی شادی کی تیاریاں تو اندر ہی اندر امی ایک عرصے سے کر رہی تھیں اور پچھلے ایک ماہ میں انہوں نے سب کچھ مکمل کر لیا تھی۔ آپی اور آفاق بھائی بھی مایوں والے روز پہنچ گئے تو جیسے خوشی کا رنگ چمک اٹھا۔ ان ہی دنوں ڈیڈی کے ہاسپٹل کا افتتاح تھا۔ ڈیڈی کے سر سے بھی مصروفیت کا بوجھ کچھ کم ہو گیا تھا۔ اب وہ شادی میں بھرپور دلچسپی لے رہے تھے۔

راحین تائی کے خراب موڈ کی پروا کیے بغیر مایوں والے دن سے ہی مستقل ان کے گھر رکی ہوئی تھی۔

''راحی! شازہ بھابھی کی سناؤ۔ کیسی ہیں؟'' پیلے جوڑے میں اس کی معصومیت اور نکھر آئی تھی۔ راحی کی تو نظریں اس پر نہیں ٹک رہی تھیں۔

''پتا نہیں یار! وہ گھر میں ٹکتی ہی نہیں۔ اصل میں۔'' وہ رک گئی۔ ''بھئی وہ اور طرح کے لوگ ہیں سوشل اور کمرشل وغیرہ۔ گھر کی چار دیواریں انہیں اپنی آزادی میں رکاوٹ لگتی ہیں، ویسے آج کل میں بھائی اور وہ سوئٹزر لینڈ جانے کی تیاریاں کر رہے ہیں ہنی مون کے سلسلے میں۔'' راحین اپنے کپڑے استری کرنے لگی۔

''ابھی شادی کو بیس دن ہوئے ہیں۔ دیکھو، آگے کیا ہوتا ہے۔'' وہ بہت کچھ کہتے کہتے رک گئی، یہ در شہوار کو محسوس ہوا۔

اس کے بعد راحین سے اس موضوع پر بات کرنے کا موقع اسے نہ مل سکا۔ گھر مہمانوں سے بھر گیا تھا۔ امی نے دور نزدیک کے سب رشتہ داروں کو بصد اصرار بلایا تھا۔ تایا جی اور تائی جی بھی خلاف توقع مہندی والے دن دوپہر ہی کو آ گئے۔ ''شاید راحین ادھر ہے اس لیے۔'' اس نے سوچا۔ فرحین کو شام کو آنا تھا۔ مہندی کا فنکشن بہت اچھے طریقے سے ہو گیا۔

بارات کا انتظار چونکہ ہوٹل میں تھا۔ اس لیے سب ذمہ داریوں سے آزاد خوش باش پھر رہے تھے۔

''اللہ دری! تم تو اس زمین کی لگ ہی نہیں رہیں۔ یوسف جاہ کا کیا بنے گا۔'' وہ پارلر سے تیار ہو کر آئی تو راحین اسے دیکھتے ہی حیرت سے بے ساختہ بولی تو سیما اور علینہ ہنس پڑیں۔

''راحی بہت بڑی نہیں ہو گئی علینہ۔ اب اس کا بھی سوچنا پڑے گا۔'' سیما راحین کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''ہم آئے ہوئے ہیں۔ اب یہاں صرف دو ہی ان میرڈ رہ گئے ہیں کیا خیال ہے انہیں بھی نہ نپٹا جائیں۔'' علینہ بھی ہنسی۔

''ہماری آزادی آپ سے برداشت نہیں ہو رہی تو جائیں، امی آپ کو بلا رہی ہیں کب سے۔'' دانیال اچانک اندر آ کر دونوں سے بولا تو سیما نے ایک دھپ اس کی کمر پر لگائی۔

''اب تمہاری آزادی بھی ختم کر کے جائیں گے میاں! فکر نہ کرو۔'' وہ کہتی ہوئی باہر نکل گئیں۔ راحین بھی ہولے سے ان کے پیچھے ہو لی۔

سب کی تعریفوں کے باوجود نہ جانے اس کا دل کیوں بجھا جا رہا تھا جوں جوں نکاح کا وقت قریب آ رہا تھا۔ اس کی حالت اندر ہی اندر غیر ہوتی جا رہی تھی۔

''چشم بددور۔ امی جان! اتنا خوبصورت ہینڈسم دولہا آپ نے کہاں سے لیا ہے۔'' یوسف جاہ کو دیکھتے ہی سیما امی کا کندھا پکڑ کر بولی۔

''بے وقوف، ماشاء اللہ کہو۔'' امی اسٹیج کی طرف بڑھیں جہاں دولہا کو بٹھایا جا رہا

تھا۔ یوسف جاہ کو دیکھ کر تائی جی بھی چپ سی رہ گئیں اور سب کے سوالوں کا، نگاہوں کا جواب دینے کے لیے سراپا اخلاق شیریں تو موجود رہی تھیں۔

"لڑکے کی بہن بہت تیز ہے۔ اپنی درشہوار تو بہت معصوم ہے۔" شیریں کی طراری کو دیکھ کر تائی جی کو یک گونہ اطمینان محسوس ہوا۔ نکاح کے لیے آفاق بھائی اور دانیال اس سے سائن کروانے اندر آئے تو اس کا دل اس بے طرح سے گھبرا کہ انہیں اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

"در پیاری! حوصلہ۔ کیا ہو گیا ہے۔" علینہ بھابھی اس کے ساتھ بیٹھی اسے دلاسا دے رہی تھیں۔ اس نے یخ ہاتھوں اور کانپتی انگلیوں کے ساتھ سائن کر دیے۔

نکاح کے بعد کھانا تھا جس کے بعد دولہا، دلہن کو اسٹیج پر اکٹھے بٹھایا گیا۔ مووی کیمروں کی لائٹس میں دونوں چاند اور سورج کی جوڑی لگ رہے تھے۔ امی دور سے بلائیں لیتی نہ تھک رہی تھیں، بار بار آنکھوں کے نم گوشے بھی صاف کرتی جاتیں۔

"بس بھئی۔ اب جلدی کریں، خاصا ٹائم ہو گیا ہے۔ ہمیں اب اجازت دیں۔"

شیریں جو مستقل یوسف جاہ کے بائیں پہلو میں براجمان تھیں۔ اٹھتے ہوئے بولیں، درشہوار نے نیچی نظروں سے ان کو دیکھنے کی کوشش کی۔

رخصتی ہوتے ہوتے گھنٹہ لگ گیا۔ وہ گھر والوں سے مل کر اس بری طرح سے رو رہی تھی کہ کسی کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔

"سارے امیک اپ کا ستیاناس کر دیا۔ امی! اس دری کی بچی نے۔ دس ہزار آنسوؤں میں بہا دیے۔" آپی اس کے بے تحاشا رونے پر غصے سے بولیں۔

"در! کیا بات ہے۔ آپ کسی غیر کے ساتھ تو نہیں جا رہیں۔ ہم ہیں آپ کے اپنے۔ آپ اپنے گھر میں جا رہی ہیں۔" شہد جیسا میٹھا لہجہ اس کے بہت قریب سے بولا تو وہ کچھ ٹھٹک سی گئی۔ اس نے اپنی سسکیوں پر قابو پایا۔ شیریں نے اسے سہارا دے کر گاڑی میں بٹھا دیا۔

"بس بھئی اب مزید کوئی نہ ملے۔ پہلے ہی بچی رو رو کر ہلکان ہو گئی ہے۔ خوشی خوشی اسے اپنے گھر میں رخصت کریں۔" شیریں نے سب سے مڑ کر کہا اور خدا حافظ کہ کر درشہوار کے ساتھ آ بیٹھیں۔ چند لمحوں بعد ہی گاڑی دھیرے دھیرے چل پڑی تو اس نے گردن مزید

جھکا لی۔

"اف ممّا! میں تو بہت تھک گئی ہوں۔ بہت بورنگ ہوتی ہیں ہماری یہ شادی کی رسمیں بھی۔" ہیلا درشہوار کے دوسری طرف بیٹھی تھی گاڑی چلتے ہی بولی۔

"ہاں، مجھے خود بہت تھکن ہو گئی ہے۔ ابھی ولیمہ رہتا ہے۔" شیریں بھی بولیں۔

گاڑی اب خاصی رفتار سے چل رہی تھی۔

"ارے ٹھہرو، ٹھہرو۔" شیریں کو یک دم کچھ یاد آ گیا۔

"کیا ہوا آپی جی! خیریت۔" فرنٹ سیٹ سے شاید یوسف جاہ کی آواز تھی۔

"بھئی، نہر کی طرف سے جانا ہے۔ نہر میں دونوں تعویذ بہانے ہیں اور درشہوار کو اتر کر نہر کے پانی میں اپنا اور تمہارا عکس دیکھنا ہے۔ بابا جی نے کہا تھا۔" شیریں کی عجیب سی بات پر دھک سے رہ گئی۔

"آپی جی! نہر والا روٹ تو کافی ویران ہوتا ہے۔ آپ یہ کام کسی اور......"

"یوسف جاہ!" ان کی کڑک اس قدر زوردار تھی کہ درشہوار کی جان نکل گئی۔

"سوری آپی جی! مگر آپ خود سوچیں۔" لہجہ بے حد گھگھیایا ہوا تھا۔

"شٹ اپ یوسف! آئی سے شٹ اپ۔ ڈرائیور! گاڑی نہر کی طرف موڑو۔" ان کے تحکمانہ انداز کے بعد کسی کی جرأت نہ ہوئی چوں کرنے کی۔

"اوکے ممّا! میں تو پھر سونے لگی ہوں۔ اگر آپ کا یہ پروگرام تھا تو میں کسی اور گاڑی سے چلی جاتی۔ پہلے ہی تھکن سے برا حال ہے۔"

ہیلا پوری طرح سے پھیل کر سیٹ پر نیم دراز ہو گئی کہ درشہوار دونوں کے درمیان پھنس کر رہ گئی۔ شیریں پہلے ہی خاصی آرام دہ پوزیشن میں بیٹھی تھیں۔

نہر کا رستہ ویران بھی تھا اور سرد ترین تھا۔ رات کے ڈھائی بجے اس رستے پر کس پاگل کو ہونا تھا اور جب دو بج کر پچاس منٹ پر درشہوار اور یوسف کو شیریں کی تقلید میں گاڑی سے اتر کر نہر کا رخ کرنا پڑا تو حقیقی معنوں میں خدا یاد آ گیا۔ نہر کے پانی کا ہلکا ہلکا شور اور ہر طرف چھائی رات کے تیسرے پہر کی ویرانی۔ درشہوار کے جسم میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ لہنگے کے ساتھ چلنا دوبھر ہو رہا تھا۔ نہر کے کنارے رستہ اونچا نیچا تھا۔ اونچی نازک ہیل کے ساتھ وہ بس گر جانے کو تھی۔ شیریں نے اس کا بازو اس مضبوطی سے پکڑا کہ اس کی آہنی انگلیاں درشہوار

کے بازو میں کھب کر رہ گئیں۔

چاند کی شاید آخری تاریخیں تھیں۔ تنہا چاند نہر کے پانیوں میں ہلکورے کھا رہا تھا نہر کے پانی میں اس نے یوسف کا عکس تو کیا دیکھنا تھا وہ نہر میں ہی گرنے کو تھی اگر یوسف اسے جھپٹ کر تھام نہ لیتے۔ دو دن سے اس کا کھانا پینا برائے نام تھا اور آج شام سے تو اس نے کچھ نہ کھایا تھا چکر تو آنے ہی تھے۔

''سب ڈھکوسلے ہیں۔ عورت کا چلتر پن۔'' پہلو سے ابھری مدھم شیریں کی آواز اتنی زہر میں بجھی تھی کہ درشہوار کا جی چاہا کہ وہ یوسف سے اپنا آپ چھڑا کر نہر میں کود جائے۔ آگے کیا ہونا ہے۔ اسے نہر کے دھیمے سروں میں چلتے پانی پر صاف لکھا نظر آ رہا تھا۔

شیریں نے ہینڈ بیگ میں سے کوئی چیز نکال کر نہر میں پھینکی۔ تعویذ تھے شاید۔ وہ کچھ دیر وہاں خاموش کھڑے رہے۔ اسے سردی لگنا شروع ہو گئی تھی اور اگر کوئی ڈاکو ادھر آ جاتا۔ اس کے تو وارے نیارے ہو جاتے۔ اس وقت کم وبیش سو تولے سونا پہنے کھڑی تھی۔ اس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔

پتا نہیں شیریں بیگم کیا چھو منتر پڑھ رہی تھیں۔ پڑھ کر دونوں کے چہروں پر پھونک ماری۔

''چلو اب شکر ہے۔ سب کام ساتھ خیریت سے ہو گیا۔ صبح اب تم دونوں کو ٹھیک آٹھ بجے بابا جی کے پاس حاضری دینے جانا ہے۔ بس آخری کام۔ اس کے بعد سب خیر ہے۔''

گاڑی میں بیٹھنے تک شیریں کا نیا حکم نامہ اسے نئے سرے سے لرزا گیا۔



وہ پڑھی لکھی ایم اے سیاسیات کس قدر توہم پرست اور مشرک ہیں۔ اس کا اندازہ درشہوار کو بالکل نہیں تھا۔ صبح آٹھ بجے چونکہ انہیں بابا جی کے پاس حاضر ہونا تھا۔ اس لیے شیریں نے صبح سات بجے ہی ان کا دروازہ دھڑ دھڑانا شروع کر دیا۔ رات بھر کا رت جگا اور صبح سویرے کی یہ کرخت دستک۔ اس کا جی چاہا کہ ساری دنیا کو کہیں جھونک کر میٹھی نیند سو جائے۔ مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کی میٹھی نینداب ہمیشہ کے لیے اس سے بچھڑ چکی ہے۔

یوسف بہت اچھے تھے۔ اس کے تصور سے بڑھ کر۔ وہ بظاہر جتنے کم گو دکھتے تھے۔

اتنے تھے نہیں یا شاید سارے مرد شادی کی پہلی رات اس قدر خوش ہوتے ہیں، جتنا کہ یوسف تھا۔ انہوں نے اسے بہت خوبصورت بریسلٹ پہنایا تھا جس میں ڈائمنڈ جڑے تھے۔

دستک کی دہشت ناک آواز پر اس نے مڑ کر بے خبر سوئے یوسف کو دیکھا۔

''میں اٹھ کر کیسے دروازہ کھولوں۔'' وہ سوچ میں پڑ گئی۔

''یوسف!'' وہ ابھی سوچ رہی تھی کہ شیریں کی پاٹ دار آواز پر یوسف جیسے کسی اسپرنگ سے اچھل کر دروازے تک پہنچے۔ اس نے جلدی سے چادر میں منہ گھسیڑ لیا۔

''رات کہا تھا کہ صبح آٹھ بجے بابا جی کے پاس حاضری دینا ہے۔ پھر تم یوں غافل پڑے سو رہے ہو۔'' وہ بے تکلف اندر آتے ہوئے غصے میں چلائیں۔

''سوری آپی جی! بس ابھی آتے ہیں۔ یوسف شاید ان کے قدموں میں جا پڑے تھے۔ اس نے چادر سے جھانکنے کی کوشش کی۔

''مجھے دوبارہ آواز نہ دینی پڑے۔'' وہ وارننگ دیتی ہوئی واپس مڑ گئی۔

آٹھ بجنے میں بیس منٹ تھے جب وہ گاڑی میں بیٹھ کر گھر سے روانہ ہوئے۔ پھر بھی شیریں کے چہرے کے نقوش غصے سے تنے ہوئے تھے۔ دیر ہو جانے کی وجہ سے وہ مسلسل بڑبڑ کر رہی تھیں۔ وہ فرنٹ سیٹ پر یوسف کے ساتھ بیٹھی تھیں، وہ ان کے غصے کے ڈر سے پچھلی سیٹ میں دبک کر بیٹھی ہوئی تھی اور ایک رات میں اس کی کون سی یوسف سے بے تکلفی ہو گئی تھی جو وہ پوچھتی کہ آخر ایسا کون سا اہم شخص ہے۔ جس کی خاطر یوں پہلی رات کی دلہن پر ایمرجنسی نافذ کر دی گئی ہے۔

گاڑی اب شہر سے باہر نکل آئی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک بہت کم تھی، آٹھ بجنے میں پانچ منٹ تھے جب گاڑی شہر سے باہر کسی پسماندہ علاقے کی کچی پکی گلیوں میں ہچکولے کھاتی جا رہی تھی۔

''جلدی کرو۔ آٹھ بجنے والے ہیں، ایک منٹ بھی دیر ہو گئی تو ساری محنت اکارت جائے گی اور بابا جی کی ناراضگی الگ۔'' وہ مسلسل جلدی جلدی کا رٹ لگائے ہوئے تھیں۔ وہ تو سڑکوں پر رش کم تھا، جس کی وجہ سے ان کی یہ رٹ بھی پوری ہو گئی۔

آٹھ بجنے میں ایک منٹ پر وہ اینٹوں گارے سے لپے گھر کے آگے کھڑے تھے۔

لکڑی کا پرانا دروازہ جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا اور باہر گلی سے گزرنے والوں کو صاف دعوت نظارہ

دے رہا تھا۔ شیریں نے بغیر دستک دیے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔ وہ دونوں بھی ان کے پیچھے تھے۔

''آؤ یا کسی پروٹوکول کا انتظار ہے تمہیں؟'' شیریں نے اس کی سست روی پر تنقید کی۔

بہت بڑا کچا صحن تھا۔ دو تین بان کی جھلنگا چارپائیاں تھیں۔ ان پر بچھی بدرنگ چادریں آدھی زمین کو چھو رہی تھیں۔ صحن سے نیچے کی طرف زمین کو سیڑھیاں تھیں جو ایک کچے برآمدے میں ختم ہو رہی تھیں۔ برآمدے میں دس بارہ عورتیں بیٹھی ان کی طرف ہی دیکھ رہی تھیں۔

''باباجی نہیں آئے ابھی؟'' شیریں بڑی بے تکلفی سے ان سے ذرا ہٹ کر زمین پر ہی بیٹھ گئیں۔

''آ گئے ہیں۔ ذرا اندر گئے ہیں۔'' ایک عورت جھٹ سے بولی۔ سب ہی حلیے سے غریب پسماندہ گھروں کی لگتی تھیں۔

''بیٹھ جاؤ نا۔'' شیریں دھیمی آواز میں غرائیں، وہ دونوں ان کے پیچھے سٹ کر بیٹھ گئے۔ اسے تو یوسف پر حیرت تھی جو شیریں کے احکام پر کسی روبوٹ کی طرح عمل کر رہے تھے۔ نیچے بیٹھنے سے ان کے سوٹ کا کیا حال ہوگا انہیں کچھ پروا نہیں تھی۔

کچھ دیر تک عورتیں انہیں دیکھتی رہی پھر اپنی باتوں میں مگن ہو گئیں۔ کسی کا روزگار کا مسئلہ تھا تو کسی کی بیٹیوں کے رشتوں کا۔ کسی پر اس کی ساس، نند یا دیورانی جٹھانی نے بڑا سخت جادو کا وار کر رکھا تھا جس کی وجہ سے وہ اولاد نرینہ سے محروم تھی۔ کوئی بانجھ تھی۔ اب باباجی سے علاج کروا رہی تھی۔ کسی کی زمین کا جھگڑا تھا۔ کسی کے گھر پر کوئی رشتہ دار قابض تھا۔ کوئی اپنی بیماریوں کے ہاتھوں عاجز تھی۔ باباجی کے دم سے فرق پڑا تھا۔ ایک لڑکی تو بالکل معصوم سی تھی۔ سترہ اٹھارہ سال کی۔ اداس و پریشان حلیے میں بیٹھی تھی۔

''اے بچی! تمہارا بھائی سیدھا ہوا باباجی کے تعویذ سے؟''

''ہاں خالہ! اب تو کچھ بہتر ہے۔ مار پیٹ نہیں کرتا، پر بیوی ذرا بھڑکا دے تو پھر ویسا ہی ہو جاتا ہے۔'' وہ رو دینے کو تھی۔

''ایسے بھی عقل کے اندھے ہوتے ہیں۔ بیویاں اندھا کر دیتی ہیں۔ جوان بہن کو

روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتا ہے۔ ظالم انسان۔'' ایک عورت ہاتھوں کو مطلع کر رہی تھیں۔

''اور بانو! تم سناؤ اپنے شوہر کی۔ نشہ چھوڑا اس نے، باباجی نے پچھلی بار تسلی تو بہت دی تھی۔''

''چھوڑ تو دیا ہے باجی! پر جس دن اس کا نشہ ٹوٹتا ہے۔ تو مانو سارا گھر توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ مجھے پیٹ بچوں کو ادھیڑ اور جو پیسہ ہاتھ لگے لے جاتا ہے۔ میں تو آئی ہوں آج باباجی سے کہوں، کوئی پکا عمل کریں۔ یہ ہوائی چیزیں اس کا پیچھا چھوڑ دیں۔ لوگوں کے برتن مانجھ مانجھ کر میرے تو ہاتھ رہ گئے ہیں۔'' وہ بھی رو دینے کو تھی۔

''تمہارا شوہر ایسا قصائی تو میری ساس جلادن۔ پتا نہیں کس جنم کے بدلے لے رہی ہے، بڈھی چڑیل مجھ سے روز بشیر کے کان بھر دیتی ہے۔ وہ تو آگ کا گولہ بن جاتا ہے۔ ہائے ہمارے نصیب۔'' کہتے ہوئے وہ در شہوار کو تنقید بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''باباجی تو ہم جیسوں کے سروں پر خدا کا سایہ ہیں۔ یہ نہ ہوتے تو ظالم خدائی ہم کو نگل ہی جاتی۔''

ایک ادھیڑ عمر عورت بولی۔

''ہاں باجی! باباجی تو اللہ کے بھیجے ہوئے نیک اور خاص بندے ہیں نہ اترتا ان کا وجود ہم گناہگاروں میں تو ہمارا کیا بنتا۔'' وہ حیرت سے ان کی باتیں سن رہی تھی، شیریں بھی ان کی باتوں پر عقیدت سے سر ہلا رہی تھیں۔

''باباجی آ گئے'' مجمع میں حرکت ہوئی۔ شیریں اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

''باباجی سلام!'' ساٹھ پینسٹھ کے درمیان باریش تومند شخص جس کا پکا سانولا رنگ تھا، سفید چغہ جو شاید پہن پہن کر پیلا پڑ چکا تھا اور آنکھیں اندر کو دھنسی تھیں۔ شیریں نے باباجی کے ہاتھوں کو چوم کر آنکھوں سے اور ماتھے سے لگایا۔

''جیتی رہو، برکت پاؤ عمر میں بھی رزق میں بھی۔'' وہ ان کے سر اور چہرے پر ہات پھیر کر بولے۔

''باباجی! یہ آپ کی نئی عقیدت مند یوسف جاہ کی بیوی۔ باباجی! سارا عمل کر لیا ہے۔ یہ سب آپ کی دعاؤں، آپ کی محنت کا نتیجہ ہے ورنہ اس کے ماں باپ تو پروں پر پانی نہیں پڑنے دیتے تھے۔ ہر بار منہ توڑ کر انکار کر رہے تھے۔ آپ کی محنت رنگ لگائی۔ موم کی طرح

چکے ہیں اب تو۔ اب میں جلدی یوسف کا یوسف جیسا بچہ دیکھوں۔ یہی تمنا لے کر آئی ہوں اور آپ سے مانگ کر میں کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹی، یہ مجھے معلوم ہے۔" شیریں کا اس درجہ اندھا اعتقاد ورشہوار کو جلا گیا۔

"ان کلمات کا حقدار تو خدا ہے جو سب کو دیتا ہے۔" وہ سر اٹھا کر اس بزرگ کو دیکھنے لگی۔

بابا جی سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھے اور ورشہوار کے ماتھے پر اپنے دائیں ہاتھ کی پہلی دونوں انگلیاں دبا کر رکھ دیں اور منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگے۔ دو تین منٹ کچھ پڑھنے کے بعد انہوں نے آنکھیں کھولیں اور پھر ایک زوردار پھونک ماری جس میں لعاب کی پھوار بھی شامل تھی اور بدبو کا بھبھوکا بھی۔ ورشہوار لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گئی۔

"کام یہ بھی مشکل ہے بچے۔ مسلسل تین مہینے ہر جمعرات کو آنا ہوگا آسانی ہوگی۔ یہ بچہ ہے۔" وہ یوسف جاہ کی طرف متوجہ ہوئے اور ایک پھونک ان کے منہ پر بھی ماری۔

"نقش لکھ دیتا ہوں۔ صبح و شام پانی میں ڈال کر پیو، جلد خوشخبری سنو گی۔" وہ دوبارہ اندر کمرے کی طرف بڑھے اور چند منٹوں بعد تین کاغذ کے تہہ شدہ ٹکڑے لا کر شیریں کے کھلے ہاتھوں میں رکھ دیے۔

"بڑی مہربانی بڑی محبت آپ کی۔ میں آپ کی کنیز، آپ کے پیروں کی دھول۔ انہوں نے کاغذ کی وہ پڑیاں ہینڈ بیگ میں رکھیں اور اندرونی جیب سے ہزار ہزار کے پانچ نوٹ نکال کر بابا جی کو تھمائے۔

"بابا جی! شادی کے لیے جتنے چلے آپ نے کاٹے، اس کا حق میں ادا نہیں کر سکتی۔" بابا جی نے کچھ کہے بغیر نوٹ تھام لیے۔

"خوش رہو، برکت پاؤ عمر میں بھی اور رزق میں بھی۔"

"سلام بابا جی! اب چلتی ہوں۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہوا ہے۔" یوسف بھی سلام کر کے باہر نکل آئے۔ بابا جی نے دونوں کے سروں پر ہاتھ پھیر کر اجازت دی۔ وہ باہر نکل آئیں۔ پیچھے عورتیں ان کے سب سے آخر میں آنے اور سب سے پہلے فارغ ہو کر جانے کی وجہ سے بڑبڑا رہی تھیں۔

"ہاں جی۔ پیسے کے کرشمے ہیں سب، سب سے آخر میں آئیں اور منٹوں میں

فارغ ہو کر بھی چلی گئیں۔ میں نے ابھی گھر جا کر ناشتہ بھی بنانا ہے اور ساس کے جوتے بھی کھانے ہیں۔" ساری عورتوں کو اپنے اپنے گھروں کے بکھیڑے یاد آنے لگے۔



وہ دن اس کی زندگی کا عجیب ترین دن تھا جس کی صبح حسین اور یادگار ہونے کے بجائے انوکھی اور عجیب تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اتنی میچور اور پڑھی لکھی شیریں، اندر سے اتنی کمزور عقیدے کی مالک ہوگی یہ اللہ پر کمزور ایمان ہی تو ہے جو شیریں جیسی پڑھی لکھی عورتوں کو بابا جی جیسے پیروں فقیروں کے پاس لیے پھرتا ہے۔ اگر خدا تک پہنچنے کے لیے فقیروں اور باباؤں کی ضرورت ہوتی تو پھر خدا کو انسان کی شہ رگ کے قریب ہونے کی کیا ضرورت ہوتی اگر یہی سب کچھ ہونا تھا تو پھر نبی آخر الزماں کے آنے کی کیا ضرورت تھی کیونکہ آپ ﷺ کے آنے سے پہلے بھی کفار مکہ اپنے بتوں کے ساتھ اللہ کے وجود کو مانتے تھے۔ اب بت نہ سہی، یہ بابے یہ پیر سہی وہ تو گنگ تھی وہ بہت کٹر مذہبی نہیں تھی نہ اس کا گھرانہ بس سیدھی سادی پانچ نمازیں، قرآن اور جمعہ و عید کی نمازیں اور امی کے گھر میں مذہبی فرقہ بندی پر بھی کبھی بحث نہ ہوتی تھی مگر آج صبح کے واقعہ نے جیسے اس پر سوچ کے نئے در وا کر دیے تھے۔

اللہ تو کہتا ہے وہ ایک ہی دینے والا ہے۔ مجھ سے مانگو تو پھر اتنے سارے خدا کہاں سے پیدا ہو گئے؟ یہ ٹھیک ہے شیریں جیسے لوگ ایسے خداؤں کے آگے جھکتے نہیں، سجدے نہیں کرتے مگر ان کے کبڑے جسم، سجدے سے زیادہ حالت رحم میں ہوتے ہیں۔ اور جو آخری سوال اس کے ذہن میں ابھرا کیا یہ لوگ ہر چیز دینے پر قادر ہیں تو پھر ان کی زندگیاں اس درجہ ابتری کی حالت میں کیوں ہیں۔ اگر یہ ابتری، یہ غربت ان کا شیوہ ہے، انہیں پسند ہے تو پھر شیریں کے کڑکڑاتے ہزار ہزار کے نوٹ بابے نے کسی شکریے کی طرح کیوں بھیچے؟

"پلیز پلکیں نیچی رکھیں۔" بیوٹیشن کی آئی میک اپ میں وقت ہو رہی تھی۔ اسے یاد آیا کہ وہ تو ولیمے کے فنکشن کے لیے تیار ہونے بیوٹیشن کے آگے بیٹھی ہے۔ صبح سے اس کی یہی حالت تھی۔ گم صم، کھوئی کھوئی، وہ کوشش کے باوجود شیریں سے کچھ بھی سوال نہیں کر سکی تھی۔ پتا نہیں وہ فون والی ساحرہ شیریں کہاں غائب ہو گئی تھی۔ یہ تو کوئی بارعب قسم کی ہیڈ مسٹریس ٹائپ شیریں تھیں جن سے وہ پہلی رات ہی خوفزدہ ہو گئی تھی۔ جب وہ اسے پہلی رات میں

عروسی لباس میں رات کے دو بجے نمبر پر لے گئی تھیں اور یوسف سے کچھ بھی پوچھنے میں جھجک رہی تھی۔ یوسف باباجی کے آستانے سے آنے کے بعد ناشتہ کرتے ہی جو سوئے تو، اس کی تو انہوں نے خبر ہی نہیں لی وہ ناشتے کے بعد سٹنگ روم میں بیٹھی تھی۔ گھر میں مہمان خاصے کم تھے اور جو تھے سب کو دلہن کو بنا سنوار کر بیچ میں بٹھانے کا شوق تھا۔ فیروزی نازک کامدانی کے سوٹ میں لائٹ میک اپ کیے وہ دس بجے سے ادھر بیٹھی تھی۔ نیند اور تھکن سے اس کا برا حال تھا۔ شیریں سے یا کسی سے بھی وہ اپنی اس جائز خواہش کا اظہار نہ کر سکی۔ ویسے بھی اسے بیڈ روم کا راستہ نہیں آتا تھا گھر کافی بڑا اور کشادہ تھا۔ بڑے بڑے اسٹائلش کمرے اور سارے کمرے ہی ڈیکوریٹڈ تھے۔ گھر کو سجانے میں کس کے ذوق کا دخل تھا۔ اس کا تو اسے اندازہ تھا کہ یہ صرف آپی جی کا کمال ہو سکتا ہے۔ مگر دل نہیں مان رہا تھا کہ اخروٹ کے چھلکے جیسی سخت شیریں کا ذوق اتنا نفیس اتنا شائستہ بھی ہو سکتا ہے۔

''ہائے مامی! آپ صبح سے ادھر ہی پھنسی ہیں۔ آپ کو کیا Panishment (سزا) ملی ہے۔ دلہن بننے کی۔''

جلا ایک بجے سو کر اٹھی۔ درشہوار کو سٹنگ روم میں حد سے زیادہ بیزار...... صورت لیے بیٹھے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ بلیک ٹراؤزر اور پنک شرٹ میں بغیر دوپٹے اور اسکارف کے بے تکلفی سے پھر رہی تھی۔ درشہوار کو اس کی آزادی پر بڑا رشک آیا۔

''ممانے تو آرڈر نہیں دیا۔'' وہ اس کی قریب ذرا سا جھک کر بولی تو وہ پھر بھی کچھ نہ کہہ سکی۔

''اوکے، میں ممی کو دیکھ لوں گی۔ آئیں میں آپ کو بیڈ روم تک چھوڑ آؤں۔''

وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔ سب مہمان خواتین اب شام کے فنکشن کے لیے کپڑوں کی تیاری کر رہی تھیں۔ کسی نے دلہن کے غائب ہونے کا نوٹس نہیں لیا۔

درشہوار نے کمرے میں آ کر سکون کا سانس لیا۔ یوسف کے ہلکے ہلکے خراٹے کمرے میں گونج رہے تھے۔

''آپ چینج کر کے ریسٹ کریں۔'' جلا اسے کمرے میں چھوڑ کر فوراً دروازہ بند کر کے چلی گئی۔

''شیریں جیسی بھی سہی مگر اس کا سرپرائزنگ گفٹ لاجواب ہے۔ آئی ایم گی۔''

یوسف کو سوتے دیکھ کر وہ سوچنے لگی۔ شرمیلی سی مسکان اس کے لبوں کو چھونے لگی۔ وہ ہاتھ بڑھا کر اپنی خوش قسمتی کو چھونا چاہ رہی تھی کہ خوش قسمتی نے اچانک آنکھیں کھول کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''کیا نظر لگانے کا ارادہ تھا۔'' نیند سے بوجھل بھاری آواز پر درشہوار سر تکیے میں گھسیو لیا۔ ابھی اس کی آنکھ ٹھیک سے لگی بھی نہیں تھی کہ شیریں کی کرخت دار آواز پر وہ ڈر کر اٹھ بیٹھی۔؟ آنکھیں لال سرخ ہو رہی تھیں۔

''لنچ ٹائم ہو گیا ہے۔ آپی جی ہر کام وقت پر کرنے کی عادی ہیں۔'' یوسف نے کھسیانی آواز میں اسے مطلع کیا۔

''ہر کام وقت پر کرنے کی عادی ہیں تو خود کریں۔ دوسروں کی زندگی تو نہ اجیرن کریں'' وہ اپنی جھلاہٹ کو زبان نہ دے سکی۔

ویسے کے فنکشن میں وہ بارات سے بھی زیادہ حسین لگ رہی تھی سب یہی کہہ رہے تھے۔ شیریں اسے اپنی بیوٹیشن کی مہارت گردان رہی تھیں۔

''بارات والی بیوٹیشن نے تو جیسے میک اپ سر سے اتارا ہوا تھا نہ آئی میک اپ ڈھنگ کا نہ ہیئر اسٹائل، آج دیکھا ہے فرق۔ یہ سب میری چوائس کا کمال ہے۔'' وہ اترا اترا کر سب کو بتا رہی تھی۔

''دری! آج تم اتنی حسین لگ رہی ہو، جی کر رہا ہے تمہیں اغوا کر کے لے جاؤں۔'' راحین اس کے کان کے پاس بولی۔ ''سنو ایک خوشخبری ہے۔'' وہ جگہ تنگ ہونے کی وجہ سے درشہوار سے چپکی ہوئی تھی۔

''پتا ہے ہم لوگ واپس اپنے پورشن میں آ رہے ہیں، میں اور ڈیڈی۔ امی ابھی بھی اڑی ہوئی ہیں اپنی ضد پر، حالانکہ شانزے نے انہیں۔'' وہ کہتے کہتے رک گئی ''تم آج چلو گی نا ہمارے ساتھ۔''

''پتا نہیں۔'' اس نے نیچی نظروں سے اسٹیج پر ذرا پرے کھڑی شیریں کی آنکھوں کو دیکھا۔

''ہمارے ہاں تو یہی رسم ہے، مکلاوا اسی کو تو کہتے ہیں۔''

''پتا نہیں۔'' وہ کچھ چڑ کر بولی۔ اس وقت اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''درشہوار! تمہاری ساس نظر نہیں آ رہی ہیں؟'' امی اس کے پاس پڑی کرسی پر آ بیٹھیں۔

''پتا نہیں امی!'' اس نے تو ایک بار بھی ان کے درشن نہیں کیے تھے۔

''اماں سو رہی ہیں۔'' رات کسی خاتون کے پوچھنے پر شیریں نے کہا تھا۔

''تمہیں ان باتوں سے بے خبر نہیں رہنا چاہیے۔'' امی کچھ خفگی سے بولیں۔

ولیمے کے بعد وہ امی ڈیڈی کے ساتھ ہی آ گئی تھی اور یوسف بھی اگرچہ یوسف کو بھیجنے میں شیریں رضامندی نہ تھی۔

''اماں کو دیکھنا ہے یوسف نے گھر جا کر، وہ اداس ہو جائیں گی اگر یوسف رات ان سے نہ ملا تو۔ رات کو سونے سے پہلے وہ روز اماں کے پاس ضرور جاتا ہے۔''

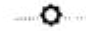
''مگر شیریں! یہ رسم تو لازمی ہوتی ہے۔ دولہا دلہن کے ساتھ ہی اس کے گھر جاتا ہے۔ اگر آنٹی سے ملنا ضروری ہے تو یوسف جاتے ہوئے مل لے گا۔ مگر اسے جانے سے نہیں روکو یہ رسم ضروری ہوتی ہے۔'' شیریں کے مسلسل حیل و حجت پر بلقیس آنٹی نے ذرا سخت لہجے میں کہا تو انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔

یوسف گھر جاتے ہوئے راستے میں اماں سے ملنے کے لیے نہیں رکے۔

''اماں سے ملنے نہیں جائیں گے؟'' گاڑی اس کے گھر کے مانوس راستوں پر دوڑ رہی تھی۔

''نہیں، خاصی دیر ہو گئی ہے اور میں بہت تھک گیا ہوں۔ آرام کرنا چاہتا ہوں۔'' انہوں نے صاف جواب دے دیا۔

''رات والی بات اور صبح والا واقعہ امی کو بتاؤں کہ نہیں۔'' وہ سوچتی ہوئی گاڑی سے اتری۔



وہ پوری ایک رات اور ایک دن امی کے پاس رہی اور کوشش کے باوجود ان سے کچھ نہ کہہ سکی۔ امی نے شادی سے دو دن پہلے اسے بہت سی باتیں سمجھائی تھیں جن میں ایک یہ بھی تھی کہ ''بیٹا بے اعتبار و بے کردار عورت وہی نہیں ہوتی جو شوہر کی عزت کو پامال کرے بلکہ بے کردار وہ بھی ہوتی ہے جو اپنے شوہر کی اپنے گھر کی یا اپنے سسرال کی باتیں باہر جا کر

دوسروں کو بتائے اور ان دوسروں میں اس عورت کے ماں باپ، بھائی سب شامل ہیں'' اس نے انہیں کچھ بھی بتانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

''ایک دن رات میں ہی اسے اپنا گھر، اپنا کمرہ سب پرایا پرایا سا لگنے لگا چھتیس گھنٹوں میں سب کچھ بدل گیا تھا محض ایک رشتے کے اضافے سے۔ اس کی نیند سے بے فکری کا عنصر غائب ہو گیا تھا۔

بھائی اور علینہ بھابھی کل شام کے ٹکٹ کنفرم تھے۔ ڈیڈی نے انہیں بہت روکنے کی کوشش کی تھی۔

''ڈیڈی ہمارے بچے کو برٹش نیشنلٹی مل جائے پھر واپس آ جائیں گے۔'' ڈیڈی کے اصرار پر انہوں نے وعدہ کر لیا۔

شام کو شیریں اور ویلا اسے لینے آ گئیں۔ تو اس کے اندر عجیب سی اداسی اترنے لگی۔ حالانکہ اس کے سسرال کا گھر اس کے اپنے گھر سے زیادہ ہوادار اور خوبصورت تھا مگر پتا نہیں کیسی پراسراریت اور اداسی نے اس گھر کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔

امی، ڈیڈی نے ایک بار پھر اسے اپنی دعاؤں میں رخصت کیا۔ تایا جی اور تائی جی بھی آ گئے تھے، وہ لوگ کچھ دنوں میں واپس آنے والے تھے مہران بھائی کی دلہن انہیں چار دن نہ سہ سکی تھی۔

''چلو در! تمہیں اماں سے ملواؤں۔'' آج شیریں کا موڈ خوشگوار تھا۔

''آپی جی! میں تو بہت تھکا ہوا ہوں، آرام کروں گا۔'' یوسف نے اماں کے کمرے کی طرف جانے سے پہلے ہی کہہ کر اپنا رخ بیڈ روم کی طرف موڑ لیا۔

''کیا سسرال میں ہل جوتے تھے اس نے جو یہ تھک گیا ہے۔'' شیریں ناگواری سے بولی۔

اس کا خیال تھا، اماں کوئی معذور بوڑھی، ضعیف لاغر و بیمار خاتون ہوں گی مگر کمرے میں جاتے ہی اسے زبردست جھٹکا لگا۔ اماں پچاس پچپن کے درمیان کی ایک فیشن ایبل گڈ لکنگ خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنے شولڈر کٹ گھنگھریالے بال سرخ رنگے ہوئے تھے۔ گہری کلیجی رنگ کی لپ اسٹک اور اس کی ہم رنگ نیل پالش ہاتھوں اور پیروں کے نوکیلے اور لمبے ناخنوں پر لگی تھی۔ ان کا فگر اس عمر میں بھی قابل رشک تھا۔ تیز جامنی کلر کی شرٹ جس پر

ڈارک براؤن کڑھائی تھی انہیں یا تو بے حد تنگ تھی یا وہ اسی ہی ٹھنگ پہنتی تھیں۔

''اماں! یہ درشہوار ہے۔'' وہ آخری لمحے تک یہی سمجھتی رہی کہ یہ کوئی اماں کی مہمان ہوں گی، مگر شیریں نے اس کی غلط فہمی دور کر دی۔

''ہوں...... '' وہ ڈریسنگ ٹیبل کے آگے بیٹھی ہونٹوں کو گول کر کے چپ کر گئیں۔

''آپ سونے لگی تھیں؟'' شیریں ان کے بیڈ کے کنارے تک گئیں۔

''ہاں، سونے کی تیاری ہی تو کر رہی تھی۔ بس لیٹنے لگی ہوں۔'' انہوں نے پرفیوم کی پھوار سے گویا اپنا پورا لباس بھگو ڈالا۔ سارا کمرہ چارلی کی تیز نتھنوں میں گھسنے والی مہک سے بھر گیا۔

''چلیں پھر آپ آرام کریں، میں صفیہ کو بھیجتی ہوں، آ کر آپ کو دودھ اور دوا دے دے۔'' شیریں اٹھ کھڑی ہوئیں وہ تو سمجھی تھی اماں کہیں جانے کے لیے تیار ہو رہی ہیں۔ اتنی فل تیاری سونے کے لیے۔ وہ حیرت زدہ رہ گئی۔

''اس حرام زادی کو مت بھیجنا میرے کمرے میں۔ نہیں تو آج اس کا کلیجہ چبا جاؤں گی کتیا کا۔'' اماں نے پرفیوم کی بوتل ڈریسنگ ٹیبل پر دے ماری۔ پتا نہیں بوتل کی قسمت اچھی تھی یا ان کی، بوتل ٹوٹنے کے بجائے قالین پر بوس ہو گئی۔ اماں مارے غصے کے جیسے لڑنے مرنے پر اتر آئیں۔

''او کے او کے نہیں بھیجتی۔ خود لاتی ہوں، آپ ریلیکس ہو جائیں۔'' شیریں نے آگے بڑھ کر انہیں کندھوں سے تھام کر بیڈ پر لا کر آرام سے لٹا دیا، وہ فوراً نارمل ہو گئیں۔

شیریں نے ان کی پیشانی چومی، انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔

''یار! آ بھی جاؤ، باتیں کرتے ہیں، مجھے نیند نہیں آ رہی۔'' یوسف کوئی کتاب کھولے بیٹھے تھے، اسے دیکھ کر بولے۔

''ابھی تو آپ کہہ کر آئے تھے کہ آپ کو نیند آ رہی ہے۔'' وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

''کم آن، وہ تو میں نے یونہی کہا تھا اور تم ادھر کدھر بیٹھ گئی ہو، ادھر آؤ نا۔'' وہ مشتاق لہجے میں بولے تو وہ جھینپ گئی۔

''میں چینج تو کر لوں۔'' وہ وارڈ روب کی طرف بڑھی۔

''یوسف سے اماں کے بارے پوچھوں کہ نہ پوچھوں۔'' وہ کپڑے نکالتے ہوئے

سوچ رہی تھی۔

شادی کے بعد اس کی سوچیں بڑھ گئی تھیں اور لفظ گم ہو گئے تھے۔



''ہم ہنی مون کے لیے شمالی علاقہ جات گھوم کر آئیں گے۔ کاغان، سوات، ناران۔'' یوسف نے اس سے کہا۔

''آپی جی نے کہا ہے کہ صرف مری، ایبٹ آباد اور بھوربن ہو آؤ۔ آگے جانے کی ضرورت نہیں۔'' اس کے دل کی کلی مرجھا سی گئی۔

''ہم جائیں گے کاغان بھی۔ کچھ عرصے بعد سہی، تم ڈپریس نہ ہو۔ اصل میں آپی جی کی عادت ہے ہر معاملے میں اپنی منوانے کی، اگر ان کی بات نہ مانو تو پتا نہیں عجیب ضدی سی ہو جاتی ہے۔ اپنی بات منوانے کے لیے، اپنا سب کچھ داؤ پر لگا بیٹھتی ہیں۔'' یوسف نے اسے کندھوں سے تھام کر پیار سے سمجھایا تو وہ مان گئی۔

بھوربن تو وہ پہلے بھی آ چکی تھی۔ آفاق بھائی، دانیال فرحین اور راحین کے ساتھ مگر اب جو لطف اسے یوسف کی سنگت سے آیا، وہ یادگار تھا۔ ایبٹ آباد، نتھیا گلی، گھوڑا گلی انہوں نے ادھر پورا ایک ہفتہ گزارا۔ ان دنوں موسم بہت خوشگوار تھا۔ دن سرد اور رات خنک، وہ بہت سی حسین یادوں سے اپنی جھولی بھر کر لوٹے۔ اگلے دن وہ امی کی طرف آ گئی۔ ایک ہفتہ رہنے کے لیے مگر یوسف اسے چوتھے دن لینے پہنچ گئے۔

''وہ آنٹی! اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ درشہوار کو یاد کر رہی ہیں۔'' ان کا جھوٹ ان کی مسکراتی آنکھوں سے عیاں تھا، وہ دانت پیسنے لگی مگر سچ تو یہ تھا وہ خود بھی ان چار دنوں میں یوسف کے بغیر خود کو بہت تنہا اور اکیلا محسوس کرنے لگی تھی۔ پندرہ دنوں کی رفاقت نے بیس سالوں کی محبت کو پس پشت ڈال دیا تھا۔

وہ امی کے کہنے پر فوراً تیار ہو گئی۔ رات کے کھانے پر امی نے خاص اہتمام کیا۔ دونوں تایا جی کی طرف بھی ملنے گئے۔ وہ لوگ دو دن پہلے ہی دوبارہ شفٹ ہوئے تھے۔ انہوں نے بے حد اصرار کیا کہ کل کا دن رکو۔ ابھی تو تمہاری دعوت کرنی ہے مگر یوسف نے بڑا مضبوط بہانا بنایا تھا۔ کوئی بھی بہت اصرار نہ کر سکا۔

''کیا ضرورت تھی یوں جھوٹ گھڑ کر مجھے لانے کی۔'' گاڑی میں بیٹھتے ہی وہ

یوسف پر الٹ پڑی۔

"اچھا جو اپنے منہ پر بارہ بجے تھے وہ، روز فون پر میرے کان کھاتی تھیں۔ یوسف! میرا دل نہیں لگ رہا۔ آپ کے بغیر نیند نہیں آتی۔ کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔" وہ کون سا ادھار رکھنے والے تھے۔

"جی نہیں، میں نے کب کہا تھا۔" وہ منہ پھیر کر فوراً مکر گئی تو یوسف بھی اسے دیکھ کر مسکرانے لگے۔

گھر میں سب کچھ ویسے ہی تھا۔ اماں اور بیلا اپنے کمرے میں، شیریں سے ملنے وہ اس کے کمرے میں گئے۔ وہ جائے نماز پر بیٹھی آنکھیں بند کیے کوئی وظیفہ کر رہی تھیں۔ وہ کافی دیر ان کے کمرے میں بیٹھے رہے۔ آخر پندرہ منٹ بعد شیریں نے آنکھیں کھولیں اور دونوں کو دیکھ کر پھونک ان کے چہروں پر ماری۔

"آداب آپی جی!" وہ اپنی جگہ سے اٹھنے لگی، شیریں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔

"اوکے آپی جی! ہم چلتے ہیں۔ ڈسٹرب کرنے پر معذرت چاہتے ہیں۔" یوسف فوراً کھڑے ہو گئے اور اسے بھی اٹھنے کا اشارہ کیا شیریں نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

"یہ ــــ"

"اس نے کچھ پوچھنا چاہا۔ یوسف نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔

"ہر شخص کی اپنی زندگی ہے، اسے اپنے طور پر جینے دو، کسی کے بارے میں نہ سوچو نہ تجسس ہو۔ یہ اس گھر کا اصول ہے۔" وہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولے تو اسے مزید کچھ پوچھنے کی ہمت نہ پڑی۔

"آپ اماں سے نہیں ملے؟" وہ کپڑے تبدیل کرنے کے بعد بستر پر آ بیٹھی۔

"مل لیں گے۔؟" وہ لاپروائی سے بولے۔

"یوسف!" وہ انہیں سرزنش کرنا چاہتی تھی مگر موڈ آف کر کے دور جا بیٹھی۔

"اچھا بیٹھو ادھر، میں بتاتا ہوں۔" انہوں نے سر کے پیچھے رکھے تکیے کو اونچا کیا اور بیڈ کی پشت سے سر ٹکا کر بیٹھ گئے۔

"اصل میں اماں آپی، آپی جی کی اماں ہیں۔ میری وہ اسٹیپ مدر ہیں، آپی جی

سات سال کی تھیں یا چھ کی جب بابا نے اپنی کلاس فیلو یعنی میری ماما سے چھپ کر کورٹ میرج کر لی۔ اماں کو اس بات کی خبر نہ ہو سکی۔ آپی جی کے بعد اماں اور بچے پیدا کرنے کے قابل نہ رہی تھیں، کوئی میڈیکل پرابلم ہو گئی تھی ان کے ساتھ اور بابا کو بیٹے کی تمنا تھی۔ سال بعد ہی میں پیدا ہو گیا مگر میری ماما میری پیدائش پر ہی جان ہار گئیں۔ بابا کے لیے یہ سب بہت شاکنگ تھا۔ وہ اماں سے مجھے کیا کہہ کر متعارف کراتے، انہوں نے میرے لیے ایک گورنس رکھ لی۔ بائی لک سلمیٰ آنٹی بہت وفادار اور محبت کرنے والی ثابت ہوئیں۔ میں سات سال کا تھا کہ بابا کا اچانک ہارٹ فیل ہو گیا اور سلمیٰ آنٹی کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ مجھے اماں کے پاس لے کر آئیں اماں کے لیے تو وہ دن جیسے قیامت کا تھا۔ ایک تو بابا کی ناگہانی موت، اوپر سے میرا وجود تمام ثبوت و شواہد کے ساتھ، انہوں نے مجھے فی الفور دھتکار دیا۔ دھکے دے کر گھر سے نکالنا چاہا مگر میرے ساتھ وکیل انکل کی دھمکی نے انہیں ایسا کرنے نہ دیا۔ کہ بابا یہ گھر میرے نام کر گئے تھے۔ مگر اس کے باوجود اماں مجھے قبول کرنے پر تیار نہ تھیں۔

میں کتنی دیر لاچار و بے بس ان کی ہمدردی بھری نگاہ کا منتظر کھڑا رہا۔ آخر آپی آگے بڑھیں۔ یہ اس وقت فورتھ ایئر میں تھیں۔ انہوں نے مجھے اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا۔ میری جگہ خود بخود بن گئی۔

پھر وہ دن اور آج کا دن آپی جی میرا سب کچھ بن گئیں۔ اماں کی نفرت مجھ سے ہنوز برقرار ہے۔ مجھے دیکھتے ہی انہیں ہسٹریا کے دورے پڑنے لگتے ہیں، میری تمام نگہداشت دیکھ بھال آپی جی نے کی۔

چار سال بعد ماسٹرز کرتے ہی انہوں نے اپنے کلاس فیلو طلحہ سے نکاح کر لیا۔ اماں نے آپی جی کا بائیکاٹ کر دیا اور میری بدبختی کے دن شروع ہو گئے۔ پھر زمین اور آسمان کے درمیان جتنے ستم ایک گیارہ سال کے بچے پر توڑے جا سکتے ہیں، اماں نے توڑے۔ میری پیٹھ جو دھاریوں بھری کھال ہے، وہ اماں کے محبت بھرے تحفے ہیں، وہ ہر وقت چولہے پر گرم راڈ رے لیے تیار رکھتی تھیں۔ ادھر آپی جی کی طلحہ کے ساتھ نہ بن سکی۔ وہ چار ہزار ماہوار پر کسی گورنمنٹ کے محکمے میں ملازم تھا اس کی دو بہنیں ایک بھائی اور باپ تھے جن کی کفالت اسے کرنا تھی۔ اس کے تین مرلے کے ڈربے جیسے گھر میں آپی جیسی نفیس، جمال پرست خاتون رہ

سکتی تھیں۔ ویلا کی پیدائش سے تین ماہ پہلے ہی وہ طلاق کا پروانہ لے کر واپس آ گئیں۔ تو جیسے خدا نے میری سن لی۔ انہوں نے اماں کے ساتھ خوب لڑائی کی۔ انہیں خوف خدا کا احساس دلانا چاہا مگر اماں ہر احساس سے عاری ہو چکی تھیں۔ انہیں تو اب آپی جی سے نفرت تھی۔ آپی جی نے دوبارہ میرا اسکول بحال کیا۔ میرا اعتماد زندگی پر بحال کیا۔ آج میں جو کچھ ہوں وہ آپی جی کی وجہ سے ہوں۔ جس طرح کسی جن کی جان، کسی طوطے میں یا کبوتر میں ہوتی ہے۔ اسی طرح میری جان آپی میں ہے۔ درا تمہیں میری محبت اور توجہ درکار ہے تو کبھی آپی جی کو ناخوش نہ کرنا۔ میری تم سے بس یہی ڈیمانڈ ہے۔"

وہ اپنی تکلیف بھری داستان کے کتنے حصے اس سے چھپا گئے ہیں، اس کا پتا اسے ان کی لال انگارہ ہوتی آنکھوں سے چل گیا تھا۔



"درا گھر میں تو کوئی خاص کام ہوتا نہیں۔ کاموں کے لیے ملازم موجود ہیں، تم بس کچن میں نواز کے کام کی دیکھ بھال کر لیا کرو، اور پلیز اماں کے تین ٹائم کھانے اور دوا کا خیال تم نے رکھنا ہے۔ کیونکہ تینوں ٹائم عموماً میری عبادت کے ہوتے ہیں۔ اس لیے اماں کے کھانے کو دیر ہو جاتی ہے، صفیہ ان کی دیکھ بھال کے لیے موجود ہے مگر صفیہ کے بار بار پوچھنے پر وہ چڑ جاتی ہیں۔ دوسری انہیں خود سے کھانا بھی مشکل لگتا ہے، اس لیے تم ذرا دیکھ بھال کرنا۔ ویلا کو دلچسپی نہیں۔ باقی اور کوئی کام نہیں، تمہیں اس سے اچھی سسرال مل ہی نہیں سکتی تھی۔ اور تمہیں اس لیے ملی کہ تم بہت اچھی ہو۔" پرانی شیریں لوٹ رہی تھیں۔ یوسف کی چھٹی ختم ہو چکی تھی، شیریں نے آج اسے گھر کی طرف متوجہ کیا تھا۔ کل اس سے سویٹ ڈش بنوائی جا چکی تھی، سورج کی کارروائی بھی مکمل ہو چکی تھی۔

شیریں نے جس کام کو آسان بتایا تھا وہ دنیا کا مشکل ترین کام تھا۔ اماں کو کھانا کھلانا کے ٹو سر کرنے کے مترادف تھا، حیرانی کی بات تو یہ تھی جو عورت اپنا فیشل، مانیکلینزنگ، بلیچنگ ہر طرح کا فیشن سے متعلقہ کام خود بے حد مہارت سے کر سکتی تھی وہ خود سے ایک نوالہ بھی توڑ کر نہیں کھا سکتی تھی۔ کھانا ٹرے میں سجا کر آگے پڑا ہوتا تو چپ کر کے کھا لیتیں، ناپسند ہوتا، تو ٹرے گرم سالن سمیت صفیہ پر الٹ دیتیں۔ اور صفیہ یہاں کیوں ٹکی ہوئی تھی، ہر روز اپنے جسم کا کوئی نہ کوئی حصہ جلانے کے باوجود اس لیے کہ اس کے گھر میں سات

جوان بیٹیاں تھیں اور شیریں اسے اس قدر نوازتی تھیں کہ محض دو سالوں میں وہ دو بیٹیاں بیاہ چکی تھی۔ وہ پانچ سال ختم ہونے کے انتظار میں تھی۔

درشہوار نے ایک دفعہ کے بعد یہ کوشش ترک کر دی حالانکہ گرم شوربا اس پر نہیں گرا تھا مگر وہ اتنی دہشت زدہ ہوئی کہ دوبارہ کبھی اماں کو کھانا کھلانے کی کوشش نہیں کی۔

ویلا کی اپنی زندگی تھی۔ گھر اور باہر ایک ہی حلیے میں پھرتی تھی، جینز اور ٹی شرٹ اس کا فیورٹ ڈریس تھا۔ حالانکہ ٹی وی اس کے کمرے میں موجود تھا مگر وہ نہایت بے تکلفی سے ملازموں کے آنے جانے کی پروا کیے بغیر ٹی وی لاؤنج میں صوفے پر لیٹ کر ایسے ایسے موویز دیکھتی کہ درشہوار کے پسینے چھوٹ جاتے۔ اور وہ آرام سے لیٹی دیکھتی رہتی۔ شیریں سب کچھ دیکھ کر اندھی بن جاتیں۔ ماں کی عبادتیں ختم نہیں ہوتی تھیں۔ اور بیٹی حیا کی ساری حدیں پھلانگ رہی تھیں۔ دوسرا مشغلہ اس کا موبائل جنون تھا۔ جو ہر وقت ہر جگہ اس کے کان کے ساتھ چپٹا ہوتا۔ مووی دیکھنے کے دوران بھی۔ پتا نہیں وہ کس قسم کی لڑکی تھی جسے لڑکیوں کے کسی بھی شوق سے دلچسپی نہیں تھی۔

"میری بیٹی بہت بھولی ہے۔ ورنہ آج کل کی لڑکیاں تو بہت خرانٹ اور فیشن ایبل ہوتی ہیں۔" شیریں اکثر کہتیں۔

"آج تمہاری شادی کو پورے چار ماہ ہو گئے ہیں، ہے نا در؟"

دوپہر کے کھانے کے بعد وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں جانے لگی شیریں نے ایک دم سے کہا وہ ٹھٹک کر بیٹھ گئی۔

"جی......" وہ نظریں جھکا کر بولی۔

"اور کسی خوشخبری کا دور دور تک پتا نہیں۔"

شیریں کا لہجہ بے حد کاٹ دار تھا۔ وہ چپ سی رہ گئی۔

"میں آج ہی بابا کے پاس جاتی ہوں۔" وہ شاید خود سے بولی تھیں۔

"اماں کو کھانا کھلا دو، صفیہ تو آج رات کو آئے گی، اس کی بیٹی کو دیکھنے لوگ آ رہے

شیریں نے اسے آرڈر دیا تو اس نے خوفزدہ نظروں سے شیریں کو دیکھا جو بے نیازی سے اپنے کمرے کی طرف چل دی تھیں۔

اس نے مجبوراً کھانا ٹرے میں سجایا اور اماں کے کمرے میں آ گئی۔ اس نے سالن

زیادہ گرم نہیں کیا تھا احتیاطاً۔

"اماں! کھانا؟" اس نے چھوٹی تپائی ان کے آگے رکھی۔ اماں خاموش رہیں۔ وہ بجی سنوری ہیلسل ہیل کی جوتی پہنے صوفے پر تیار بیٹھی تھیں، وہ ان کے پاس بیٹھ کر نوالہ توڑنے لگی کہ اماں اٹھیں۔ اٹھ کر انہوں نے کمرے کا دروازہ بند کیا۔

"ارے...... اماں! یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟" نوالہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

اماں نے اگلے سیکنڈ جوتی اتاری اپنے پاؤں سے اور اس کی کمر اور سر پر برسانی شروع کر دی۔

"اماں...... اماں پلیز، میں نے کیا کیا ہے؟" وہ ادھر ادھر بھاگ کر اپنا بچاؤ کرنے لگی۔

"میں تجھے جلا دوں گی حرامزادی! تو نے ہی اپنے حسن سے محسن کو دیوانہ بنا رکھا ہے۔" وہ یوسف کے بابا کا نام لے کر چیخیں۔

"اماں! اماں! میں ورشہوار ہوں۔"

تڑاخ سے جوتی کی نوک اس کے ماتھے پر آ کر لگی۔ اس کا سر گھوم گیا۔ آنکھوں کے آگے تارے سے ناچنے لگے۔ سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گئی تو اماں کی رفتار میں مزید تیزی آ گئی۔ اس کے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں۔ اماں کی آنکھیں لال انگارہ ہو کر دہکنے لگی تھیں۔ منہ سے رال بہہ رہی تھی۔ اور وہ جنون میں اسے پیٹے جا رہی تھیں اس نے انہیں پرے دھکا دے کر زور سے چھلانگ لگائی اور دروازہ کھول کر پوری رفتار سے کاریڈور میں بھاگ گئی۔ اپنے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اماں جوتی ہاتھ میں لیے بال بکھرائے کسی چڑیل کی طرح اسے اپنے کمرے کے آگے کھڑی خونخوار نگاہوں سے گھور رہی تھیں۔ اس نے جلدی سے دروازہ بند کر کے لاک لگا دی۔



"صفیہ کہاں مر گئی تھی جو تم اماں کو کھانا کھلانے پہنچ گئیں۔" یوسف اس کے ماتھے پر گومڑ دیکھ کر بھونچکا رہ گئے۔

"وہ گھر گئی تھی اپنے۔ مجھ سے آپی جی نے کہا تھا کہ اماں کو کھانا کھلا دوں۔" اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی تھی، آپی جی کا نام سنتے ہی یوسف کا غصہ جھنجھلاہٹ سب

ہوا ہو گئی۔

"کوئی چیز گھر لے گئی تھی۔" وہ اپنے کپڑے اٹھا کر ڈریسنگ روم میں گھس گئے۔ شیریں تو تھوڑی دیر پہلے اسے دروازے میں کھڑے کھڑے پوچھ گئی تھی۔

"شاید اماں کو ہاسپٹل لے جانا پڑے۔ انہیں آج پھر دورہ پڑا ہے، تم ریسٹ کرو۔" کپڑے بدل کر یوسف اس سے کہہ کر جو گئے تو رات کے گیارہ بجے تک واپس نہیں آئے۔

شام کو امی دانیال کے ساتھ ملنے آئیں تو اس کی حالت دیکھ کر دنگ رہ گئیں۔

"امی! کچن میں کام کر رہی تھی، کیبنٹ کا دروازہ زور سے لگ گیا۔" امی کو اس کے جھوٹ پر یقین نہیں آیا۔

"فون کر رہی تھی صبح سے۔ تمہارا فون ڈیڈ ہے شاید۔ یوسف کو فون کیا تھا کہ شام کو تمہیں لے کر ذرا گھر آ جائے۔ تمہارے ڈیڈی نے تم سے کچھ مشورہ کرنا تھا۔ دانی اور راحی کے سلسلے میں۔" وہ اس کے بالکل قریب بیٹھی تھیں۔ دانیال تو اس کی حالت دیکھ کر بالکل گم صم ہو گیا تھا۔

"رئیلی امی! یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔" وہ اپنی تکلیف بھول گئی۔

"یوسف اماں کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گئے ہیں۔ میں کل آ جاؤں گی۔"

پھر امی اس کے اصرار کے باوجود نہیں رکیں۔ شیریں نے تو جھوٹے منہ اندر آ کر نہیں پوچھا۔ رات کو وہ یوسف سے ان کے رویے کی شکایت کر بیٹھی۔

"ان کے وظیفے کا ٹائم ہوتا ہے۔ وہ سب کچھ ہمارے لیے ہی تو کرتی ہیں تم پھر بھی ان سے خائف رہتی ہو۔ دری! آپی جی کے معاملے میں تمہارے منہ سے کچھ برا نہیں سننا چاہتا، اوکے۔ اب سو جاؤ۔"

وہ کروٹ بدل کر سو گئے تو وہ مرد کے پل پل بدلتے روپ کے بارے میں سوچتی رہی، کڑھتی رہی۔



پھر اگلے تین دن وہ امی کی طرف ہی رہی۔ دانیال کی بات راحین سے پکی کر دی گئی اس کے تو جیسے دل کی مراد پوری ہو گئی۔ تائی جی پہلے والی تائی جی بن گئیں، خوش مزاج، ملنسار، تایا جی تو اس کی شادی پر ہی ٹھیک ہو چکے تھے۔ دادو بھی خوش تھیں کہ سارا خاندان پھر

سے ایک ہو گیا ہے۔

''منگنی وغیرہ رہنے دو۔ بس ایک دو ماہ تک شادی کی تیاری کر لو، مجھ سے اب گھر کا کام نہیں سنبھالا جاتا۔'' امی کی بات پر سب نے او کے کر دیا۔ تیسرے دن شام کو یوسف اسے لینے آ پہنچا اپنے قفس میں لے جانے کے لیے۔

''آپی جی سے ذرا تعلقات اچھے کرو، وہ تم سے خفا ہیں کہ تم ابھی تک گھر کے ماحول میں رچ بس نہیں رہیں۔ ورنہ! آپی سے زیادہ ہمارا خیر خواہ کوئی نہیں، یہ بات نہ بھولنا۔'' گھر کا رستہ شروع ہوتے ہی یوسف کا آپی نامہ شروع ہو گیا۔ وہ خاموش کھڑکی سے باہر تاریکی کی پہنائیاں ناپتی رہیں۔

''یوں گم صم نہ رہا کرو۔ ان سے گھلا ملا کرو۔'' وہ اس کی خاموشی پر چڑ کر بولے۔

''بولتی تو ہوں۔'' وہ بھی چڑ گئی۔

''اسی طرح سے لڑی لڑی سی۔'' وہ تنقید بھرے لہجے میں بولے تو اس نے جواب دینے سے گریز کیا۔ وہ گھر پہنچے تو سارا گھر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

''آپی جی سے مل آؤ جا کر۔'' وہ کاریڈور ہی میں تھی کہ آرڈر مل گیا۔

آپی جی کے کمرے کی لائٹ آف تھی۔ شاید سو چکی تھیں، اس نے دستک دی۔ کوئی جواب نہ ملا تو واپس پلٹ آئی

صبح ناشتے کی میز پر نیا ہنگامہ منتظر تھا۔

''یہ اوقات رہ گئی ہے میری اگر اس کو ٹکراتی کوئی ظالم ساس، جھگڑالو نند تو پتا لگ جاتا۔ یہ میں ہی ہوں نرم کچا لو۔ دلہن صاحبہ نہ آنے کا پتا دیتی ہیں نہ جانے کی خبر ابھی سے خود مختار ہو گئی ہیں۔'' وہ چیخ رہی تھیں۔

''آپی جی! رات کو وری آئی تھی آپ کو سلام کرنے۔'' یوسف نے فوراً صفائی پیش کی۔

''مت کرو جورو کی وکالت میرے آگے۔ کب آئی، پوچھو اس جادوگرنی سے۔ جس کا جادو تمہارے سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ کیا کمال ہے اس میں۔ بہت حسین پری ہے یا کروڑوں کی جائیداد مربعے لائی ہے جس کا مان ہے اسے چار ماہ ہونے کو آئے شادی کو، کوئی خوش خبری نہیں اور اوپر سے نخرے دیکھو۔ کسی کو منہ لگانا گوارا نہیں کرتیں محترمہ۔''

وہ کسی مجرم کی طرح ڈائننگ ٹیبل کے آگے کھڑی تھی، اور شیریں ہاتھ نچا نچا کر چیخ رہی تھیں۔

''تم رات کو آپی جی سے ملی نہیں؟'' یوسف آگ بگولہ ہو کر کھڑے ہو گئے۔

''وہ.... وہ آپی جی سو رہی تھیں۔'' اس نے خشک حلق کو تھوک نگل کر تر کرنا چاہا۔

''کہ وہ سو رہی تھیں یا مر گئی تھیں، دیکھ لیا تم نے، یہ میں ہی تھی جو اس کے لیے مری جا رہی تھی۔ اس کے رشتے کے لیے۔ بابا جی کی دہلیز گھس ڈالی۔ اس کے اماں باوا کے نخرے جھیلے اور یہ مجھے سلام کرنا گوارا نہیں کرتی۔ دیکھا تو نے یوسف؟'' وہ مسلسل چلا رہی تھیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ورشہوار کو پیٹنا شروع کر دیتیں۔

''سوری بولو آپی جی سے فوراً۔'' یوسف دھاڑے۔

اس نے آنسو بھری ایک شکایتی نگاہ اپنے محبوب شوہر پر ڈالی اور دھیرے سے سوری کہہ گئی۔

''تمہارے سوری کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ مجھے میری اوقات کا پتا چل گیا نا۔'' وہ اتنی جلدی کہاں ٹھنڈی ہونے والی تھیں، یوسف نے اسے بازو سے پکڑ کر ان کے آگے کیا۔

''سوری آپی جی! میں سمجھی، آپ سو رہی ہیں، ڈسٹرب ہوں گی۔ آئی ایم ریئلی سوری۔'' وہ ان کے ہاتھ تھام کر رو ہی پڑی، اتنی ذلت اس نے کب سہی تھی۔

''چلو ٹھیک ہے کرو ناشتا اب، تم مجھے یوسف کی طرح ہی عزیز ہو۔ مجھے نظر انداز کرو گی تو مجھے صدمہ ہو گا۔'' وہ منٹ بھر میں راضی ہو گئیں۔

چندرہ دن گزرے کہ وہ واقعہ ہو گیا جس نے ایک بار پھر اس کی عزت نفس کو کچل کر رکھ دیا۔

صفیہ اس دن بھی جلدی چلی گئی دوپہر میں دو گھنٹے کے لیے شیریں نے اس سے کہا کہ وہ اماں سے کھانے کا پوچھے۔ اس نے دروازہ میں ہی کھڑے ہو کر اماں سے کھانے کا پوچھا تو انہوں نے کہا کہ انہیں ابھی بھوک نہیں ہے۔ اس وقت وہ بالکل صحیح الدماغ لگ رہی تھیں، سفید کاٹن کے سوٹ میں بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھیں۔

وہ اطمینان سے کمرے میں آ گئی۔ جاتے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔

''تو یہی اٹس امپاسبل۔ ہمارے یہاں ایسا نہیں ہوتا۔'' وہ نامعلوم کس سے کہہ رہی

تھی کہ آج کل اسے فون کا خبط ہوا تھا۔ کھانا، پینا، ٹی وی، کیبل سب بھولا ہوا تھا، صرف فون یا پھر موبائل اور گاڑی کی چابیاں جب دیکھو اٹھائے باہر جاتی نظر آتی۔ پتا نہیں ماں جی سے لیے کوئی تعویذ کیوں نہیں لاتی۔

''دیکھو بھی! یہ جو مذہب وغیرہ ہوتا ہے، یہ بیمار ذہنوں کی پیداوار ہے۔ یہ کرو، یہ نہ کرو۔ انسان آزاد پیدا ہوا ہے بغیر کسی مذہب کے سیلس کے۔ یہ تو بعد میں معاشرہ اس پر کوئی نہ کوئی مذہب ٹھونس دیتا ہے میں نے ایسا کوئی طوق اپنے گلے میں نہیں ڈالا رکھا۔ جسٹ لائیک یو۔'' وہ آخر میں زور سے ہنسی۔

''او کے او کے ریلیکس، ایسے کاموں میں کچھ وقت تو لگتا ہے نا ویٹ کرو۔ سوٹ ایبل ٹائم کا۔ میں بھی کر رہی ہوں۔'' اس کے بعد شاید اس نے موبائل آف کر دیا تھا۔ درشہوار اپنے کمرے میں آ گئی۔

''اس گھر میں سارے ہی کھسکے ہوئے ہیں، نفسیاتی کیس۔'' وہ بیڈ پر لیٹ گئی۔ آج تو وہ صبح سے کچن میں لگی ہوئی تھی۔ نواز چھٹی پر چلا گیا تھا اور بعد میں صفیہ بھی۔ شیریں کی کوئیک آ گئیں...... تو اسے ان کے لیے کھانا تیار کرنا پڑا اور ابھی اٹھ کر رات کا کھانا بھی تیار کرنا تھا وہ کچھ دیر آرام کرنا چاہتی تھی کہ اسی وقت اماں کے زور زور سے چیخنے کی آواز آئی، وہ اٹھ کر باہر آنا ہی چاہتی تھی کہ شیریں خونخوار نظروں سے گھورتی کمرے کے دروازے میں آ کھڑی ہوئیں۔

''تم نے اماں کو کھانا کیوں نہیں دیا؟'' ان کا لہجہ پھاڑ کھانے والا تھا۔

''میں نے پوچھا تھا ان سے۔ انہوں نے کہا کہ ابھی بھوک نہیں۔''

''بکواس کرتی ہو تم، جھوٹ بولتی ہو۔ وہ بیمار عورت بھوک سے چلا رہی ہے اور تم اس سے بنا پوچھے یہاں آ کر آرام فرما رہی ہو۔ مکار لڑکی۔'' شیریں کا انداز انتہائی توہین آمیز تھا۔

''آپی جی! میں جھوٹ نہیں بول رہی۔ نہ مجھے بولنے کی ضرورت ہے، اماں آپ غلط کہہ رہی ہیں کہ میں نے ان سے کھانے کا نہیں پوچھا۔ پوچھیں جا کر ان سے۔'' وہ بھی غصے میں آ گئی۔

''میں جھوٹی ہوں، میری ماں جھوٹی ہے، ہاں تم سچی ہو، میں تمہیں یہاں لے جو آئی

ہوں۔ تمہیں اپنے سر پر نچانے کے لیے۔ اپنے ہیرے جیسے بھائی کو تم جیسی ناقدری کے حوالے کر دیا۔''

''بس کریں آپی جی! ایسا کچھ انوکھا نہیں کیا آپ نے اور میں نے آپ کی منتیں نہیں کی تھیں۔ آخر حد ہوتی ہے برداشت کی بھی۔'' وہ آخر میں بڑبڑائی۔

''اب میں تمہیں بتاؤں گی کہ برداشت کی حد کیا ہوتی ہے۔'' وہ عجیب سے انداز میں کہہ کر واپس پلٹ گئیں۔

یوسف نے اس روز لیٹ آنا تھا۔ رات کو دس بجے کھانا کھا کر جب وہ کمرے میں داخل ہوئے، وہ ڈریسنگ ٹیبل کے آگے بیٹھی اپنے بالوں میں برش کر رہی تھی۔

''اتنی دیر لگا دی آج آپ نے۔'' اس نے شیشے میں یوسف کا عکس دیکھ کر پوچھا۔

وہ خاموش قدم گن گن کر اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔

''تم نے زبان چلائی آپی جی کے آگے۔ تم نے انہیں جھوٹی، مکار کہا۔'' یوسف کی آواز جیسے سرد پانیوں کے گہرے کنویں سے آئی تھی۔ برش اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

''ن...... نہیں۔''

''بکو مت......'' تڑاخ تڑاخ۔ ایک دو، تین چار زور دار تھپڑ اس کے نازک رخساروں کو جیسے چیر گئے۔ یوسف نے اس کے سلکی سیاہ بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑا اور اسے زور سے زمین پر دھکا دے دیا۔

''آپی جی جھوٹی ہیں۔ مکار اور دھوکے باز۔ تم سچ ہو، ہیں نا۔''

وہ اسے پاؤں کی زور دار ٹھوکریں رسید کر رہے تھے۔

''یوسف! یوسف پلیز۔'' وہ سر اٹھانا چاہتی تھی۔ مگر تھپڑوں، گھونسوں اور لاتوں نے اسے سر نہیں اٹھانے دیا۔ یوسف بڑی بے دردی سے اسے کسی جانور کی طرح پیٹ رہے تھے۔

''چلو اسی وقت آپی جی سے معافی مانگو۔'' یوسف نے اسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا، تکلیف کی شدت سے وہ حلق کے بل چلائی۔

''اور چیخو مگر یاد رکھنا یہاں تمہاری چیخ و پکار سننے والا کوئی نہیں۔'' وہ زہر خند لہجے میں غرائے وہ اسی طرح اسے کسی کتے کی طرح گھسیٹتے ہوئے شیریں کے کمرے میں لے آئے۔

"چلو آپی جی سے معافی مانگو۔ ان کے پاؤں پکڑ کر۔ اگر وہ تمہیں کمرے میں چھوڑ گئیں تو تم کمرے میں آ سکتی ہو ورنہ اس گھر کے کسی کونے میں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں۔" شیریں اپنے بستر پر آنکھیں بند کیے قبلہ رخ بیٹھی تھی۔

"مانگو معافی آپی جی سے۔" وہ دھاڑے۔ جو ایک بار ہاتھ جوڑ لیتا ہے پھر زندگی اس سے ہاتھ جڑواتی رہتی ہے۔ اس نے کہیں پڑھا تھا۔

وہ گھٹنوں کے بل بمشکل گھسٹتے ہوئے شیریں کے بستر کی طرف بڑھی۔ آنکھوں سے آنسو جھر جھر بہہ رہے تھے۔ ان کے بیڈ کی سائیڈ پکڑ کر وہ کھڑی ہو گئی۔ زندگی میں پہلی بار اس بری طرح پٹی تھی وہ کہ خود سے نظر ملاتے بھی شرم آ رہی تھی۔ اس نے ساکت بیٹھی شیریں کے آگے جوڑ دیے، سسکیاں اس کے وجود کو ہلا رہی تھیں۔

"آپی جی وظیفہ کر رہی ہیں جب یہ فارغ ہو جائیں تو ان سے معافی مانگ لینا۔ آپی جی تمہیں کمرے میں چھوڑنے آئیں گی تو تم اندر آ سکو گی۔" وہ سنگ دلی سے کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔

پھر وہ رات قیامت سے بھی لمبی ہو گئی تھی۔ قطرہ قطرہ اس کے آنسوؤں کی طرح پگھلتی رہی مگر ختم نہ ہو پا رہی تھی۔ شیریں نے ایک پل کو بھی اپنی آنکھیں نہیں کھولی تھیں، نہ اس نے ذرا سا ہل کر اپنی نشست میں کوئی تبدیلی کی تھی۔ درشہوار کھڑے کھڑے اکڑ گئی شیریں کس بت کی طرح بستر میں نصب تھی۔ بند آنکھیں، ہلتے ہونٹ، آخر وہ تھک کر بیڈ کی سائیڈ پکڑ کر زمین پر گر گئی جیسے کچھ دیر پہلے وہ اپنی نگاہوں سے گری تھی۔

رات اس قدر طویل بھی ہو سکتی ہے۔ اسے آج تک اندازہ نہیں تھا۔ سرد خنک رات بھی جیسے اس سے انتقام لینے آئی تھی۔ نہ رات گزر رہی تھی نہ معافی کا پروانہ مل رہا تھا اور جتنی ذلت اس نے اس رات کی تاریکی میں سہی تھی۔ اس کا دل کہتا کہ کاش صبح ہو ہی نہ، وہ روشنی میں اپنا چہرہ کیسے دیکھ پائے گی۔

دور کہیں موذن کی آواز فضاؤں میں گونجی، صبح کی اذان اور دن کے اجالے میں بھی کافی وقت ہوتا ہے اور وہ وقت بھی اس کی سزا میں شامل تھا۔ سورج طلوع ہو چکا تھا جب شیریں نے جیسے زمانے بعد آنکھیں کھولیں، ان کی آنکھوں میں کیا تھا۔ درشہوار ایک پل کو بھی ان سے نگاہ نہ ملا سکی۔

"پتا چلا، برداشت کی حد کیا ہوتی ہے؟" ان کی آواز عجیب پھٹی پھٹی سی تھی۔ وہ کسی بے جان وجود کی طرح زمین پر ساکت بیٹھی تھی۔

"جاؤ اب یہاں سے۔" وہ نفرت سے بولیں۔

"آپی! آپ آئیں۔" وہ دھیرے سے سر جھکا کر بولی۔

"ہونہہ۔" وہ اٹھ کر باہر نکل گئیں تو اس نے بھی اپنے وجود کی کرچیاں سمیٹیں اور ان کے پیچھے ہولی۔

"سنبھالو اپنی اس سوغات کو۔" شیریں نے بے خبر سوئے ہوئے یوسف سے اگر بلند آواز میں کہا تو وہ یک دم اٹھ کر بیٹھ گئے۔

"اوہ صبح ہو گئی۔" یوسف نے انگڑائی لے کر احساس سے زمین سے باہر دیکھا۔ درشہوار دکھن اور ذلت کے احساس سے زمین میں گڑی جا رہی تھی۔

"تھینک یو آپی جی! آپ نے جلدی جگا دیا۔ آج مجھے جلدی جانا ہے اور آپی جی! آج پلیز حلوہ پوری اور آلو چنے کی بھجیا تو بنوائیں، بہت دنوں سے دل کر رہا ہے۔" انہوں نے ایک نگاہ غلط بھی درشہوار پر نہیں ڈالی تھی۔

"کیوں نہیں، میرا لال کہے اور میں نہ بنواؤں۔" وہ ان کا منہ چوم کر محبت سے بولیں۔

"چلو دری! تم میرے ساتھ کچن میں، نواز تو آج بھی نہیں آئے گا سب میں کر لوں گی۔ تم ذرا میرا ہاتھ بٹا دینا۔" ان کے نئے حکم پر درشہوار گرتے گرتے بچی۔

"اور ہاں، ناشتے کے بعد آج بابا کی طرف بھی جانا ہے۔ بچے کے لیے آج انہوں نے خاص دم کرنا ہے۔ چلو دیر نہ ہو جائے گڑیا!"

وہ ایک پل میں ہزار روپ بدل سکتی تھیں۔

اور یہ تو اسے کچن میں جا کر پتا چلا کہ ہاتھ بٹانا کیا ہوتا ہے۔ شیریں نے آٹا گوندھنے سے لے کر پوریاں بیلنے اور تلنے تک سب اس سے کروایا، ان کے گھر میں تو یہ ناشتا بازار سے آتا تھا۔

"واہ آپی جی! مزہ آ گیا۔ قسم سے آپ کے ہاتھ میں بہت لذت ہے۔"

یوسف چاہ چاہ انگلیاں چاٹ رہے تھے۔

''اس میں میری محبت جو شامل ہے۔ اس لیے لذت ہے۔'' وہ لگاوٹ سے بولیں۔ تو در شہوار کا جی چاہا کہ کھولتے گھی کی کڑاہی میں اپنے سر پر انڈیل لے یا اس مکار عورت کے۔



یوسف نے اسی دن بڑے آرام سے اس سے معذرت کر لی۔ اس نے معاف کر دیا مگر اس کے دل کے اندر کیا کچھ ٹوٹ گیا، اس کی خبر خود اسے بھی نہ ہو سکی تھی۔ اس واقعہ کے بعد وہ بہت زیادہ محتاط ہو گئی تھی۔ شیریں کی کسی بھی بات سے انکار یا اختلاف کرنا بالکل موقوف کر دیا۔ لڑکی شادی کے بعد کس قدر مجبور ہو جاتی ہے، اس کے اندر کون سے شعلے بھڑک رہے ہیں، اس کی بھاپ بھی منہ سے نہیں نکالتی۔ کبھی وہ اس بات کا مذاق اڑایا کرتی تھی کہ اول تو آج کل ایسی ظالم سسرال ہوتی ہی نہیں اگر ہو بھی تو کیا لڑکی کے گھر والے مر جاتے ہیں جو وہ ان سے کچھ نہیں ذکر کرتی اور یہ تو اسے اب معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ان ہی کو تو مرنے سے بچانے کے لیے سب کچھ چپ چاپ جھیل جاتی ہے۔

دانیال کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی تھی اور تیاری کے لیے دن بہت کم تھے۔ امی نے اسے ایک ہفتے کے لیے آنے کو کہا۔ شیریں نے بڑے سبھاؤ سے انکار کر دیا۔

''آنٹی! اماں کو، مجھے اور بیلا کو دری کی اس قدر عادت ہو گئی ہے کہ آپ کو بتا نہیں سکتی۔ دری تو اس گھر کی رونق ہے۔ یہ ادھر ادھر ہو جائے تو میرے دل کو کچھ ہونے لگتا ہے۔ ہاں یہ ایک دن چھوڑ کر صبح یوسف کے ساتھ آپ کی طرف آ جایا کرے گی شام کو یوسف اسے واپسی پر لے آیا کریں گے۔'' وہ اتنے پیار سے مٹھار مٹھار سے بول رہی تھیں کہ امی مان گئیں۔

''میری بچی کو خدا جانے کس نیکی کا اتنا اچھا صلہ مل رہا ہے ورنہ آج کل نندیں۔''

امی شیریں کے سامنے ہی بولیں۔

''آنٹی! میں کوئی دری کی نند ہوں، یہ تو میری بیلا جیسی ہے۔'' انہوں نے دری کو اپنے ساتھ لگا لیا۔

''اگر کبھی میں کسی کو شیریں کا اصلی چہرہ دکھانے کی کوشش کروں گی تو کوئی یقین نہیں کرے گا۔''

ب وہ اکثر امی کی طرف جانے لگی مگر شیریں نے بابا جی کے در پر حاضری کو بھی ضروری کر دیا۔ وہ اسے ہفتے میں تین بار ادھر لے کر جاتیں، باری آتے آتے بھی گھٹنے لگ جاتے۔

وہ اپنی پرابلمز اب کسی سے بھی شیئر نہیں کر سکتی تھی۔ یوسف شیریں کے معاملے میں اس کے ساتھ بالکل بے حس تھے، اس دن کے بعد وہ خود ہی بہت محتاط ہو گئی تھی۔

آفاق بھائی اور علینہ آپی کل ہی آئے تھے یما کا اب بار بار آنا مشکل تھا، اس کی ڈلیوری کے دن قریب تھے۔ امی نے ہی آنے سے منع کر دیا تھا۔ وہ آج کل دانیال کی اکلوتی بہن بنی ہوئی تھی۔ آج مایوں کا فنکشن تھا اور ابھی تک اس کا آنا جانا لگا ہوا تھا۔

''دری! خدا کے لیے اب تو تم آ جاؤ۔ ابھی تم ادھر ہوتی ہو ابھی سسرال، سب چیزوں کا علم تمہیں ہے۔ اب مجھے دقت ہوتی ہے سب سنبھالنے میں۔'' امی نے اسے ڈانٹا۔

''اچھا امی! شام کو آ جاؤں گی۔ ابھی آپی نے پیغام بھیجا ہے کہ فوراً گھر پہنچوں، کوئی ضروری کام ہے۔ شام کو انشاء اللہ آ جاؤں گی۔'' وہ انہیں ٹال کر نکل آئی یوسف اسے لینے آئے تھے۔

''آپی جی! آپ نے بلوایا تھا۔'' وہ لاؤنج میں بیٹھی شیریں کو سلام کر کے بولی یوسف بھی وہیں بیٹھ گئے۔

''ہاں بیٹھو......'' وہ ان کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

''دیکھو دری! یوسف مجھے اس دنیا میں سب سے عزیز ہے، بیلا سے بھی بڑھ کر اور میری دلی تمنا ہے، اس کے گھر آنگن میں پھول کھلے مجھے دوسرا یوسف مل جائے، اس گھر کے نصیب جاگ اٹھیں۔'' وہ جانے کس لیے یہ تمہید باندھ رہی تھیں۔ اسے الجھن ہونے لگی۔

''میں صبح بابا جی کی طرف آ گئی تھی۔ انہوں نے سختی سے منع کیا ہے کہ آج سے لے کر ایک ہفتہ تک تم گھر سے نہ نکلو ورنہ کسی نہ کسی بڑی آفت کا شکار ہو جاؤ گی اور بابا جی کا کہا پتھر پر لکیر ہوتا ہے۔ کبھی غلط نہیں ہوتا۔''

''کیا مطلب......'' اس کے ہوش اڑنے لگے۔

''بھئی، مطلب کیا۔ آج سے لے کر اگلے ہفتے تک تم گھر سے باہر قدم نہیں رکھو گی۔ بات ختم......'' وہ کچھ خفگی سے بولیں تو یوسف بھی حیرت سے شیریں کا منہ تکنے لگا۔

''م..... مگر..... میں تو ابھی شام کو جا رہی ہوں۔ آج وانی کا مایوں ہے۔'' اس کا رنگ فق ہو رہا تھا۔

''تو کیا ہوا، تمہیں اپنے بھائی کی خوشیاں عزیز ہیں تو مجھے بھی ہیں۔'' وہ بے دردی سے چمک کر بولیں۔

''مگر..... مگر آپی جی! یہ کیسے ممکن ہے۔ یوسف آپ.....'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے جنہیں روکنا اس کے لیے مشکل تھا۔

''آپی جی! ایسا کرتے ہیں، میں درشہوار کو ادھر چھوڑ آتا ہوں پھر یہ ادھر سے باہر نہیں نکلے گی۔ گھر میں ہی رہے گی۔'' یوسف نے فوراً تجویز پیش کی۔

''نہیں۔ بابا جی نے اس گھر کا کہا ہے، اس کے اپنے گھر کا۔ اچھی طرح سوچ لو۔ میں تمہیں بابا جی کے حکم کے برعکس نہیں کرنے دوں گی۔ یہ میرا فیصلہ ہے اور اگر تم حکم عدولی کرو گے تو اس کی سزا پاؤ گے۔'' وہ سنگ دلی سے کہہ کر چلی گئیں۔

''یوسف.....'' وہ یوسف کو دیکھ کر بے اختیار رونے لگی تو وہ کچھ سوچنے لگے۔

''اوکے ریلیکس..... میں تمہیں لے جاؤں گا۔ تم پریشان نہ ہو میں بابا جی سے مل کر کوئی اور راہ نکالوں گا۔ تم اپنی پیکنگ مکمل کرو۔ دوپہر کا کھانا کھا کر چار بجے کے قریب میں تمہیں چھوڑ آؤں گا۔'' یوسف نے اس کے جھکے سر پہ پیار کیا تو اس کے دل کو جیسے قرار آ گیا۔

''یوسف! لے جائیں گے نا۔ ورنہ وانی کیا سوچے گا وہ تو میرا دوست ہے۔'' وہ کچھ بے یقینی سے بولی۔

''ارے تم ضرور جاؤ گی، میں نے جو کہا ہے۔ چلو تم جا کر پیکنگ کرو میں آپی جی کو منانے کی کوشش کرتا ہوں۔'' تو وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی، بیلا اس کے کمرے سے نکل رہی تھی۔

''ارے مامی! آپ کب آئیں۔ اصل میں میرے بیڈ روم کا اے سی کولنگ نہیں کر رہا، کوئی فالٹ آ گیا ہے۔ مجھے نیند آ رہی تھی میں آپ کے بیڈ روم میں آ کر سو گئی آپ نے مائنڈ تو نہیں کیا۔'' اس کی آنکھیں شاید زیادہ سونے سے ابھی بھی سرخ ہو رہی تھیں۔

''کوئی بات نہیں، ویسے اب اے سی کا موسم نہیں رہا۔'' اس نے جتا کر کہا۔

''اوہ مامی! بہت گرمی لگتی ہے مجھے میں تو دسمبر میں اے سی آف کرتی ہوں۔'' کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف مڑ گئی۔

''پاگل ماں جیسی۔'' وہ بڑبڑائی۔

شام تک اس کی تیاری مکمل ہو گئی، تو یوسف شیریں کے پھولے منہ کی پروا کیے بغیر اسے چھوڑنے چلے آئے۔

وہ گھر جانے والی سڑک کی طرف مڑے ہی تھے کہ اسے اچانک یاد آیا۔

''اوہ یوسف! میں نے جیولری تو لی ہی نہیں۔ کپڑے رکھنے ہی میں اپنا ٹائم لگ گیا۔''

''بہت کیئرلیس ہو تم، اب واپس جانا پڑے گا اور آپی جی کا موڈ ویسے ہی خاصا آف ہے۔'' وہ جھنجھلا کر بولے۔

گھر پہنچ کر وہ دونوں سیدھا اپنے بیڈ روم کی طرف گئے۔ گھر میں مکمل خاموشی تھی۔ یوسف جا کر صوفے پر بیٹھ گئے۔

''اب جلدی کرو۔'' اس نے الماری کھول کر اندرونی کیبنٹ سے لاکر کی چابی نکالی۔ نیچے بیٹھ کر لاکر کھولا اور زیور کے ڈبے باہر نکالنے لگی۔

''سب لے کر جاؤ گی۔'' یوسف نے پوچھا۔

''تقریباً.....'' اس نے تمام ڈبے باہر نکال لیے۔

''کسی ایک بڑے ڈبے میں سارا زیور رکھ لو یا کوئی بیگ لے لو۔'' یوسف نے اسے مشورہ دیا۔ اس نے الماری سے چھوٹا سا بیگ لیا اور ڈبے کھولنے لگی ایک دو تین.....

''یوسف.....!'' اس کی چیخ نکل گئی۔

''اب کیا ہوا.....'' وہ جھنجھلا کر بولے۔ دھیان تو شیریں کی ناراضی کی طرف لگا ہوا تھا۔

''ز..... زیور..... ر..... کچھ بھی نہیں، سب ڈبے خالی ہیں۔'' وہ آنکھیں پھاڑے ڈبے کھولتی جا رہی تھی۔

''واٹ.....'' وہ اٹھ کر اس کے پاس آ گئے۔ ''کدھر گیا سب؟''

''یوسف! آئی ڈونٹ نو یوسف! میرا زیور.....'' وہ رونے لگی۔ اگلے چند منٹوں میں شیریں اور بیلا بھی آ گئیں۔

''کہا تھا میں نے منع کیا تھا بابا جی کی حکم عدولی کرو گی تو کسی بڑی آفت کا شکار ہو جاؤ گی۔'' شیریں نفرت سے ہونٹ سکوڑ کر بولیں۔

''آپی جی! یہ وقت ان باتوں کا نہیں، تمام زیور کچھ بھی نہیں بچا، آخر کون لے گیا۔'' یوسف پریشانی سے کمرے میں ٹہلنے لگے۔ ''کوئی گھر کا بھیدی گھر، کا بندہ لگتا ہے۔''

''گھر کا بندہ، کہہ دو، میں ہوں، میری بچی، میری اماں اور اس گھر میں غیر کون ہے۔ ہم ہی تو ہیں چور بچے۔ اس لینڈ لیڈی کے ہیرے جواہرات پر نظر رکھنے والے۔ ہائے میرے اللہ یہ دن بھی مجھے دیکھنا تھا۔ میرا یوسف مجھے چور کہے گا۔ یہ کل کی چھوکری مجھے چور کہے گی۔''

''ایسا کچھ نہیں کہا میں نے جو آپ ڈرامہ کر رہی ہیں۔'' وہ پہلے ہی الجھی ہوئی تھی ان کے ناٹک نے اسے اور آگ لگا دی۔

''میں ڈراما کر رہی ہوں، میں ڈراما کر رہی ہوں۔ میں چور ہوں۔ میں نے ڈاکہ ڈالا ہے ارے یوسف! پولیس کو بلواؤ، مجھے ہتھکڑی لگواؤ۔ مجھے پھانسی پر چڑھا دو۔'' وہ زمین پر مچل مچل کر رونے لگیں۔ سینے پر دو ہتھڑ مار کر سینہ کوبی کرنے لگیں۔ یوسف کے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

''آپی جی! آپی جی!'' وہ انہیں سنبھالنے لگے۔

''مت چھوؤ مجھے، میں چور ہوں، میرا بچہ مجھے چور کہتا ہے۔ میں اس میں غرق ہو جاؤں۔'' ان کی آواز کا والیوم بند ہوتا چلا گیا۔

''مامی! آپ کو شرم آنی چاہیے مما کو ایسا کہتے ہوئے۔'' ماں کی حالت دیکھ کر بیلا درشہوار پر چڑھ دوڑی۔

''مجھے ہی کیوں شرم آنی چاہیے۔ نقصان بھی میرا ہوا۔ شرم بھی مجھے آنی چاہیے۔ انہوں نے یہ سب کیا ہے۔ وہ کیوں نہ شرم کریں۔'' وہ بھی تلخی سے بولی۔

''ہاں ہاں، صاف کہو، ہم نے کیا ہے۔ ہم نے......'' شیریں کے منہ سے جھاگ نکلنے لگی اور اگلے پل وہ ہاتھ پاؤں چھوڑ کر بے ہوش ہو چکی تھیں۔

''آپی جی! آپی جی! بیلا پانی لے کر آؤ۔ آپی جی! آئی ایم سوری، میں ایسا زیور دس بار آپ پر قربان کر دوں، آپی جی ہمیں معاف کر دیں آپ ہوش تو کریں۔ اب بھی آپ

کی حکم عدولی نہیں کروں گا۔'' وہ ان کے پاؤں پکڑ کر گڑگڑا رہے تھے۔ درشہوار نے نفرت سے زمین پر پڑی اس ناگن کو دیکھا جو اس کی زندگی کی ساری خوشیاں ایک ایک کر کے نگل رہی تھی۔

''دری! آپی جی سے معافی مانگو۔ پاؤں پکڑو ان کے۔'' شیریں کے ذرا ہوش میں آتے ہی یوسف نے چلا کر کہا۔ ''اور اب تم کہیں نہیں جاؤ گی اس گھر سے باہر۔ جب تک آپی جی نہیں کہیں گی۔'' وہ تو پورا کا پورا بدل چکے تھے۔

''میں کس بات کی معافی مانگوں۔'' اسے تو غصہ کرنا بھی نہیں آ رہا تھا۔

''سب باتوں کی جو تم نے کہیں۔ اور بیلا! ڈرائیور سے کہو، گاڑی سے سوٹ کیس اتار لائے۔''

''ہرگز نہیں، میرے بھائی کی شادی ہے۔ میں ضرور جاؤں گی۔'' اسے آگ ہی تو لگ گئی۔

''میں نے کہا، تم نہیں جاؤ گی۔ آپی جی سے معافی مانگو۔'' یوسف نے اس کے مقابل آن کھڑے ہوئے۔

''میں جاؤں گی اور اب بھی معافی نہیں مانگوں گی اس مکار عورت سے۔'' ابھی الفاظ اس کے منہ میں تھے۔

''شٹ اپ......'' یوسف کا زوردار تھپڑ اسے چکرا گیا۔

''یوسف! میرے بچے مت الجھو اس سے، چھوڑ دو جانے دو اسے جا کر۔'' شیریں کی آواز بے حد نحیف ہو چکی تھی۔

''نہیں آپی جی! یہ نہیں جائے گی۔'' وہ فیصلہ کن انداز میں چبا چبا کر بولے۔

''میں جا رہی ہوں مسٹر یوسف!'' اس دو رخ سے، انڈر اسٹینڈ'' وہ جارحانہ انداز میں باہر کی طرف بڑھی۔

''اگر تم جاؤ گی تو پھر اس گھر میں قدم نہیں رکھو گی۔'' یوسف کی للکار اس کا خون خشک کرنے کے لیے کافی تھی۔ وہ ایک پل کو رکی۔ مڑ کر یوسف کو دیکھا۔

''میں جا رہی ہوں، خدا حافظ۔''

○

شادی کب ہوئی، کہاں ہوئی اسے کچھ خبر نہ تھی۔ مہندی کی شام ہی اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔ سارے خاندان کے ہاتھ ایک انوکھی خبر آ گئی۔ ایک تو یوسف اور اس کے گھر والوں کی غیر حاضری، دوسرے درشہوار کی حالت بہت کچھ کہہ رہی تھی۔ شادی کا سارا مزہ گھر والوں کے لیے کرکرا ہو گیا، دانیال تو دولہا بننے کے لیے بھی تیار نہیں تھا کہ جب تک دری کو ہوش نہیں آ جاتا۔ وہ بارات لے کر نہیں جائے گا۔ وہ اڑ گیا تھا۔ اس کی عزیز از جان بہن ہوش و خرد سے بیگانہ پڑی تھی اور وہ دولہا بن کر چل پڑتا۔

"امی! مجھے مجبور مت کریں آپ، اگر دری کو خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو میں خود کو بھی معاف نہیں کر سکوں گا۔"

پورے اٹھارہ گھنٹے بعد اسے ہوش آیا۔ آدھے پونے گھنٹے میں اس کی حالت کافی بہتر تھی۔

"بھائی! میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ دانی سے کہیں، تایا جی پریشان ہو رہے ہوں گے۔ آپ لوگ بارات لے کر جائیں۔" وہ نقاہت زدہ لہجے میں آفاق سے بولی۔ ایک ہی رات میں وہ برسوں کی بیمار دکھنے لگی تھی۔ امی تو اسے دیکھ دیکھ کر روئے جا رہی تھیں۔

"وہ ضد پر اڑا ہوا تھا کہ تمہارے بغیر نہیں جائے گا۔"

"چلیں پھر میں چلتی ہوں۔" وہ اٹھنے لگی۔

"لیٹی رہو، کچھ اور کرنا ہے۔" وہ اسے ڈانٹ کر بولے۔

"بھائی! میں اسے میرج ہال تک چھوڑ آؤں پھر آپ کے ساتھ ہی واپس آ جاؤں گی۔ اسے دولہا بنے دیکھنا میری کتنی بڑی خواہش ہے۔ آپ کو نہیں معلوم پھر آپی بھی ادھر نہیں ہیں اب میں ٹھیک ہوں نا۔"

دانیال کی شادی میں وہ اس طرح شرکت کرے گی، یہ تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

"بارات آدھی رات کو روانہ ہوئی تو وہ دانیال کے ساتھ تھی۔ یوسف شادی میں آئے، نہ ان کی کوئی اطلاع اور اس بات کا اسے اندازہ تھا گھر والے سوال کر کر کے تھک گئے۔ اس کی ایک چپ۔

شادی گزر گئی۔ ہنگامے سرد پڑ گئے تو وہ اپنے کمرے میں مقید ہو گئی اداکاری کرتے

کرتے بھی تھک گئی تھی۔ چپ چاپ کمرے میں لیٹی رہتی نہ کسی سوال کا جواب نہ کسی کی طلب وہ تو سراپا سوال بن گئی تھی۔

"بیٹا! آخر کچھ تو بتاؤ تم نہ ان لوگوں سے بات کرنے دیتی ہو نہ خود کچھ بتاتی ہو۔ آج شادی گزرے بھی مہینہ ہونے لگا۔ اس طرح کیسے چلے گا دیکھو تمہارے ڈیڈی بھی کس قدر پریشان ہیں۔ کچھ تو سوچو۔" تایا جی اور ڈیڈی اس کے سامنے بیٹھے تھے۔ امی اس کے سر ہے۔

"سوچ لیا ہے تایا جی!" وہ دھیرے سے بولی تو تینوں اس کا منہ دیکھنے لگے۔

"میں خلع لینا چاہتی ہوں۔ آپ میرا کیس فائل کریں اور یوسف کو خلع کا نوٹس بھجوائیں۔ اگر آپ میرا کیس نہیں لیں گے تو میں کسی اور وکیل کے پاس چلی جاؤں گی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے کہ مجھے اب اس گھر میں نہیں جانا اور کوئی مجھ سے سوال نہیں کرے گا۔" وہ بہت سوچ سوچ کر بول رہی تھی۔

"کیا بکواس......" ڈیڈی دھاڑے مگر اگلے پل خود پر قابو پانے لگے۔

"بیٹا! تم کیا کہہ رہی ہو۔"

"ڈیڈی! سوال ہیں، اگر کوئی سوال کرے گا تو میں یہ گھر بھی چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ کہیں بھی خدا کی قسم۔"

سب کو معلوم تھا کہ وہ قسم کے سخت خلاف ہے کہ قسم کھانے والے جھوٹے ہوتے ہیں مگر یہ قسم اس کے ارادے کی پختگی کی علامت تھی۔ پھر سب نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر اس کی ایک ہی دھمکی سب کو چپ کرا گئی۔

پھر یوسف کو خلع کا نوٹس بھجوا دیا گیا۔

پندرہ دن بعد کورٹ سے ڈیٹ ملی۔

سارے خاندان میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں مگر اسے جیسے کسی بات کی پروا نہیں رہی تھی۔ وہ سب سے لاتعلق ہو گئی تھی۔

وہ پہلی بار تایا جی کے ساتھ فیملی کورٹ گئی۔ بڑی سی چادر میں اپنا وجود ڈھانپے کورٹ کے دوسرے کٹہرے میں یوسف کھڑے تھے اس نے ایک پل کو بھی یوسف کو نہ دیکھا۔ اس کے احساسات پر جیسے برف جم گئی تھی۔

''مس ورشہوار! آپ علیحدگی کیوں چاہتی ہیں؟'' وکیل جرح کا پہلا سوال ہی اسے پریشان کرنے کے لیے کافی تھا۔

''میں ان کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔'' اسے اپنی آواز سنائی نہیں دی۔

''وہی تو میں پوچھ رہا ہوں، کیوں؟'' وہ اپنے سوال پر زور دے کر بولا۔

''کیا اس سوال کا جواب دینا ضروری ہے۔''

''یس، ضروری ہے، کیا یہ آپ کو مارتے پیٹتے ہیں؟'' اس نے سوال کا کان مروڑا: اس کی نگاہوں میں اس پتھریلی رات کا منظر گھوم گیا۔

''نہیں......''

''آپ کا نان نفقہ پورا نہیں کرتے؟''

''نہیں......''

''کیا یہ ازدواجی حقوق پورے نہیں کرتے۔'' اس کی نظریں جھک گئیں۔ جواب کے لیے زبان نہ مل سکی۔

''خاتون! میں پوچھ رہا ہوں، کیا آپ کو آپ کا ازدواجی حق نہیں دیتے؟''

سوال اور کھل گیا۔ اس کی ہتھیلیاں پسینے سے تر بتر ہو گئیں۔ بدن ہولے ہولے کپکپانے لگا۔ اس نے تایا جی کی طرف دیکھا جو اسے ہی خفگی سے دیکھ رہے تھے۔ گھر سے تو اس کیساتھ کوئی بھی نہیں آیا تھا۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ بہت مدھم لہجے میں بولی۔ وکیل صاحب سوال کرتے رہے۔ اس کے ہوش اڑتے رہے اور جب وہ کورٹ سے باہر آئی تو رو دینے کو تھی۔

''تایا جی! خلع کا اور کوئی سیدھا سا طریقہ نہیں؟'' راستے میں ونڈ اسکرین کو گھورتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''یہی سیدھا سا طریقہ ہے؟'' وہ چبا چبا کر بولے۔ باقی کا رستہ خاموشی سے کٹا۔ وہ گھر میں داخل ہوئی تو کسی نے اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ اسے خود چکر سے آ رہے تھے۔ وہ وہیں لاؤنج کے صوفے میں پر ڈھیر ہو گئی۔

''کھانا لاؤں تمہارے لیے؟'' امی اجنبی سا انداز لیے کھڑی تھیں۔

''نہیں۔ پانی دے دیں۔'' اس کی آواز پاتال سے آئی۔ امی پانی کا گلاس لے

آئیں۔ وہ گلاس پکڑنے کے لیے اٹھی تو زور سے چکر آیا اور وہ دوبارہ صوفے پر گر گئی۔

''کیا ہوا۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری؟'' امی گھبرا گئیں ''تمہارے ڈیڈی کو بلاتی ہوں۔'' اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔ ڈیڈی آج کلینک نہیں گئے تھے۔ وہ سٹیتھو اسکوپ لگائے اسے چیک کرنے لگے۔

''آؤ میرے ساتھ۔'' وہ چیک کرنے کے بعد امی سے بولے۔ وہ دونوں اندر چلے گئے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر پانی کا گلاس اٹھایا اور ایک ہی سانس میں چڑھا گئی۔ پندرہ دن بعد پھر وہی ذلیل کر دینے والے سوالات، اور میرے خدایا، میں دوبارہ ادھر کیسے جاؤں گی۔ میرے اللہ مجھے ذلت سے بچا لے۔'' وہ سر ہاتھوں میں تھام کر بیٹھ گئی۔

''ورّی! میرے بچے۔'' امی اس کے پاس آ کر بیٹھ گئیں اس کے ہاتھ چومنے لگیں۔

''سمجھ میں نہیں آتا، مبارک باد دوں یا......''

وہ چپ ہو گئیں، اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔ ابھی تو کیس اسٹارٹ ہی ہوا ہے اگر فیصلہ اس کے حق میں ہوتا تو بھی امی اسے کبھی مبارکباد نہ دیتیں۔

''تم پریگننٹ ہو۔'' امی اسے اپنے ساتھ لگا کر بولیں۔

''اب جو بھی فیصلہ کرو، سوچ سمجھ کر کرو۔ اللہ نے دوسری جان بھی تمہارے ساتھ لگا دی ہے۔ اور میری بچی! تم مجھ سے اس قدر دور کب ہو گئیں کہ اب مجھ سے کچھ بھی شیئر نہیں کرتیں۔ ماں سے بڑا دوست اور کون ہوتا ہے۔ کچھ تو بتاؤ مجھے۔ اپنے جی کا بوجھ ہلکا کرو۔''

وہ اسے اپنے ساتھ لگائے کہہ رہی تھیں۔ اس کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جھر جھر بہنے لگے۔ اس نے پہلی برات سے لے کر آخری ذلت تک سب ان کے گوش گزار کر دیا۔

''میری بچی! تم نے اتنا کچھ برداشت کیا اور کسی سے کچھ نہ کہا۔'' وہ خود بھی رونے لگیں۔

''اچھا مت روؤ۔ اب چپ کرو پھر اس موضوع پر بات کریں گے۔ تم اب ریسٹ کرو، میں کھانا تمہارے کمرے میں بھجواتی ہوں، اب کچھ نہیں سوچنا اور اٹھو ادھر سے اندر جا کر ریلیکس ہو کر لیٹو۔'' وہ اسے تھام کر بیڈروم تک لے آئیں۔

"یہ کیسی خوشی ہے جو میں اس کے حقدار سے شیئر بھی نہیں کر سکتی۔" وہ بے بسی سے لیٹی فون کو دیکھتی رہی۔

"پھر ایک دو ۔۔۔۔ تین کتنے سارے دن گزر گئے۔ امی نے اس سے اس موضوع پر پھر کوئی بات نہ کی۔

ہاں اس کے کھانے پینے کا خاص دھیان رکھنے لگیں۔ دوسری ڈیٹ جوں جوں قریب آ رہی تھی۔ اس کا خون خشک ہو رہا تھا۔ اس کا خیال تھا، طلاق ہی سب مسئلوں کا حل ہے اور طلاق لینا بہت آسان کام ہے۔ وہ فون کے پاس ہی بیٹھی سوچوں میں گم تھی، جب ہی فون کی گھنٹی بجی۔

"تم اگر سمجھتی ہو کہ تم اس طرح عدالت میں جا کر ہم سے پیچھا چھڑا لو گی تو یہ تمہاری بھول ہے۔ اب کو جو عمل بابا جی نے کیا ہے۔ تم ناک رگڑتی ہمارے در پر آؤ گی اور تمہیں کہیں پناہ نہ ملے گی۔ یاد رکھنا یہ شیریں کے الفاظ ہیں۔"

انہوں نے کہہ کر فون بند کر دیا۔ ان کے لہجے میں زمانے بھر کی نفرت تھی۔ عجب سا خوف کا احساس اسے جکڑنے لگا۔ یہ عورت جو کہتی ہے وہ پورا ہو کر رہتا ہے۔ وہ اس بات سے بے حد ڈری ہوئی تھی۔ وہ بے چین سی ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔ اس سے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا گیا۔ شام کو دادو اس سے خفا ہو کر گئی تھیں کہ اس نے خاندان کی ناک کٹوا دی ہے ابھی دادو کی باتوں کا بوجھ کم نہیں ہوا تھا کہ شیریں کا فون۔۔۔۔۔۔ وہ کمرے میں جا کر لائٹ آف کر کے لیٹ گئی۔ امی کچھ دیر بعد اس کا پتا کرنے آئیں۔ اسے سوتا دیکھ کر دروازہ بند کر کے چلی گئیں۔

وہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے چھت کو دیکھتی رہی۔

"کیا سب کچھ اس عورت کے قبضہ قدرت میں ہے۔ کیا خدا کچھ بھی نہیں؟" سوچ تھی کہ بچھو کا ڈنک، وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر سوچتی رہی پھر اٹھ کر واش روم میں چلی گئی۔

یخ پانی سے وضو کر کے وہ جائے نماز پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ کتنے عرصے سے نماز پابندی سے پڑھنا چھوڑ رکھی تھی۔ اب ساری کوتاہیاں یاد آ رہی تھیں، نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔

"میرے اللہ! میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سا عمل میرے لیے بہتر ہے، میں

کیا کروں، کدھر جاؤں، مجھے صحیح راستہ دکھا۔ اگر اس گھر جاتی ہوں تو شرک کرنے والوں کی ماننی پڑتی ہے جو سب کچھ جانتے بوجھتے تیرے سوا کسی اور کے در سے جا کر مانگتے ہیں تو نے سے شرک کہا ہے اور جو تیری یکتائی سے آگاہ ہے پھر بھی شرک کرنے والوں کے ہاتھ نہیں روکتا۔ تیری وحدانیت کا اقرار کرتا ہے، پھر بھی جھوٹے خداؤں کی پوجا کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے۔ کیا ایسے شخص کے ساتھ میرے لیے زندگی گزارنا جائز ہے۔ میں بھی تو کوئی بہت نیک، بہت تجھ سے محبت رکھنے والی نہیں مگر میرے اللہ تو جانتا ہے، میں نے دانستہ کبھی کسی کو تیری یکتائی میں شریک نہیں کیا۔ جو مانگا تجھ ہی سے مانگا تجھ ہی سے پایا اور جو نہیں ملا اسے تیری مصلحت جانا اور اگر اللہ تعالیٰ جی میں یہ باتیں لوگوں کو، اپنے خاندان والوں کو بتاؤں تو وہ میرا مذاق اڑائیں گے کہ تم خود کہاں کی پارسا ہو۔ پرہیزگار۔ یہ بابے، یہ پیر فقیر تو اب ہماری زندگی کا حصہ بنتے جا رہے ہیں، کوئی بھی اس راہ کو برا نہیں سمجھتا۔ مزاروں پہ جانا، چادریں چڑھانا، منتیں ماننا، دعائیں کرانا، جانوروں کو بھینٹ چڑھانا۔ یہ تو روز کا معمول ہے لوگ بزرگوں کی قبروں پر جا کر سجدے میں رگڑ رگڑ کر دعائیں مانگتے ہیں اور کوئی انہیں نہیں روکتا۔ کہ جس سے مانگتا ہے وہ تو تمہاری شہ رگ سے بھی قریب ہے۔

اے اللہ! میری مدد کر، مجھے سیدھا سچا راستہ دکھا، وہ کہتی ہے، میں اس کے در پہ ناک رگڑتی آؤں گی۔ اے اللہ مجھے بتا سب سے برتری کس کی ہے، تیرے فیصلہ کو بدل نہیں سکتے۔ یہ تیرا وعدہ ہے۔" وہ سجدے میں گڑگڑانے لگیں۔

"تو خود فرماتا ہے، جادو بھی تب اثر کرتا ہے اگر میں چاہوں، اللہ اپنی جناب سے میرے بارے میں نیک فیصلہ فرما دے۔ میری سچائی ثابت کر دے اگر میں غلطی پر ہوں تو مجھے ہدایت دے اگر میرا شوہر غلطی پر ہے اسے ہدایت دے۔ اللہ میں اس سے جدا بھی نہیں ہونا چاہتی۔ تجھے اس ننھی سی جان کا واسطہ دیتی ہوں جس کا سانس تو نے میرے اندر ڈالا ہے۔ ہم دونوں کے حال پر رحم فرما۔ مجھے تیرے سوا کسی سے نہ کچھ کہنا ہے، نہ مانگنا ہے یہ میرا خود سے عہد ہے۔ میری اس عہد کی پاسداری فرما۔ رحم فرما، رحم فرما۔۔۔۔۔۔" وہ روئے جا رہی تھی۔



اگلے روز صبح ہی سے بارش ہو رہی تھی۔ سرما کی پہلی بارش جس سے ٹھنڈ بڑھ گئی تھی۔ وہ صبح سے ہی ناشتہ کرنے کے بعد پھر آ کر اپنے کمرے میں مقید ہو گئی تھی۔ شام تک

دانیال اور راحمین نے بھی اسلام آباد سے آ جانا تھا۔ اس کا کیس نئے سرے سے ڈسکس ہونا تھا۔ اس کی طبیعت بہت بجھی بجھی سی تھی۔ پتا نہیں کیا ہوگا پرسوں کورٹ میں۔

"بی بی! آپ کا فون ہے۔" شریفاں نے کمرے میں جھانک کر کہا۔

"کس کا فون ہو سکتا ہے۔" اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔

"ہیلو السلام علیکم۔" کوئی اجنبی آواز تھی۔

"وعلیکم السلام۔"

"آپ... درشہوار ہیں؟"

"جی......!" وہ پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔

"جی میں یوسف صاحب کا وکیل اسلم خان بات کر رہا ہوں، میرا کلائنٹ آج شام کو چار بجے میرے آفس میں آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ کیس کے سلسلے میں آپ سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتے ہیں، اور آپ ان سے ملنے پر تیار ہوں تو میں آپ کو آفس کا ایڈریس سمجھاؤں۔" وہ ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔

"وہ فون پر مجھ سے بات کر سکتے ہیں۔" وہ کچھ دیر بعد بولی۔

"لیکن جو بات وہ آپ سے کہنا چاہتے ہیں وہ فون پر کرنے والی نہیں۔" وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"اوکے کہاں ہے آپ کا آفس؟"

"آپ کو تنہا آنا ہوگا۔" وہ ایڈریس اسے سمجھا کر آخر میں بولا تو اس نے اوکے کہہ کر فون بند کر دیا۔

"یوسف اب مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں، اب مصالحت کی کوئی نئی راہ آپی جی کو منانے کے لیے کوئی نئی معافی اونہہ!" وہ شام تک کڑھتی رہی۔

آفس زیادہ دور نہیں تھا، وہ رکشے میں بیٹھ کر پہنچی تھی۔ "ذرا مارکیٹ تک جا رہی ہوں۔" امی سے کہہ کر آئی تھی، یہ بات اصولاً درست نہیں تھی کہ جب کیس کورٹ میں چل رہا ہے، وہ یوں اس سے ملنے چلی آئی ہے۔ تایا جی کو پتا چلے تو وہ بہت خفا ہوں۔ مگر ان سب سے بڑھ کر اسے ڈیڈی اور امی کی چپ اندر ہی اندر مارے دے رہی تھی۔ دادو کا اسے سب کے سامنے بری طرح لتاڑنا، پھپھو کا غصہ اور سب سے بڑھ کر تائی کا طعنہ۔

"بڑا شوق تھا ہماری دیورانی کو جھٹ پٹ بیٹی کو اونچی جگہ بیاہنے کا۔ ادھر میں نے عمران کی بات طے کی اور ادھر وہ پیر جلی بلی کی طرح تلملانے لگیں۔ دیکھ لیا جلد بازی کا انجام۔ پہلے عمران کی بھی شازہ سے نبھنی مشکل ہے۔ اگر دونوں کا نباہ نہ ہو سکا اور درشہوار بی بی بھی فارغ ہو گئیں کورٹ میں تو چلی ہی گئی ہیں تو کیا پتا پھر سے دونوں کے ستارے مل جائیں کیوں ...مین کے ڈیڈی؟"

تائی جی کی اس بے ہودہ پلاننگ کے پنپنے سے پہلے وہ مر جانا پسند کرتی۔

"طلاق لے کر کیا کرو گی؟" پرسوں رات امی نے اس سے پوچھا، تو اس نے سر جھکا لیا۔ بس ناخن کھرچتی رہی۔

"تمہاری اتنی عمر بھی نہیں کہ میں تمہیں گھر بٹھا سکوں۔" دوسرا تیر۔

"اور اگر دوسری جگہ بیاہنے کا سوچوں گی تو اس بچے کا کیا کرو گی، جو ابھی اس دنیا میں آیا نہیں۔ ایک سوال بن گیا ہے۔ کون اسے قبول کرے گا۔ باپ لے گیا تو ساری عمر کا کانٹا دل میں چبھ جائے گا۔" وہ تابڑ توڑ اسے تلخ حقائق سنائے جا رہی تھیں۔

"دیکھو دری! دو رستوں میں سے ایک کا انتخاب کر لو۔" وہ اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھ کر بولیں۔

"یا تو خلع نہ لو اگر مصلحت کی کوئی راہ نکلتی ہے تو نکال لو۔ شیریں کے اعمال اس کے ساتھ، یوسف کب تک اس کی انگلی پکڑ کر چلے گا۔ کل کو ایک دو بچے ہو گئے تو خود ہی ان میں مگن ہو جائے گا۔ ساس ذہنی مریضہ ہے، ویسے بھی یوسف اس کی خدمت کے لیے تمہیں مجبور نہیں کرتا۔ بھلا چند ایک سالوں میں اپنے گھر کو چلی جائے گی۔ ایک دو سال شیریں کی سختیاں جھیل لو سب کے ساتھ ایسے ہی ہوتا ہے۔ شروع کے پانچ دس سال جوائنٹ فیملی میں اسی طرح مشکل گزرتے ہیں اور اگر اکیلے ہوں تو اس کی مشکلیں بھی علیحدہ ہیں۔ پھولوں کی سیج پر کوئی ساس نند نہیں بٹھاتی۔ بچہ ہو جائے گا تو آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بچہ تمہاری ڈھال بن جائے گا۔ پیر جما دے گا تمہارے اس گھر میں سوچ، ہمیں بھی بدنامی سے بچاؤ اور خود کو بھی اور آنے والے بچے کو بھی۔ ورنہ یہ دنیا بھولنے والی نہیں۔ ہر طعنے کو بڑے وقت پر استعمال کرتی ہے۔ اور تم تو میری سمجھدار بیٹی ہو۔ سمجھ رہی ہو نا سب۔"

امی نے ذرا جھک کر اس کے دھواں ہوتے چہرے کو دیکھا، آنسو ٹپ ٹپ اس کی

بند مٹھیوں پر گر رہے تھے۔ ناک کی نوک انار کے دانے کی طرح دہک رہی تھی۔

"چند دنوں کا رونا، ساری عمر کے رونے سے بچا لے گا۔"

"اور دوسرا راستہ؟" وہ بولیں تو وہ سر اٹھا کر بھیگے چہرے کے ساتھ ان کو دیکھنے لگی

"ابھی تو زیادہ ٹائم نہیں ہوا اس بچے سے پیچھا چھڑا لو۔ کسی کو بھی اس کا علم نہیں" وہ سپاٹ لہجے میں بولیں۔

"امی......!" وہ تڑپ کر بولی۔

"اگر تم اس بچے کی بہتری کے لیے آج اپنے من کو، اپنی انا کو نہیں کچل سکتیں تو ایسے بچے کو پیدا ہونے سے پہلے ہی مار دو، جو وجود میں آنے سے پہلے تمہارے لیے بہت سی مشکلات کو جنم دے گا۔ جب تک طلاق لے لو گی اور دوسری شادی کی راہ میں وہ سب سے بڑی رکاوٹ ہوگا۔" وہ بے حس لہجے میں کہے جا رہی تھی۔

"میں نے تمہیں دونوں راستے دکھا دیے ہیں ان پر سوچو اور دونوں میں سے ایک راستہ اپنے لیے منتخب کر لو، اور جب کر لو تو پھر دوسرے راستے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں۔ میں ماں ہوں تمہاری۔ تمہیں حقائق کا آئینہ دکھانا میرا فرض ہے اور تمہیں پہنچنے والی ذرا سی تکلیف سے بچانا بھی مگر اس کے باوجود بھی اگر تم کوئی غلط فیصلہ کرو تو پھر میں تمہارے لیے دعا ہی کر سکتی ہوں۔"

دو دن اس نے خوب سوچا اور صبح جب اسلم خان کا فون آیا تو اس نے مصالحت کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا۔

"اب یوسف کی کیا مرضی ہے۔ اللہ تو میری نیت سے آگاہ ہے۔ کہ میں بہر حال ادھر مصالحت کے لیے ہی آئی ہوں۔ تو ہی کوئی رستہ نکالنا۔"

وہ رکشے سے اتری تو ہلکی ہلکی بارش پھر سے ہونے لگی۔ وہ آفس کا گیٹ عبور کر کے اندر پہنچی۔ دروازے کے آگے بیٹھے پیون سے اپنا تعارف کرایا تو پھر اس نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے آفس ٹیبل کے پیچھے اسلم خان بیٹھا تھا۔

"آیئے آیئے درشہوار بی بی!" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ٹشو سے اپنا بھیگا ہوا چہرہ صاف کرنے لگی۔

"یہ لیں پلیز!" اس نے ٹشو باکس اس کے آگے کر دیا۔ وہ تھینک یو کہہ کر ٹشو پیپر

لے کر اپنے ہاتھ خشک کرنے لگی۔

چہرہ صاف کر کے اس نے خوامخواہ سامنے لگے وال کلاک کی طرف دیکھا۔

"میں زیادہ دیر نہیں رک سکوں گی۔" اس نے اپنی مجبوری بتائی۔

"یوسف صاحب اندر موجود ہیں۔ آپ اندر چلی جائیں۔" اس کی موجودگی کا سن کر اس کا دل زور سے دھڑکا۔

"تھینک یو۔" کہہ کر وہ سائیڈ روم کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ وہ کرسی پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ چہرہ اخبار کے پیچھے تھا وہ دوسری طرف پڑی کرسی پر بیٹھ گئی تو انہوں نے اخبار لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا۔ دونوں کی نظریں ایک پل کو ملیں۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی صرف وال کلاک کی سوئیوں کی ٹک ٹک کی آواز آ رہی تھی۔

"آپ نے مجھے ادھر کس لیے بلایا ہے؟" کافی دیر بعد اس نے کمرے کے سکوت کو توڑا۔

"بہت دن ہو گئے تھے تمہیں دیکھے ہوئے۔" وہ سنجیدگی سے گویا ہوئے۔

"یہ کیا مذاق ہے؟" وہ تپ گئی۔

"اس میں مذاق والی کون سی بات ہے، کیا تمہیں نہیں لگتا کہ مجھے دیکھے تمہیں بہت دن ہو گئے ہیں۔" یوسف نے اس کی کمزوری پر ہاتھ رکھا۔ اس کا دل بری طرح سے دھڑکنے لگا۔ آنکھیں جلنے لگیں اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں جکڑ لیا۔

"میں ادھر بہت مشکل سے آئی ہوں۔ آپ کو جو بات کرنی ہے جلد کریں۔" اتنے سنگین موسم اور کڑے حالات میں اسے مذاق سوجھ رہا تھا۔

"اوکے......" وہ کہہ کر چپ ہو گئے۔

"پتا نہیں غلطی کس کی ہے یا شاید غلطیاں ہیں کہ اگر پہلی غلطی کی اصلاح نہ کی جائے تو پھر انسان غلطی پر غلطی کرتا چلا جاتا ہے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو سمجھنے میں غلطی کی، اس میں قصور ہم دونوں کا بھی نہیں اتنے کم عرصے میں کوئی کیسے ایک دوسرے کو اچھی طرح جان سکتا ہے۔ مگر ایک بات اس ڈیڑھ ماہ کی جدائی نے مجھ پر عیاں کر دی ہے۔ اور I con't live with out you"

(میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا)

کہہ کر وہ چپ ہو گئے، اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور دُرشہوار کو لگا اس کے ضبط کے سارے بند ٹوٹ جائیں گے۔ اور وہ بارش کے پانیوں کی طرح بہہ جائے گی۔ جنہیں پھر کوئی نہیں سمیٹ سکتا۔

”کیا تم میرے بغیر رہ سکتی ہو۔“ وہ اس کی طرف جھکے۔

”پلیز.....“ وہ ضبط کی آخری منزل پر کھڑی تھی۔

”دری! ہمارے درمیان کیا ہوا، مجھے نہیں معلوم، ٹوٹ تو میں پہلی رات ہی گیا تھا جب تم گھر چھوڑ کر گئی تھیں اور جب خلع کا نوٹس ملا تو بظاہر میری انا نے مجھے بہت کمپوز رکھا۔ آپی جی کا خیال تھا کہ نوٹس بھیجنے کے باوجود تم خود ہمارے در پر ناک رگڑنے آؤ گی کہ اس کی تسلی بابا جی نے کرا دی تھی اور اگر تم ناک رگڑتی آ جاتیں تو شاید میں تمہاری طرف دیکھنا بھی پسند نہ کرتا۔

آپی جی کا عقیدہ ہے، مجھے اس سے کوئی سروکار نہ ہوتا اگر ان کا اندھا اعتقاد ہماری زندگی کو یوں ڈسٹرب نہ کرتا۔ اس ڈیڑھ ماہ کے عرصے میں میں نے جانا کہ اماں کی طرح آپی جی بھی ایک سائیکی کیس ہیں۔ ان کو پاور کی خبط ہے۔ وہ اپنے گرد موجود ہر شخص کو اپنی مٹھی میں رکھنا چاہتی ہیں۔ مجھے انہوں نے اپنی توجہ اور محبت سے خرید لیا۔ بیلا کی تو وہ ماں تھیں اسے تو ان کا ہر حکم ماننا ہی تھا مگر ہوا کیا؟“ وہ سانس لینے کو رکے۔

”بیلا نے آج سے چار ماہ پہلے ہماری شادی کے ڈیڑھ ماہ بعد کسی کرسچن لڑکے سے کورٹ میرج کر لی تھی۔ دونوں اسٹیٹس جانا چاہ رہے تھے۔ غیب کا سارا علم رکھنے والے بابا جی نے انہیں اتنی بڑی بات سے انفارم نہ کیا۔ ہے ناں لطیفہ، آپی جی کی ناک کے نیچے سب کچھ ہو گیا نہ دھواں نکلا نہ غبار اٹھا اور آپی جی بس ہمیں برباد کرنے میں مگن رہیں۔ ان کی بیٹی نے ان کی پیٹھ میں خنجر گھونپا ہے۔ اس کا علم انہیں کل رات ہوا جب کل صبح سات بجے کی گھر سے نکلی ہوئی بیلا گھر نہ لوٹی۔ سب جگہ فون کر لیے، اس کی کلاس فیلوز نے بتایا کہ وہ تو دو تین ماہ سے کالج ہی نہیں آ رہی۔ بیلا کے کمرے کی تلاشی لینے پر خط ملا جو وہ میرے نام چھوڑ گئی تھی۔ اس خط نے میری آنکھیں کھول دیں۔ اس نے ماں کا کچا چٹھا سب کھول کر رکھ دیا کہ آپی جی کس طرح مجھے غلام بنائے رکھنا چاہتی ہیں۔ وہ اس لیے تم جیسی لڑکی کو دلہن بنا کر لائیں کہ تم ان کے سامنے آنکھ نہ اٹھا سکو۔ انہوں نے وظیفے کر کر کے تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو موم کیا اور

اب وہ ہم دونوں کے درمیان علیحدگی کے لیے کوشاں تھیں۔ اس کے لیے بابا جی سے تعویذ اور نہ جانے کیا کیا لا کر مجھے پلاتی رہیں اور میں ان کی محبت کے احسانوں تلے دھنستا چلا گیا۔ میں شاید تم سے مکمل طور پر متنفر ہی ہو جاتا اگر بیلا گھر سے بھاگ نہ جاتی۔

اس نے خط میں نہ صرف اپنی کورٹ میرج کا بتایا کہ اسے اس ملک میں رہنا ہی نہیں۔ اس نے لکھا ہے کہ لوگ مغرب سے خائف ہیں کہ وہاں فیملی سسٹم نہیں اور میں اپنے معاشرے سے اس لیے متنفر ہوں کہ اس کے فیملی سسٹم نے کئی بہروپ والی میری ماں جیسی عورتوں کو جنم دیا ہے جو نہ اپنا گھر بساتی ہیں اور نہ دوسروں کا بسنے دیتی ہیں۔ ان کے کئی روپ ہیں۔ لوگوں کے سامنے میٹھی شیریں جیسی۔ گھر میں جابر حکمران، یوسف ماما کے ساتھ خوشامدانہ اور مربیانہ اماں کے ساتھ دوسروں کے سامنے ہمدردانہ اور اکیلے میں نفرت انگیز اور میری بات چھوڑیے۔ میری تو ان کی نظر میں کوئی اہمیت ہی نہیں۔ میں ان کے پیٹ میں تھی اور وہ شوہر کو ٹھوکر مار کر آ گئیں۔

اور آخری بات جو اس نے لکھی یوسف ماما آپ مامی کو منا لیں۔ اپنا گھر کہیں علیحدہ، کہیں دور جا کر بسا لیں۔ یہاں مما کے تعویذ گنڈے اور وظائف آپ کو کبھی پرسکون زندگی نہیں گزارنے دیں گے۔ اگر آپ مامی کو طلاق دے دیں گے تو مما اس کہانی کو ایک بار پھر دہرائیں گی تا آنکہ آپ شادی کے نام سے ہی نفرت کرنے لگیں گے اور یہ گھر انجام کار مجھے یعنی بیلا کو نگل جائے۔ جس کو وہ توجہ کی ایک بوند نہ دے سکیں، اسے دوسروں کا سمندر عطا کر دیں گی۔

اور یوسف ماما! مامی کا زیور میں نے چرایا تھا۔ ویزا اور پاسپورٹ کے لیے مجھے اور جمی کو رقم کی ضرورت تھی۔ جس کے لیے میں آپ سے معافی چاہتی ہوں۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجیے گا۔“

بیلا کے خط کا لب لباب سنا کر یوسف خاموش ہو گئے۔

”آپی جی دوسروں کی زندگیوں کو جوڑنے توڑنے میں لگی رہیں اور ان کی اپنی بیٹی ہمیشہ کے لیے ان سے بچھڑ گئی۔ مگر ان کی ضدی طبیعت ابھی نہیں جھکی۔ وہ بیلا کو بابا جی کے تعویذ گنڈوں کے ذریعے واپس لانا چاہتی ہیں۔ صبح سے آستانے میں گئی ہوئی ہیں، میں نے کہا کہ ہم بیلا کو ڈھونڈتے ہیں مگر انہوں نے کہا وہ بابا جی کے عمل سے خود واپس آئے گی۔

آپی جی کو ان شارٹ کٹس نے اندھا کر دیا ہے۔ جو کہیں بھی نہیں جاتے۔ وہ خدا

کے وجود کی منکر ہیں۔ اب ساری عمر یوں جھوٹے خداؤں کے آستانوں پر حاضری دیتی رہیں گی۔ ان کے لیے یہی سزا کافی ہے۔ کہ خدا نے جانتے بوجھتے انکے دل پر مہر لگا دی ہے۔"

وہ افسردہ لہجے میں کہہ رہے تھے، باہر پھر بارش شروع ہو گئی۔

"اور میری سزا؟" درشہوار کے منہ سے پھسلا۔

"جو تمہاری مرضی ہو تمہاری مرضی ہم دونوں کورٹ تک تو لے آئی ہے۔ آگے جو تم کہو۔" انہوں نے کچھ خفگی سے کہا۔

"دری! میرا غصہ وقتی تھا۔ ایسا میں نے کچھ نہیں سوچا تھا۔" یوسف نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"مگر میرا فیصلہ وقتی نہیں۔" اس نے ہاتھ کھینچ لیا "مجھے اس گھر میں نہیں جانا، میرا جادو ٹونے پر یقین نہیں ہے۔ اور اس گھر میں ایسا کوئی اثر میرے ہونے والے بچے پر ہو گیا تو میں کس سے جواب مانگوں گی۔"

"کیا...... کیا کہا تم نے؟ پھر سے کہنا؟" یوسف نے اس کا ہاتھ پھر سے پکڑ لیا۔ درشہوار نے ہاتھ کھینچنا چاہا مگر کامیاب نہ ہو سکی۔

"بولو...... بولونا......" یوسف اس کے قریب جھک آئے تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تھینک گاڈ......!" انہوں نے ایک گہرا سانس لیا۔ "ہم سے کوئی بڑی حماقت سرزد نہیں ہوئی۔

خیر اس گھر میں تو اب میرا بھی رہنے کا کوئی ارادہ نہیں، گھر وہ ہمارا ہے، اسے ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ اسی گھر کے لالچ میں تو آپی جی نہ جانے کیا کیا جتن کرتی رہیں ہیں۔ مجھے بینک کی طرف سے فیملی کے ساتھ ہالینڈ بھیجا جا رہا ہے۔ کل تک میرا ارادہ نہیں تھا مگر ایک رات نے مجھ سے سارے مثبت فیصلے کروا دیے ہیں۔ ہالینڈ جانے کے لیے تو تیار ہو نا؟" یوسف نے اس کی ٹھوڑی کو چھو کر پوچھا۔

"اور آپی جی!" خدشے اس کے لہجے سے ہویدا تھے۔

"وہ یہیں رہیں گی اماں کے پاس۔ میں نے تو ان سے بات کی تھی مگر وہ گھر چھوڑنے پر تیار نہیں مگر ہم اپنا گھر بنائیں گے۔ جس کی بنیادیں ایک اللہ پر پختہ اور سچے ایمان پر اٹھائیں

گے۔ دری! جو لوگ اللہ پر مکمل اور سچا ایمان نہیں رکھتے، وہ آپی جی کی طرح ساری زندگی بھٹکتے رہتے ہیں۔ تعویذ گنڈے، جادو ٹونے، شارٹ کٹس وقتی طور پر تو کچھ اثر کرتے ہوں، مگر خدا پر ایمان کو کمزور کر دیتے ہیں۔ یہ سارے انکشاف مجھ پر کل رات ہوئے بیلا ہمارا زیور اور رقم لے گئی مگر مجھے اپنے خدا کی سچی پہچان کروا گئی۔ میں اسکا پتا ضرور لگاؤں گا۔ وہ نادان لڑکی ماں کی ضد میں رستے سے بھٹک گئی ہے۔ ابھی جیسے لوگ زیادہ دیر تک ہاتھ پکڑ کر نہیں چلتے اگر میں بیلا کو تلاش کر کے اسے صحیح راہ پر ڈالنا چاہوں تو تم مائنڈ تو نہیں کرو گی، آپی جی کی بیٹی سمجھ کر۔"

"نہیں یوسف! بیلا مجھے بھی عزیز ہے مگر آپ کے حوالے سے۔"

"تو پھر میں او کے کر دوں آفس پر پوزل کو؟" یوسف نے جھک کر پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ہوا کے زور سے کھڑکی کے دونوں پٹ کھل گئے، بارش کی بوندیں اڑ کر ان کے چہروں سے آ ٹکرائیں۔

"باران رحمت ہمارے لیے واقعی رحمت ثابت ہوئی۔" یوسف اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑے ہو گئے دونوں چلتے ہوئے کھڑکی تک آئے۔

"ایک باران رحمت یہ چھتی ہے جو ساری خدائی کو سیراب کرتی ہے۔ اور ایک باران رحمت حق کی پہچان ہے جو اللہ مانگنے والوں کو عطا کرتا ہے اور جو نہیں مانگتے، ان کے دلوں پر مہریں لگا دیتا ہے کہ پھر سب کچھ دیکھ کر بھی انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ آپ کے دل پر بیلا کے واقعے نے سچ کو منکشف کر دیا اور آپی جی کے دل کو شرک پر راسخ کر دیا۔ اللہ انہیں ہدایت دے۔"

وہ اب تک شفاف گرتی بوندوں کو دیکھ رہی تھی۔

"اور دل کے موسموں کو بارشوں کی احتیاج نہیں ہوتی، بس ایک محبت بھری نظر سے ان کے معاملے سنورتے ہیں جیسے ہمارے تمہارے۔"

یوسف نے شوخی سے اسے دیکھا تو وہ بھی کتنے دنوں بعد کھل کر مسکرائی۔

نہ جنوں رہا نہ پری رہی

تقریباً ہفتے بھر سے موسم گم صم سا تھا نہ کھل کر دھوپ نکلی تھی اور نہ بادل ہی اپنا رنگ جما پا رہے تھے، اسی آنکھ مچولی کے نتیجے میں سردی کی شدت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا اور گہری دھند نے جیسے سارے آسمان کو اپنی سیاہ سرمئی چادر میں لپیٹ ہی لیا تھا اور دھند کی اسی نرم گرم چادر میں لپٹے بادل بھی جیسے کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ اس طرح دھند کی آغوش میں پڑے، دوسراہٹ کے مزے لوٹتے رہیں یا آگے بڑھ کر تنہا کوئی فیصلہ کرتے ہوئے تیاپ برسنا شروع کر دیں، لیکن آج واقعی لگ رہا تھا جیسے بادلوں نے کچھ ٹھان لیا ہے دھند کی گہری چادر میں سے بادلوں کے مرغولوں نے اپنے اکھنڈ قلعے تعمیر کر لیے تھے اور دھند ان کی مضبوطی کے آگے لاچار ہوتی نظر آ رہی تھی۔ شام کب کی ڈھل کر رات میں سمٹ چکی تھی اور سرما کی راتیں کس قدر طویل ہوتی ہیں جو آنے کے بعد جیسے جانا ہی بھول جاتی ہیں اور آج تو سال کی سب سے طویل رات تھی بائیس دسمبر کی رات۔

میں نے گرم شال کو اپنے کندھے کے گرد لپیٹا اور راکنگ چیئر سے اٹھ کر کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی، کھڑکی سے باہر کا منظر بہت واضح نہیں تھا۔ لان اور برآمدے کی لائٹیں دھند کی وجہ سے خاصی بجھی بجھی سی لگ رہی تھیں، سبزہ تاریکی میں چھپ گیا تھا۔ ہوا بلند ہونے کی وجہ سے پھولوں کی بوباس بھی جیسے پتوں میں چھپ کر سو گئی تھی اور گیٹ کی باؤنڈری وال کے ساتھ لگے سرو اور صنوبر کے درخت سر جھکائے جیسے فطرت کے فیصلے کے انتظار میں خاموش کھڑے تھے، ہر شے جیسے ٹھہری گئی تھی۔ عجیب سی خاموشی اور سکوت ہر طرف چھایا ہوا تھا۔

صرف آتش دان میں جلتی لکڑیوں سے کبھی کبھی کوئی چنگاری چیخ کر کمرے کے سکوت میں ذرا سا ارتعاش پیدا کر دیتی تھی۔ باہر کی فضا جتنی خاموش اور بے حس محسوس ہو رہی

تھی مجھے اپنے اندر اتنا ہی شور اٹھتا ہوا سنائی دے رہا تھا جیسے ساحل سے کئی فرلانگ سے دور سے آتے شخص کے کانوں میں لہروں کی آواز ہیجان کا احساس پیدا کرتی ہے اسی طرح مجھے اپنے اندر یاد کے سمندر میں اٹھتے جوار بھاٹے کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کھڑکی کے پٹ بند کیے تو جیسے کمرے کی فضا گھٹ سی گئی۔ دس بج چکے تھے، میں نے وال کلاک پر نظر ڈالی اور آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ کاریڈور کی مین لائٹس بجھا کر زیرو پاور کی لائٹس آن کر کے میں باہر آ گئی۔

باہر کا منظر ہنوز ویسا ہی تھا، جیسا میں نے کھڑکی سے دیکھا تھا چپ رہ کر شور مچاتا ہوا۔ البتہ ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی جس کی وجہ سے خنکی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا، لیکن مجھے سردی لگ ہی کب رہی تھی اندر یادوں کا الاؤ جل اٹھا تھا اور اس میں سے بھڑ بھڑ کرتے شعلے ایسے دہک رہے تھے جیسے میرا وجود ہی جلا ڈالیں گے میں نے برآمدے کے نقلی ستون سے ٹیک لگاتے ہوئے تاریک آسمان کو دیکھا اور بارش برسنے میں اب زیادہ دیر نہیں تھی موسم کے تیور یہی بتا رہے تھے۔ کتنا تضاد ہے اندر اور باہر، موسم میں، میں نے گہری سانس لی۔ اندر کی کھڑکیوں کے پٹ آپوں آپ کھلنے لگے۔

وہ بھی ایسی ہی ایک شدید سرد اور تاریک رات تھی۔ دسمبر کی ہی رات۔ بلکہ مجھے یاد ہے وہ بائیس دسمبر کی ہی رات تھی۔ میں اس رات کو بھول سکتی ہوں بھلا سال کی سب سے لمبی رات اور اس سال تو وہ میری زندگی کی سب سے لمبی تاریک بن گئی تھی۔

اور شاید دسمبر کا مہینہ تو ہوتا ہی یادوں کا مہینہ ہے، ایک پھیکی سی مسکراہٹ میرے لبوں پر آ گئی میں نے کین کی کرسی گھسیٹی اور خود کو اس پر گرا لیا۔ نوکر سارے سرونٹ کوارٹرز میں کب کے جا چکے تھے حتیٰ کہ میں نے چوکیدار کو بھی نو بجے ہی اس کے کوارٹر میں بھیج دیا تھا۔ کیونکہ اس کی بیوی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔

”اچھا ہی ہوا اس وقت میری تنہائی میں مخل ہونے والا کوئی نہیں ہے میرے سوا۔“ میں نے تھک کر کرسی کی پشت سے سر ٹکا لیا۔

عین اس وقت گیٹ سے باہر گاڑی کی ہیڈ لائٹس پڑیں اور ہارن بجا۔ چوکیدار تو ہے نہیں یاد آنے پر میں جلدی سے اٹھی اور گیٹ کی طرف بڑھی۔ میرے گیٹ کھولتے کھولتے دوبارہ ہارن اور بج اٹھا اور پھر جیسے ہی اسامہ کی نظر مجھ پر پڑی، وہ حیران رہ گیا۔ گاڑی پورچ

کی طرف بڑھی تو میں گیٹ بند کرنے لگی۔ باہر سڑک بھی سائیں سائیں کر رہی تھی۔

"ماما! آپ کیوں گیٹ کھولنے کے لیے آئیں اور یہ نذیر کہاں مر گیا ہے۔" میں نے اطمینان سے گیٹ کو لاک لگاتے ہوئے کہا۔

"افوہ اتنی سخت سردی میں آپ اٹھ کر گیٹ کھولنے کے لیے آئیں۔ ان نوکروں کے تو نخرے ہی ختم نہیں ہوتے اور آپ کی نرمی نے انہیں اور سر پر چڑھا دیا ہے۔ حد کرتی ہیں آپ بھی سارے زمانے کا خیال ہے بس اپنا خیال نہیں۔" وہ مجھے کندھوں سے تھام کر خفگی سے بولا۔

"بیٹا! کچھ نہیں ہوا۔ ایک ذرا گیٹ ہی تو کھولنا تھا اور مجھے تو یوں بھی اندر کمرے میں گھبراہٹ ہو رہی تھی اس لیے باہر آ گئی تھی۔" ہم دونوں چلتے ہوئے برآمدے تک پہنچے وجیہہ گاڑی سے نکل کر ہماری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔

"ممی جان! آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں اور اتنی سردی میں گیٹ کھولنے بھی آ گئیں نذیر کہاں گیا ہے؟" وہ بھی شوہر ہی کے لہجے میں پریشانی سے بولی۔

"ارے بھئی تم لوگ بھی حد کرتے ہو اک ذرا گیٹ ہی تو کھولا ہے میں نے ہو جاتا ہے کبھی کبھی ایسا بھی۔ تم لوگوں نے کچھ زیادہ دیر نہیں لگا دی آنے میں۔" .... میں نے ان کا دھیان بٹانا چاہا۔

"جی وہ ممی! پاپا آ گئے ہیں۔" وجیہہ خوشی سے تمتماتا چہرہ لیے میرے پاس آ کھڑی ہوئی۔ ڈارک پرپل ویلوٹ کے قیمتی سوٹ میں پورچ کی لائٹس میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔

"اچھا واقعی؟ کب آئے وہ؟" مجھے بھی خوشگوار سی حیرت ہوئی۔

"آج ہی، آج شام کو ہم پہنچے تو انہیں گھر میں دیکھ کر حیران رہ گئے۔ واٹ اے پلیزنٹ سرپرائز، ہے نا اسامہ!" اس نے بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے اسامہ کی تائید چاہی۔

"یہ تو بہت اچھا ہوا۔ میں خود یہی چاہ رہی تھی کہ وہ اب آ جائیں۔" میں نے پیار سے وجیہہ کے چہرے کو تھپتھپایا اور "ماما ٹھیک تھیں تمہاری؟"

"جی اب تو بہتر ہیں۔ میں نے کہا، ماما آپ پاپا کے آتے ہی ایک دم سے فرسٹ کلاس ہو گئی ہیں۔" وہ واقعی بہت خوش تھی۔

"اچھا اب کیا ساری رپورٹ یہیں کھڑے کھڑے پیش کرنی ہے۔ اب اندر چلیں؟" اسامہ کچھ چڑ کر بولا۔

"ہاں چلو اندر یہاں کافی سردی ہے۔" میں نے برآمدے کی سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھائے تو وہ دونوں بھی میرے پیچھے چل پڑے۔

"کھانا کھاؤ گے تم لوگ؟" میں نے مڑ کر دونوں سے پوچھا۔

"نہیں ماما! کھانا تو ہم کھا کے آئے ہیں۔ آپ نے کھا لیا۔ پاپا کا انتظار کر رہی تھیں؟" اسامہ نے میرے برابر رک کر پوچھا۔

"کھا لیا تھا میں نے دوا لینی تھی نا اس لیے۔" میں نے اسے ٹالنے کے لیے سب سے مطمئن کرنے والا جھوٹ بولا۔

"چلیں اچھی بات ہے۔ اب آپ کمرے میں جا کر آرام کریں اور یہ پاپا نہیں آئے ابھی؟" اس نے کچھ تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں ابھی نہیں آئے۔ تم لوگ اندر چلو۔ میں ذرا ٹھہر کر آتی ہوں۔ موسم بہت اچھا ہو رہا ہے یہاں بیٹھنا اچھا لگ رہا ہے۔" میں نے پلر سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

"توبہ کریں ماما! اتنی شدید سردی ہے اور آپ کو یہ موسم اچھا لگ رہا ہے۔ چلیں آپ اندر، اتنی سخت سردی ہے ٹھنڈ لگ جائے گی۔" وہ مجھے کندھوں سے پکڑ کر بولا۔

"اسامہ جان! کہا نا میں ابھی آتی ہوں۔ تم لوگ چلو اندر اور ویسے بھی میں نے خاصا موٹا کچھ پہن رکھا ہے ٹھنڈ کہاں سے لگے گی۔" میں نے اسے بہلایا

"اچھا پھر میں آپ کو اندر سے شال اور لا دیتا ہوں۔" وہ دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔

"بھئی، میرا یہاں رات گئے تک بیٹھنے کا ارادہ نہیں ہے، بس دس پندرہ منٹ موسم انجوائے کرنا چاہ رہی ہوں اور بس۔" میں نے ذرا ہنس کر کہا تو وہ جیسے مطمئن ہو گیا۔

"اچھا پھر جلدی آ جایئے گا۔" وہ اندر کی طرف بڑھ گیا وجیہہ پہلے ہی اندر جا چکی تھی۔

"ہاں وہ ماما! معاذ بھائی کا فون نہیں آیا؟" جاتے جاتے اسے یاد آیا تو مڑ کر بولا۔

"آیا تھا شام کو، کل دوپہر دو بجے کی فلائٹ ہے ان کی۔ دیکھو رات کو کتنے بجے پہنچتے ہیں۔"

"چلیں اچھی بات ہے۔" وہ سر ہلا کر بولا۔ "اور پلیز آپ اب جلدی سے اندر آ جائیں، پاپا کا انتظار نہ کرتی رہ جائیے گا۔ انہیں تو عادت ہے۔ آدھی آدھی رات کو آنے کی بہت آپ نے ان کے ناز اٹھا لیے۔ اب اپنا بھی کچھ دھیان کیجیے۔" وہ جاتے جاتے مجھے تاکید کرتے ہوئے بولا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"انتظار۔" میں نے باہر گیٹ کے پار دیکھنے کی کوشش کی۔ تمہیں کیا پتا اسامہ جان اس ایک لفظ پر تو میری آدھی سے زیادہ زندگی ٹکی ہوئی ہے اور اس رات کا میں نے کس شدت سے انتظار کیا ہے اور کس قیامت کا انتظار کیا ہے اور آج جبکہ یہ رات میرے ہاتھ آ گئی ہے تو میں غافل بن جاؤں، نہیں یہ رات سونے کی نہیں یہ تو جاگنے کی رات ہے یہ تو بائیس برسوں کا حاصل ہے۔ بائیس برس یہ رات میرے اندر جلی ہے۔ میں اسے کیسے گنوا دوں اور اس رات کے انتظار میں، میں نے بائیس سال اماوس کی رات کی صورت گزارے ہیں۔

ہاں مجھے انتظار ہے اسفند یار کا اپنے شوہر کا اور ویسے یہ کوئی نئی بات نہیں کہ ایک بیوی اپنے شوہر کے انتظار میں رات گئے تک جاگتی رہی یا میں اسفند یار کے انتظار میں رات گئے تک جاگ رہی ہوں میں تو بائیس برسوں سے ہر رات اس کا اسی طرح انتظار کرتی رہی ہوں، پھر آج کے انتظار میں کون سی انوکھی بات ہے۔

اس انتظار میں انوکھی بات یہ ہے کہ میں اس انتظار کے باب کو ہمیشہ کے لیے بند کر
"دوں گی، بس آج کی رات اس کے بعد کوئی انتظار نہیں کوئی آس نہیں رہے گی۔

ڈارک بریل ویلوٹ کے سیمی بوندیں برسنے لگیں، ایک دو تین چار اور پھر بے شمار۔ ہوا پہلے تیز ہوئی اور پھر تند، کب آئے وہ؟ گی اس کی آواز میں تندی کے ساتھ کرختگی پیدا ہونے لگی۔ سرو صنوبر اس کے رویے کی تائید کرتے ہوئے زور زور سے سر ہلانے لگے اور شاں شاں کرتی ہوا در و دیوار پر جیسے کوڑے برسانے لگی اور جس جس طرف ہوا کا رخ ہوتا ادھر سے ہی بارش کی بوچھاڑ برسنے لگتی۔ میں ستون کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی اور ہتھیلی آگے بڑھا کر بارش کو محسوس کرنے لگی۔ یخ بوندیں میری ہتھیلی پر گرنے لگیں۔ لیکن مجھے ان کی خنکی کا احساس ہی کب ہو رہا تھا۔ میں چپ چاپ کھڑی ہوا اور بارش کی زور آزمائی دیکھتی رہی۔ دونوں میں سے کوئی بھی جھکنے کو تیار نہیں تھا جتنی تیزی سے بوندیں برستیں اس سے زیادہ شدت سے ہوا چلتی۔ پتا نہیں کتنی دیر گزر گئی شاید آدھ گھنٹہ یا گھنٹہ کپڑے تھوڑے بھیگ چکے تھے جب گیٹ کی بیل بجی تو

میں نیند سے جاگ اٹھی۔

"یہ کون آ گیا؟" میں شاید حال سے یکسر کٹ چکی تھی۔ میں ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ پھر بیل بج اٹھی اور اب کے اس کا دورانیہ خاصا طویل تھا، میں نے کچھ دیر گیٹ کی طرف دیکھا اور پھر اٹھ کر برآمدے میں لگا بیل کا بٹن آف کر دیا۔

کچھ دیر بعد بیل بجانے والے نے گھنٹی سے مایوس ہو کر گیٹ دھڑ دھڑانا شروع کر دیا تو میں برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر برستی بارش میں گیٹ کی طرف بڑھی۔



"کون ہے؟" میں نے موسم کی شدت کی پروا کیے بغیر پرسکون لہجے میں بند گیٹ کے پیچھے سے پوچھا۔

"میں ہوں اور کون ہوگا اس وقت۔" اسفند یار کی غصے میں بھری آواز بارش کی بوچھاڑ کے ساتھ میری سماعتوں پر برسی۔ میں نے سب گیٹ کے اوپر بنی چھوٹی سی کھڑکی کی جالی کھولی تو اس کا غصیلا بھیگا ہوا چہرہ میرے سامنے آ گیا۔

"تم بیوقوف عورت گیٹ نہیں کھول رہیں۔ میں سارے کا سارا بھیگ چکا ہوں اور وہ اسامہ کا بچہ گاڑی لے کر آ گیا کہ واپسی پر مجھے قریشی صاحب کے گھر سے لے لے گا آنا ہی بھول گیا۔" وہ زور سے چیخا "کھولو اب گیٹ۔ میرا منہ کیا دیکھ رہی ہو۔" میں کچھ لمحے خاموش ہی شاید اپنی طاقتیں مجتمع کر رہی تھی۔

"اور زور سے چیخو بلکہ چلاؤ۔ خوب شور مچاؤ مگر یاد رکھو اس گھر کے دروازے اب تم پر ہمیشہ کے لیے بند ہو چکے ہیں۔" جتنی بیگانگی اور اجنبیت میرے لہجے اور لفظوں میں تھی اس سے زیادہ وہ میرے چہرے پر رقم تھی۔

"کیا، کیا بکواس کر رہی ہو۔ تم اپنے حواسوں میں ہو یا پاگل ہو چکی ہو۔ نذیر او نذیر گدھے گیٹ کھولو۔" وہ جیسے غصے سے پاگل ہو کر پرانا اسفند یار بن گیا۔

"نذیر یہاں نہیں ہے اور اگر ہوتا بھی تو میری اجازت کے بغیر وہ گیٹ نہیں کھول سکتا تھا۔ یہ گھر جس کا گیٹ کھولنے کا تم بار بار تقاضا کر رہے ہو۔ یہ میرے نام ہے اور میری مرضی میں جس کو چاہوں اندر آنے دوں، جس کو چاہوں گھر سے نکال باہر کروں۔ میرا خیال ہے یہ بات تو تمہیں یاد ہو گی۔" میرا لہجہ ہنوز پرسکون تھا جو شاید اس کے تن بدن میں آگ لگا

گیا۔ ''اگر غصے کی شدت سے تمہاری یادداشت متاثر نہیں ہوئی تو؟''

''خول! تم پاگل ہو چکی ہو، تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ تم کس سے کس لہجے میں مخاطب ہو۔ اگر یہ گھر بطور خیرات تمہارے نام کر ہی دیا ہے تو تم اپنی اوقات مت بھولو۔'' وہ دونوں ہاتھوں سے بھیگے چہرے اور آنکھیں صاف کرتے ہوئے نفرت سے بولا۔

''مجھے میری اوقات کا پتا ہے، مگر اس وقت تم اپنی اوقات بھول رہے ہو کہ تم اس وقت کیا ہو۔ فیکٹری اور ٹیکسٹائل مل تم اسامہ اور معاذ کے نام صرف دو ماہ قبل کر چکے ہو۔ جس کی تمام تر قانونی کارروائی مکمل ہو چکی ہے۔ گھر کی تینوں گاڑیوں کی رجسٹریشن ہم تینوں کے نام ہے۔ تم اپنی گاڑی ایک ماہ قبل فروخت کر چکے ہو۔ میرا خیال ہے تمہیں تمہاری اوقات بتانے کے لیے یہ کافی ہے یا سارے ڈاکومنٹس لا کر تمہیں دکھاؤں اور ہاں ہو سکتا ہے تمہارے اکاؤنٹ میں چند ہزار روپے موجود ہوں صبح بینک جا کر اپنے اکاؤنٹ چیک کر لینا اور پھر ان ہی چند ہزار پر زندگی کے بچے کھچے دن ہنسی خوشی گزار لینا۔'' میرا لہجہ اس سے زیادہ زہریلا اور زہرخند تھا۔

''یو اسٹوپڈ نالی کی اینٹ، تم نے آج اپنا اصل ظاہر کر ہی دیا نا کہ تم کیا ہو۔ تم جیسوں کو تمہاری حیثیت سے زیادہ دے دیا جائے تو اسی طرح آپے سے باہر ہو جاتی ہو۔ گھٹیا عورت کھولو گیٹ پھر میں تمہیں بتاتا ہوں تمہاری اصلیت۔'' وہ گیٹ پر زور سے ہاتھ مار کر چلایا۔

''میں نے تو آج اپنا اصل دکھایا ہے، تم نے تو بائیس برس پہلے ایسی ہی ایک رات کو اپنا اصل کھول کر مجھے دکھایا تھا۔ یاد کرو اسفند یار! ایسی ہی رات تھی سرد اور تاریک بارش سے بھیگی ہوئی، جب تم نے ہاتھ پکڑ کر مجھے گیٹ سے باہر کیا تھا۔ اس رات اسفند یار! اس رات میں نے قسم کھائی تھی کہ جس طرح آج تم نے مجھے بے حیثیت سمجھ کر اس گیٹ سے باہر کیا ہے اسی طرح ایک دن میں تمہیں بے حیثیت کر کے اس گھر سے باہر کروں گی، اور اس خدا کی لاٹھی بے آواز ہے آج اس نے میری قسم پوری کی۔'' جذباتی ہیجان سے میرا سانس پھولنے لگا جاؤ اب چلے جاؤ یہاں سے اور کبھی دوبارہ ادھر کا رخ نہ کرنا۔ ورنہ سوائے ذلت اور نفرت کے تمہارے ہاتھ کچھ نہیں لگا اسامہ اور معاذ تمہیں محض میری وجہ سے باپ کی سی عزت دیتے تھے

ورنہ تم اس قابل نہیں ہو میرے ایک اشارے پر وہ خود تمہیں یہاں سے نکال باہر کریں گے۔ چلے جاؤ یہاں سے میں نے بائیس برس کسی عذاب کی طرح تمہاری صورت برداشت کی ہے، اب ایک پل نہیں کروں گی چلے جاؤ یہاں سے۔''

میں چیخی اور زور سے ہاتھ مار کر کھڑکی بند کر دی کھڑکی بند کرنے سے پہلے میں نے اس کی آنکھوں میں غصہ، نفرت، حیرت اور پھر شکایت کی جو کیفیات دیکھیں وہ میرے ذہن پر جیسے ثبت سی ہو گئیں۔ میں نے دوڑتے ہوئے گیٹ سے برآمدے کا فاصلہ طے کیا اور برآمدے میں پڑی کرسی پر گر کر اپنے ہانپتے ہوئے تنفس کو بحال کرنے لگی۔

گیٹ پر ایک ہلکا سا ہاتھ بجا اور پھر خاموشی چھا گئی، کتنی دیر میری سماعتیں گیٹ کی طرف لگی رہیں مگر وہاں مکمل خاموشی چھا چکی تھی۔ بالکل ایسی ہی تھکن زدہ خاموشی میرے وجود پر چھا گئی تھی۔ سرد اور خاموش

⸻

بارش کا زور کافی حد تک ٹوٹ چکا تھا اگرچہ اب بھی ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی مگر جیسے تھکی تھکی سی ٹوٹی ٹوٹی سی اور اب میری آنکھوں سے گرم لاوا پگھل پگھل کر بہہ رہا تھا۔ جب خدا نے بارش کو تخلیق کیا تھا تو آسمان اور زمین کے مقدر میں جتنا پانی لکھا تھا اسے دیکھ کر شاید انسان نے باران رحمت کی زمین پر اس درجہ عنایت پر احتجاج کیا تھا تو آدھی بارشیں دیکھ کر عورت کے اندر اتار دی تھیں اب وہی بارش میری آنکھوں سے برس رہی تھی۔ حالانکہ یہ موقع رونے کا تو نہیں تھا یہ تو میری جیت کے نایاب لمحات تھے۔ جن کے انتظار میں، میں نے اپنی آدھی زندگی بارشوں کی نذر کی تھی آج تو جیت کی گھڑیاں تھیں پھر۔

بائیس سال پہلے وہ ایسی ہی ایک رات تھی اس وقت معاذ سات سال کا اور اسامہ پانچ برس کا تھا۔ دسمبر کا مہینہ ہو اور دو تین دن سے برستا آسمان ہو تو پھر سردی کا کیا عالم ہو گا یہ آپ سوچ سکتے ہیں۔ اس روز وہ دونوں جلدی سو گئے تھے لیکن میری آنکھوں میں دور دور تک نیند کا نشان نہیں تھا اور نیند کا تو اس روز سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا نہ معلوم کتنے عرصے کے بعد تو میری نیند ٹوٹی تھی۔

لیکن نہیں اس رات کا ابتدائیہ تقریباً ایک ڈیڑھ ہفتہ پہلے شروع ہوتا تھا۔ اسامہ اور معاذ کے ٹیوٹر انہیں پڑھانے آئے ہوئے تھے۔ نیناں اپنے کمرے میں تھی۔ بابا فیکٹری میں

تھے، اسفند یار تین روز سے کراچی گئے ہوئے تھے اور اماں جی اپنے کمرے میں تھیں۔ میں اپنے بیڈ روم میں مووی لگا کر دیکھ رہی تھی مووی دیکھتے دیکھتے اچانک مجھے بوریت سی ہونے لگی تو میں اسے آف کر کے کمرے سے باہر آگئی اور یونہی ادھر ادھر پھرنے لگی۔ اماں جی کے کمرے میں جھانکا تو وہ سو رہی تھیں، میں خاموشی سے دروازہ بند کرتے باہر آگئی۔

لاؤنج میں ٹیبل پر پڑے اس روز کے اخبارات اٹھا کر میں صوفے پر بیٹھ گئی اور سرسری نظر سے اخبار پڑھنے لگی۔ وہی عام سی خبریں، سیاسی اور تخریبی قسم کی میں نے دوسرا صفحہ نکالا اس پر شوبز سے متعلق خبریں تھیں۔ بلکہ اہم خبر اداکارہ لیلیٰ کی خفیہ شادی کی تھی اس کی خوب صورت سی بڑی تصویر کے ساتھ اخبار نے خبر لگائی تھی کہ اس نے اسلام آباد میں کسی صنعت کار سے خفیہ نکاح کر لیا ہے اور شوبز کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا ہے۔ خبر دلچسپ تھی میں توجہ سے پڑھنے لگی۔

اداکارہ لیلیٰ نے دو تین فلموں میں کام کیا تھا جو زیادہ ہٹ ثابت نہیں ہوئیں اور ٹی وی ڈراموں میں اس کی پرفارمنس ہمیشہ سے پسند کی جاتی رہی تھی۔ مجھے بھی بحیثیت اداکارہ بہت پسند تھی بہر حال اب تو اس نے ٹی وی فلم کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ لیکن دیکھیں کب تک۔ کیونکہ جس کو اس شعبے کی چاٹ لگ جاتی ہے وہ بہت عرصہ اس سے دور نہیں رہ سکتا نامہ نگار نے یہ فقرہ زیادہ نمایاں کر کے لکھا تھا۔ اس کے علاوہ باقی عام خبریں تھیں، فلموں اور ڈراموں کی شوٹنگ سے متعلق میں نے اخبار ایک طرف ڈال دیا اور ایک آدھ گھنٹے میں سب بھول بھال گئی۔

تین دن بعد اسفند یار کو فون آیا کہ وہ دو دن مزید نہیں آسکے گا یہاں کچھ کام ہے اگرچہ بابا اس کی اتنی لمبی غیر حاضری کو پسند نہیں کرتے تھے، لیکن کچھ عرصے سے اس نے بابا کی پسند و ناپسند کی کافی حد تک پروا کرنا چھوڑ دی تھی۔

پھر دو دن بعد وہ واپس آگیا۔ کاروباری نقطہ نگاہ سے اس کا دورہ بے حد کامیاب رہا تھا وہ کراچی میں اپنے سب آفس کے لیے لوکیشن دیکھنے گیا تھا جو اسے پسند آگئی تھی۔ بہر حال اس نے جتنا بتایا میں نے سن لیا کیونکہ کاروباری معاملوں سے مجھے کبھی بھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔

اگلے روز جب وہ تیار ہو کر آفس چلا گیا تو کمرے کی بکھری ہوئی چیزیں اٹھاتے

ہوئے میں جب اس کے کوٹ کو ہینگ کرنے لگی تو اس کی بیرونی جیب سے جہاز کا ٹکٹ نیچے گرا میں نے جھک کر اٹھا لیا اور یونہی پڑھنے لگی۔ ٹکٹ اسلام آباد سے لاہور کا تھا مجھے بڑی حیرانی ہوئی کہ اسفند یار اسلام آباد بھی گیا تھا۔ آفس سے دوپہر میں جب اس کا فون آیا کہ وہ رات کو دیر سے گھر آئے گا، ہم لوگ کھانے پر اس کا انتظار نہ کریں تو میں نے ٹکٹ کی بات بھی پوچھ لیا تو اس نے کہہ دیا کہ ہاں وہ ایک روز کے لیے اسلام آباد بھی گیا تھا مجھے تسلی ہو گئی۔

شام کو خرم آگیا۔ خلاف معمول وہ بہت چپ چاپ سا تھا۔ خرم اسفند یار کے مرحوم چچا کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اپنے باپ کے لاکھوں کے بزنس کا اکلوتا وارث۔ اس کی ماں بچپن میں ہی فوت ہو چکی تھی اور چاچا جان چند سال پہلے اللہ کو پیارے ہو گئے تھے اب وہ کنال کے وسیع و عریض گھر میں اکیلا رہتا تھا شام کو اپنے آفس سے اکثر ادھر آجاتا تھا۔ مجھ سے اس کی بڑی اچھی انڈر اسٹینڈنگ تھی دونوں بچے بھی اس سے بہت مانوس تھے وہ اکثر انہیں شام کو سیر کے لیے لے جاتا اور کبھی کبھار میں بھی ان کے ساتھ چلی جاتی۔ اسفند یار کو تو اپنی کاروباری مصروفیات سے اتنا وقت نہ ملتا تھا کہ وہ بچوں کو گھمانے پھرانے لے جاتا اسی لیے بچے بھی خرم انکل کے آنے کا انتظار کرتے رہتے تھے اور اس کے آتے ہی پیچھے پڑ جاتے کہ انہیں باہر لے کر جایا جائے اور بچوں ہی کے اصرار پر ہم ڈنر کر کے آئے تو اسفند یار گھر آچکا تھا اور شاید اس طرح میرا خرم کے ساتھ جانا کچھ پسند نہیں آیا تھا اس کے ماتھے پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں اور آنکھوں میں ہلکا ہلکا غصہ تیر رہا تھا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد وہ ٹھیک ہو گیا اس لیے میں نے بھی زیادہ فکر نہ کی۔

اور فکر کی کوئی ایسی بات بھی نہ تھی۔ کیونکہ خرم مجھے چھوٹے بھائیوں کی طرح عزیز تھا اور نیہاں میں اس کی دلچسپی کا مجھے پوری طرح سے علم تھا یہ علیحدہ بات تھی کہ نیہاں اسے جان بوجھ کر نظر انداز کرتی تھی۔ خرم کو دیکھ کر اس کے چہرے کے تاثرات ہمیشہ بگڑ جاتے تھے، وہ خرم کے مقابلے میں بے حد سنجیدہ لڑکی تھی، پڑھنے پڑھانے کی بے حد شوقین جبکہ خرم نے رو پیٹ کر بی اے کیا تھا۔ اسے کتابوں سے لفظوں سے چڑ تھی۔ وہ کتابوں سے کوسوں دور بھاگتا تھا اس کے برعکس اسے فلموں سے بے حد دلچسپی تھی اور نیہاں کو فلمیں بے حد ناپسند تھیں۔ لیکن اب سب کے باوجود خرم اسے بے حد پسند کرتا تھا مگر نیہاں اسے دیکھتے ہی اپنے کمرے میں گھس جاتی۔ اسے خرم کے اونچے اونچے قہقہے زہر لگا کرتے تھے۔ وہ تصوراتی دنیا

میں رہنے والی لڑکی تھی۔ جسے خوشبو، کتابیں، غزلیں، پھول اور ہلکی موسیقی پسند تھی اس کے نزدیک خوشی کے اظہار کا بہترین طریقہ ایک خاموش مسکراہٹ تھی۔ جبکہ خرم جب خوش ہوتا تو بہت زور سے ہنسا کرتا تھا۔

اماں جی کو بھی خرم نیہاں کے لیے پسند تھا اور مجھے بھی۔ لیکن بابا اور اسفند یار اسے کچھ خاص پسند نہ کرتے تھے اصل میں خرم کے والد سے جائیداد کے بٹوارے پر ان کا بہت پہلے بہت شدید قسم کا جھگڑا ہوا تھا۔ جس کے نتیجے میں ایک عرصے تک دونوں بھائیوں میں بول چال بند رہی تھی۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تعلقات تو بحال ہو گئے مگر ان میں وہ پہلی سی مٹھاس نہ رہی پھر اپنی وفات سے کچھ ماہ پہلے چچا جان نے اپنے ایک دوست کے ذریعے نیہاں کے لیے خرم کا رشتہ بھجوایا تو بابا بھڑک اٹھے اور دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ کبھی بھی اپنی بیٹی کا رشتہ بھائی کو نہیں دیں گے تو وہ خاموش ہو گئے۔ پھر ان کی اچانک وفات ہو گئی تو جیسے پاپا کو ایک ملال نے آ گھیرا کہ کاش جواب نہ دیتے۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا جبکہ اسفند یار کو اتنا بھی خیال نہ آیا کہ وہ خرم کو بہر حال ناپسند نہیں کرتا تھا بہن کی طرح۔

ان سب کے باوجود میرے اور خرم کے درمیان بہت اچھی دوستی تھی۔ باپ کی موت کے بعد وہ تنہائی سے گھبرا کر تقریباً روزانہ ہی ہماری طرف آ جاتا تھا۔ اماں جی تو ویسے ہی کم کم تھیں زیادہ وقت اپنے کمرے میں گزارتی تھیں۔ نیہاں اسے دیکھتے ہی اٹھ کر چل دیتی مگر وہ ذرا برا نہ مناتا۔ ہم دونوں خوب باتیں کرتے۔ چائے بنا کر پیتے اور بچوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی باتوں میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلتا اور جس روز وہ نہ آتا وہ شام خاصی لمبی ہو جاتی۔

ہاں تو میں بات کر رہی تھی اس شام کی جب خرم چپ چاپ آیا تھا کافی دیر وہ ایسے ہی گم صم بیٹھا رہا۔ پہلے پہلے تو بچے اُسے ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے رہے کہ وہ چل کر ان کے ساتھ کھیلے لیکن جب اس نے کوئی دلچسپی ظاہر نہ کی تو وہ دونوں باہر لان میں کھیلنے چلے گئے۔

''خرم! کیا بات ہے۔ تمہاری طبیعت ٹھیک ہے۔'' میں نے ہمدردی سے پاس پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں ٹھیک ہوں میں۔'' اس نے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا۔

''یہ کیا بات ہوئی جب ٹھیک ہو تو ٹھیک سے بات کرو۔ کیا پریشانی ہے۔''

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔' دوبارہ اس کے 'نہیں' پر مجھے یقین نہ آیا۔

''مجھ سے بھی نہ کہو گے کیا بات ہے۔'' میں نے ذرا آگے ہو کر مان سے کہا۔

''ٹھیک ہوں بھابھی میں۔'' اس نے گہرا سانس لے کر مجھے دیکھا اور پھر گود میں پڑے اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگا۔

''خرم! کیوں بور کر رہے ہو۔ بولو نا کیا بات ہے؟'' میں نے اکتا کر کہا۔

''اسفند بھائی آفس سے کب آتے ہیں۔'' اس نے کچھ دیر بعد بے تکا سا سوال کیا۔

''کبھی رات کو کبھی آدھی رات کو اور کبھی تو جناب آدھی رات کے بھی بعد اصل میں یہ کلوزنگ منتھ ہے نا تو فیکٹری اور مل میں آفس ورک خاصا ہوتا ہے۔ اب تو کتنے دنوں سے انہوں نے رات کا کھانا بھی گھر پر نہیں کھایا۔ بچے بھی ان کا انتظار کرتے کرتے سو جاتے ہیں۔'' میں نے اس کا ذہن بٹانے کو تفصیلاً جواب دیا۔

''آپ نے شام کو یا رات کو ان کے آفس کبھی فون کیا کہ وہ گھر کیوں نہیں آ رہے۔''

''اکثر کرتی ہوں بلکہ وہ خود شام کو فون کر دیتے ہیں کہ لیٹ آئیں گے اور کبھی ان کا پی اے فون کر کے مجھے پیغام دے دیتا ہے مگر تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟'' میں نے اس کی گم صم صورت کو دیکھ کر پوچھا۔

''آپ کو پتا ہے وہ پچھلے دنوں کراچی نہیں بلکہ اسلام آباد گئے ہوئے تھے۔'' اس نے غور سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں مجھے پتا ہے کراچی سے وہ اسلام آباد بھی گئے تھے ادھر ہی سے لاہور آئے تھے۔'' میں نے لاپروائی سے کہا۔

''مگر آپ کو شاید پتا نہیں کہ وہ کراچی گئے ہی نہیں۔ اسلام آباد ہی میں بارہ روز لگا کر آئے تھے۔'' اس کی بات نے مجھے چونکا دیا۔

''کیا مطلب۔ وہ تو کراچی گئے تھے، انہوں نے خود بتایا تھا۔'' میں نے پُر یقین لہجے میں کہا۔

''ہونہہ!'' وہ پھیکی سی ہنسی ہنسا اور آپ نے ان کے کہے پر یقین کر لیا۔

''ہاں تو اس میں بے یقینی والی کون سی بات ہے؟'' میں نے کچھ ناگواری سے کہا۔

''عورت بھی اس دنیا کی عجیب مخلوق ہے پہلے آنکھیں بند کر کے شوہر کے ہر حرف پر آمنا وصدقنا کہتی رہتی ہے اور جب پانی سر سے گزر جاتا ہے تو پھر واویلا کرتی ہے کہ اس کے ساتھ دھوکا کیا گیا ہے۔ حالانکہ دھوکا تو وہ خود کو دیتی ہے رات کو سپنوں اور دن کی حقیقتوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اس کی باتوں سے مجھے یونہی ذرا سا محسوس ہونے لگا۔

''خرم! کیا کہہ رہے ہو تم پلیز مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کھل کر بات کرو۔'' میں نے دبے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میرا دوست ہے شعیب۔ پندرہ دن پہلے اس کی شادی ہوئی تھی۔ اور وہ دونوں ہنی مون کے سلسلے میں اسلام آباد مری وغیرہ گئے ہوئے تھے۔ اسفند بھائی اور وہ ایک ہی ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ اسفند بھائی کو اس کا پتا نہیں مگر وہ میرے حوالے سے انہیں جانتا ہے، انہوں نے ایک ہفتہ اسلام آباد میں اسی ہوٹل میں اور دوسرا ہفتہ ایبٹ آباد کے ریسٹ ہاؤس میں گزارا ہے۔'' وہ مبہم انداز میں کہہ رہا تھا اس کا لہجہ میرا دل دھڑکا رہا تھا۔ مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔

''تو اس میں اتنا پریشان ہونے والی کون سی بات ہے۔'' میں نے کچھ دیر بعد خود پر قابو پاتے ہوئے بڑی مشکل سے کہا۔

''اسلام آباد اور ایبٹ آباد میں وہ اکیلے نہیں تھے۔'' اس نے جیسے میری حالت کو نظروں میں تولتے ہوئے مدھم لہجے میں کہا۔

''اکیلے نہیں تھے تو کوئی دوست ہو گا ان کے ساتھ۔'' میں نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔'' وہ چپ ہو گیا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''ان کی نئی بیوی لیلیٰ اسفند یار ان کے ساتھ تھی۔'' اس نے جیسے دھماکا کیا میں نے اسے ذرا غور سے دیکھا کہ کہیں وہ مذاق تو نہیں کر رہا مگر وہ مکمل طور پر سنجیدہ تھا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو؟'' میں غصے سے کھڑی ہو گئی۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میرے پاس اسلام آباد ہوٹل اور ایبٹ آباد ریسٹ ہاؤس کے بلوں کی رسیدیں۔ نکاح نامے کی کاپی اور یہاں لاہور میں لیلیٰ کی نئی رہائش گاہ کا ایڈریس اور فون نمبر سب موجود ہیں۔'' مجھے اس کی آواز میلوں سے دور آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اور

اس کا چہرہ میری بصارتوں میں دھندلا رہا تھا۔ میں گرنے کو تھی جب ہی اس نے جلدی سے اٹھ کر مجھے دونوں بازوؤں سے تھام کر صوفے پر بٹھایا۔

''خولہ خولہ بھابھی! ہوش کریں۔ دیکھیں معاملہ سنگین ضرور ہے لیکن آپ حوصلہ کریں۔''

وہ مجھ پر جھکا مجھے تسلی دے رہا تھا۔ ''میں پانی لے کر آتا ہوں۔'' آپ کے لیے وہ باہر نکل گیا اور تھوڑی دیر پانی میں گلوکوز ڈال کر لے آیا اور زبردستی میرے ہونٹوں کو لگا دیا۔ تھوڑی دیر میں میری حالت کچھ سنبھل گئی۔

''خرم! کیا تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' کافی دیر بعد میں نے مری ہوئی آواز میں پوچھا۔

''ہاں بھابھی! یہ دیکھیں۔'' اس نے پاس پڑا خاکی لفافہ اٹھا کر اس میں کاغذات باہر نکالنے چاہے تو میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے روک دیا۔

''پلیز یہ نہیں کرو۔'' تو اس نے گہرا سانس لے کر ہاتھ روک لیا۔ کچھ دیر یونہی گزر گئی۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا خرم! اسفند ایسا بھی کر سکتے ہیں۔'' میں نے بے یقینی سے کہا۔

''یہی اندھا یقین تو ہمیں مار دیتا ہے۔ یقین کریں لیکن آنکھیں کھلی رکھ کر۔ آپ کو ان کے اندر ذرا تبدیلی محسوس نہ ہوئی۔ ذرا بھی نہیں۔'' وہ دکھ سے کہہ رہا تھا تو میری آنکھیں برسنے لگیں۔

''تقریباً ڈیڑھ ہفتہ قبل اخبار میں خبر آئی تھی۔ لیلیٰ کے خفیہ نکاح کی۔ میں نے بھی پڑھی تھی لیکن اصل بات کا پتا تو مجھے پرسوں شام چلا جب شعیب نے آ کر مجھے سب کچھ بتایا تو میں نے بھی یقین نہیں کیا تھا اپنے ایک دوست کے ذریعے دو دن میں یہ سارے ثبوت اکٹھے کیے۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

''اگر یہ سچ ہوا تو خرم؟'' میرے آنسو تواتر سے بہنے لگے۔

''یہ فون نمبر ہے لیلیٰ کے گھر کا بلکہ اسفند صاحب کے نئے گھر کا۔ آپ خود ڈائل کر کے پتا کر لیں۔'' اس نے لفافے میں سے ایک سلپ نکال کر میرے آگے ٹیبل پر کھسکائی، میں کاغذ کے اس ٹکڑے کو محض دیکھ کر رہ گئی تو وہ خود اٹھا اور اسٹینڈ پر پڑا فون سیٹ اٹھا کر لے آیا

اور نمبر ملانے لگا۔ نمبر ڈائل کرنے کے بعد اس نے اسپیکر کا بٹن پش کیا اور ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔ بیل کی آواز دوسری طرف جا رہی تھی۔ تین گھنٹیوں کے بعد کسی نے فون اٹھایا۔

''ہیلو!'' کسی لڑکی کی مہین سی آواز تھی۔

''ہیلو جی۔ یہ اسفند یار صاحب کا گھر ہے؟'' خرم نے اسپیکر کے پاس ہو کر پوچھا۔

''جی آپ کون بات کر رہے ہیں؟'' اسی آواز نے پوچھا۔

''جی میں ان کا دوست ہوں۔ کیا وہ گھر پر ہوں گے۔''

''جی نہیں وہ اس وقت آفس میں ہوتے ہیں۔'' میرا دل چاہا میں دھاڑیں مار مار رونے لگوں ''ویسے آپ ہیں کون اور آپ کو یہ نمبر کہاں سے ملا؟'' اس نے محتاط لہجے میں پوچھا۔

''جی میں ان کا بہت کلوز فرینڈ ہوں۔ آپ لیلیٰ بھابھی ہیں نا۔ آپ نے مجھے اسلام آباد میں نہیں دیکھا تھا۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''آپ صفدر حیات ہیں۔ اسفند کے دوست جو نکاح میں شامل ہوئے تھے۔'' اس نے قیاس کیا۔ صفدر کا نام سن کر اب کسی شک کی گنجائش نہیں رہی تھی کیونکہ ان دونوں کا ساتھ دن رات کا تھا۔

''جی میں صفدر ہی ہوں۔''

''صفدر بھائی! آپ کو پتا ہے وہ اس وقت آفس میں ہوتے ہیں۔'' اس نے کچھ اپنائیت سے کہا۔

''ٹھیک ہے بھابھی! اصل میں وہ آفس میں نہیں تھے اس لیے میں نے فون کیا۔ اچھا جی خدا حافظ۔''

''خدا حافظ۔''

اس نے بٹن آف کر دیا اور میری شکل دیکھنے لگا۔

''خرم پلیز تم یہاں سے چلے جاؤ اور یہ لفافہ یہیں چھوڑ جاؤ پلیز۔'' میں نے اس سے منت بھرے انداز میں کہا۔

''نہیں میں اسفند بھائی کے آنے تک یہیں رہوں گا۔ کیا سمجھا ہے انہوں نے۔'' وہ کچھ ڈپٹ کر بولا۔

''پلیز میں تمہاری منت کرتی ہوں تم چلے جاؤ یہاں سے پلیز خرم۔'' میں نے آنسو بھری آنکھوں سے التجا کی تو وہ مجھے دیکھ کر رہ گیا اور پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''اب کوئی جذباتی فیصلہ نہ کیجیے گا۔ ٹھنڈے دل سے غور کیجیے گا لیلیٰ جیسی تتلیاں صرف موسم بہار کی ساتھی ہوتی ہیں۔ اس کیٹگری میں وفا نہیں ہوتی۔ آپ اس بات کو ذہن میں رکھیے گا۔ آپ سمجھ رہی ہیں نا؟'' تو میں نے زور سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اچھا اب تم جاؤ پلیز۔'' میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ کچھ دیر کھڑا رہا اور پھر باہر کی طرف بڑھ گیا۔

''میں کل آؤں گا بھابھی۔ خدا حافظ۔'' اس کے باہر نکلتے ہی میں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر زور زور سے رونے لگی۔



اس رات بھی اسفند یار حسب معمول آدھی رات ہی کو آیا رات کے ساڑھے بارہ بجے۔ اس سے پہلے وہ اس سے بھی لیٹ آیا کرتا تھا تو مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا تھا میں اکثر اسے سوئی ہوئی ملتی تھی۔ اور اکثر مجھے پتا ہی نہیں چلتا وہ کب آ کر سو گیا ہے۔ وہ اتنی رات گئے لیٹ آنا کب شروع ہوا تھا مجھے کچھ ٹھیک سے یاد نہیں شروع شروع میں شاید میں نے ایک آدھ دفعہ اعتراض کیا ہو لیکن پھر میں عادی ہوتی چلی گئی اور میں نے اس سے پوچھنا بھی چھوڑ دیا کہ وہ رات کو اتنی دیر سے کیوں آیا تھا۔ اصل میں مجھے شوہروں کی ہر وقت سن گن لینے والی بیویوں سے چڑ تھی مرد کی اور پھر کاروباری مرد کی اپنی مصروفیات ہوتی ہیں یہ میرا خیال تھا اور یہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا، آخر اتنی وافر مقدار میں پیسہ یونہی تو نہیں آ جاتا کوئی نہ کوئی قربانی تو دینی پڑتی ہے وہ میری اور میرے بچوں کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا تھا، ہمیں زندگی کی ہر آسائش اتنی آسانی سے اور اتنی کثرت سے میسر تھی جتنی آسانی سے لوگوں کو ضروریات زندگی بھی میسر نہیں آتیں اور اس کا اتنا خیال رکھنے کے جواب میں اس پر شک کرتی۔ کیا محبت صرف دوسرے کو پابند کرنے کا نام ہے کہ میں اس کے آنے جانے کے اوقات کا ٹائم ٹیبل بنا رکھوں بیویوں کی طرح طوفان کھڑا کر دوں۔

میں اس معاملے میں بڑے کھلے ذہن کی مالک تھی۔ تنگ نظری اور شک سے دور بھاگنے والی اور اسفند یار نے بھی تو ہمیشہ میرا خیال رکھا تھا کبھی مجھے شکایت کا موقع نہیں دیا تھا

ہاں وقت کی کمی اس کے پاس تھی جس کی تلافی کے لیے وہ پیسے کی کمی نہ آنے دیتا اور پیسہ تو ایسی چیز ہے جو بڑی سے بڑی کمی کو آسانی سے پورا کر دیتا ہے۔ ویسے بھی وہ کوئی جذباتی لاابالی عمر کا نوجوان تو تھا نہیں جس کی میں خبر گیری کرتی۔ ہماری شادی کو تقریباً دس سال ہونے کو آئے تھے ہم ایک خوش باش ازدواجی زندگی گزار رہے تھے۔

اور پھر شادی کے بعد محبت کی بہت زیادہ پروا کون کرتا ہے یہ بندھن ہے ہی ایسا کہ یہ جذبہ نظر نہ آتے ہوئے بھی محسوس ہوتا ہے۔ اور مجھے آج شام پانچ بجے سے پہلے تک پکا یقین تھا کہ اسفند یار میرے سوا کسی اور سے محبت نہیں کرتا اور یہ کوئی ایسی کچی محبت تو نہ تھی جو گلی کی نکڑ پر کھڑا کوئی دل پھینک نوجوان اپنے محلے کی کسی لڑکی سے کرتا ہے بلکہ ہماری اس محبت کے سینکڑوں گواہ تھے۔ جن کی موجودگی میں آج سے تقریباً دس برس پہلے مجھے اس محل میں لایا تھا اس سے بڑا محبت کا ثبوت اور کیا ہوگا کہ اس کے والدین اس کے اصرار پر ہی میرا رشتہ لینے ہمارے گھر گئے تھے اور رشتہ ہونے سے لے کر شادی کے بعد آج تک اس نے مجھے یہی یقین دلایا تھا کہ میں اس کی پہلی اور آخری محبت ہوں تو پھر اس پہلی محبت کے بیچ ذیلی محبتوں کے رستے کہاں سے نکل آئے وہ بھی اس طرح کہ مجھے خبر ہی نہ ہو سکی۔

وہ بدلتا چلا گیا اور میں اس کی تبدیلی کی عادی ہوتی چلی گئی بنا اس سے پوچھے بنا اسے جتائے اور آج ایک ہی شام میں میرے اور اس کے درمیان جیسے دو دنیاؤں کی دوری آ گئی تھی اس کے انتظار میں ایک ایک پل مجھے کاٹ کر گزر رہا تھا۔

میں تین چار بار آفس فون کر چکی تھی۔ جہاں سے سرِ شام ہی اٹھ گیا تھا۔ اپنے بیڈ روم میں بند اور رو رو کر میرا برا حال ہو گیا تھا۔ خرم کے جانے کے بعد میں وہ لفافہ اٹھا کر اپنے کمرے میں لے آئی تھی اور جب لفافے سے نکال کر میں نے نکاح نامے کی کاپی اور دوسرے کاغذات دیکھے تو مجھے لگ رہا تھا کہ کوئی میرے دل کی رگیں کاٹ رہا ہے لیکن اس کے باوجود میں زندہ سلامت تھی اور اس دشمن جاں کا انتظار کر رہی تھی چل چل کر میری ٹانگیں شل ہو چکی تھیں اور رو رو کر آنکھیں بوجھل۔ بچے میری حالت دیکھ کر رات کو جلدی کھانا کھا کر خود ہی سو گئے تھے اور میں نے نوکر کے ہاتھ کھانے کی ٹیبل پر جواب بھجوا دیا تھا کہ مجھے بھوک نہیں ہے۔

بات تو سچ ہے اگر میں اس سے پوچھا اور وہ مان گیا کہ ”ہاں یہ ٹھیک ہے تو پھر؟“

ٹہلتے ٹہلتے ریک کے پاس رک کر اپنی شادی کی فریم شدہ تصویر کو دیکھتے ہوئے میں نے سوچا۔

”تو پھر میں یہ گھر چھوڑ دوں گی کیا اس نے مجھے اس قدر ارزاں سمجھ رکھا ہے اور وہ بھی میری اجازت کے بغیر۔“

”تمہاری اجازت؟“ ہونہہ کوئی میرے اندر ہنسا تھا۔ ”تم سے وہ اجازت مانگتا تو کیا تم اجازت دے دیتیں؟“

”یا میرے خدا! یہ کیا ہو گیا میں کیا کروں۔“ میں سر تھام کر بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی۔ میں نے زندگی ایک سراب کے تعاقب میں گزار دی اور اگر آج بھی مجھے پتا نہ چلتا میں یونہی اس پر آنکھیں بند کیے اعتبار کیے جاتی۔

وہ اتنی اتنی رات تک گھر سے باہر رہتا مجھے رتی برابر فکر نہ ہوتی۔ میں بے فکری سے سوئی رہتی۔ مووی دیکھتی، گانے لگا دیتی، بچوں کے ساتھ لڈو، کیرم کھیلتی۔ انہیں کہانیاں سناتی شہزادی اور شہزادے کی لازوال محبت کی اور وہ معصوم ان ہی کہانیوں کو سچ سمجھتے ہوئے نیند کی وادیوں میں کھو جاتے اور کل رات تک تو میں بھی ان کہانیوں پر اس طرح ایمان رکھتی تھی کہ لازوال محبت آج بھی زندہ ہے مگر آج؟

میں پھر اٹھ کر ٹہلنے لگی۔

میں ابھی اس سے کچھ نہیں پوچھوں گی، کیا پتا یہ جھوٹ ہو اس کے کسی دشمن کی سازش ہو اور خرم کو دھوکا ہوا ہو۔ اگر ایسا ہوا تو اسفند یار تو غصے میں آگ بگولہ ہو جائے گا اس الزام پر۔ نہیں مجھے ابھی اس سے کچھ نہیں پوچھنا چاہیے۔ مجھے تھوڑی سی روشنی نظر آنے لگی میں خود ہی سر ہلانے لگی۔

ابھی میں کسی فیصلے پر بھی پہنچ نہ پائی تھی کہ پھر خیال آ گیا کہ وہ اس وقت کہاں ہو گا، میری شریانوں میں جیسے آگ دوڑنے لگی میں نے یک دم کمرے کا دروازہ کھول دیا عین اس وقت اسفند یار اندر داخل ہوا۔ میرے چہرے پر نظر پڑتے ہی ایک لمحے کو تو وہ ٹھٹک سا گیا۔ پھر نظر انداز کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہو گیا۔

”بچے سو گئے کیا؟“ وہ دونوں بیڈ پر اس کے سامنے سوئے ہوئے تھے پھر بھی اس نے یہ فضول سا سوال کیا میں ابھی تک دروازے کی دہلیز پر کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔

''تم کیوں نہیں سوئیں ابھی تک اور دروازے میں کیوں کھڑی ہو۔'' وہ کوٹ اتارتے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولا۔

''بہت سو لیا میں نے اسفند یار!'' میں نے چبا چبا کر کہا۔ ''اب سونے کا نہیں جاگنے کا وقت ہے اگرچہ مجھے جاگنے میں دیر ہو گئی، لیکن میں اب مزید سو بھی نہیں سکتی۔'' اور کوٹ ہینگ کرتے اس کے ہاتھ رک گئے اور اس نے پلٹ کر مجھے حیرت سے دیکھا۔

''اور دروازے میں اس لیے کھڑی ہوں کہ تھوڑی دیر بعد میری تقدیر کیا فیصلہ کرتی ہے مجھے یہاں سے باہر جانا ہے یا اندر آنا ہے۔'' میں نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔

''کیا بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟'' اس نے سر جھٹکتے ہوئے کہا اور ہینگر وارڈ روب میں لٹکانے لگا۔

''میں بہکی بہکی باتیں نہیں کر رہی، تم البتہ بہک گئے ہو اور مجھے خبر ہی نہ ہو سکی۔'' فضول سے آنسو پھر میری آنکھوں سے بہنے کی تیاری کر رہے تھے مجھے کمزور کرنے کے لیے۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

''خول! کیا بات ہے تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔'' اس نے بیلٹ اتار کر سائیڈ ٹیبل پر رکھی اور میرے قریب آ کر ذرا ہمدردی سے بولا۔

''مجھ سے ہمدردی مت کرو۔ میں تمہاری کسی بھی جذبے پر اب یقین نہیں کروں گی، اب ان کانوں نے ایک عرصے تک تمہاری جھوٹی محبت کے جھوٹے بول سنے ہیں اب آج سچ سننا چاہتے ہیں یہ بالکل سچ۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''کیا فضول باتیں کر رہی ہو تم۔ کیسا سچ اور میں تم سے جھوٹ کیوں بولوں گا بھلا چھوڑو ان باتوں کو اور دروازہ بند کرو کمرہ ٹھنڈا ہو گیا ہے بچے سوئے ہوئے ہیں۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ بند کرنا چاہا میں نے ہینڈل مضبوطی سے پکڑ لیا۔

''کمرہ ٹھنڈا ہو گیا ہے، لیکن میرے اندر الاؤ جل رہا ہے اس کو کون ٹھنڈا کرے گا جو آگ تم نے لگائی ہے اسے کون بجھائے گا۔ بولو کیوں تم نے میرے ساتھ ایسا کیا۔ کب کی رکھی تھی میں نے اپنی محبتوں میں کہاں پر تمہیں میرے خلوص میں کمی نظر آئی تھی بتاؤ مجھے؟'' میں چیخ پڑی ''کیوں کیا تم نے میرے ساتھ ایسا فریب۔''

''کیا بکواس کر رہی ہو آدھی رات کو۔'' وہ جواباً دھاڑا۔ ''میں نے کیا دھوکا دیا ہے تمہیں۔ سارا دن کولہو کے بیل کی طرح جان کھپاؤ۔ پیسہ سے پیسہ جوڑوں کس کے لیے یہ ان تمہاری عیاشیوں کے لیے۔ تمہارے آرام و سکون کے لیے اور اس کا یہ تم صلہ دے رہی ہو ناشکری عورت۔'' مرد کو جب اور کچھ نہیں سوجھتا تو وہ احسان جتانے پر اتر آتا ہے۔ رزاق کا منصب خود سنبھال بیٹھتا ہے۔

''ہاں تمہاری ان ہی دی گئی عیاشیوں نے تو آج تک مجھے میٹھی نیند سلائے رکھا۔ تمہاری ان ہی سہولتوں نے قطرہ قطرہ بے خبری کا زہر میرے اندر اتار دیا میرا شعور مر گیا بے حسی زندہ رہ گئی اور بے حسی کی بکل اوڑھ کر ان ہی سہولتوں میں کھو گئی اور تمہیں گم کر بیٹھی۔ بتاؤ تو کتنے گھاٹے کا سودا کیا میں نے ان آسائشوں کے بدلے تمہیں گنوا دیا کیوں کیا تم نے میرے ساتھ ایسا۔'' آنسو تو کسی سیلاب کی طرح بہہ رہے تھے آواز بھی میرے بہت بلند تھی۔

''مت چیخو۔ جو میرا اصغر بھر گیا نا تو پھر میں کوئی لحاظ نہیں کروں گا بہت سر چڑھا لیا ہے میں نے تمہیں۔ اب انسانوں کی طرح دروازہ بند کرو کہیں اور دفع ہو جاؤ۔ میں اس وقت تمہاری یہ فضول کی راگنی نہیں سن سکتا۔ سونا چاہتا ہوں میں۔'' اس نے پہلی بار اتنے گھٹیا لہجے میں بات کی تھی مجھ سے ان دس سالوں میں۔

''مجھے کانٹوں کا بستر دے کر تم آرام سے سونا چاہتے ہو۔ نہیں اسفند یار! میں کوئی سولہویں صدی کی گونگی بہری ستی ساوتری نہیں کہ کوئی مجھے پیروں تلے روند کر چلا جائے اور میں صبر کے گھونٹ پیتی رہوں۔ میں چپ نہیں رہوں گی۔ حساب دو مجھے میری وفاؤں کا۔'' میں اس کے غصے کے آگے ڈٹ کر بولی۔

''حساب کون سی وفاؤں کا۔ جو مجھ سے کرتی ہو اور پینگیں کسی اور کے ساتھ بڑھاتی ہو۔'' وہ طنز سے بولا۔

''کون کس کے متعلق کہہ رہے ہو، میں نے آج تک تمہارے سوا کسی کے بارے میں نہیں سوچا مجھ پر الزام لگانے سے پہلے خود آئینہ دیکھ لو تو بہتر ہے۔'' میں تڑپ اٹھی۔

''اور جو آدھی رات رات کو خرم کے ساتھ ڈنر کرتی پھرتی ہو، پکنک منانے جاتی ہو بچوں کے بہانے، سیر سپاٹے کرتی ہو وہ کیا ہے؟'' وہ اس سطح تک نیچے گر آئے گا یہ مجھے اندازہ نہیں تھا۔

"اسفند یار! یہ گھٹیا الزام لگانے سے پہلے اتنا تو تم بھی جانتے ہو اور اس گھر کا ایک ایک فرد جانتا ہے کہ وہ یہاں کس لیے آتا ہے اور کس کے لیے آتا ہے، تمہارے اس الزام کو میں غلط ثابت کر سکتی ہوں۔ لیکن اس وقت مجھے تم یہ بتاؤ کہ یہ کیا ہے اس کو تم کیسے غلط ثابت کرو گے۔" میں نے آگے بڑھ کر میز پر پڑا خاکی لفافہ اٹھایا اور اٹھا کر اس کے منہ پر دے مارا۔ اس نے شدید غصے اور حیرت سے مجھے دیکھا اور نیچے جھک کر زمین پر گرا لفافہ اٹھا لیا۔ لفافے سے سارے کاغذات نکال کر اس نے اطمینان سے دیکھا اور دوبارہ لفافے میں ڈال دیے۔

"اچھا تو پھر؟" اس کا سکون دیدنی تھا۔ اس نے پرسکون انداز میں لفافہ دوبارہ میز پر رکھا اور بڑی ڈھٹائی سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم، تم.... کیا یہ سچ ہے؟" مارے صدمے کے میرے منہ سے لفظ نہیں نکل رہے تھے۔ امید کی آخری روشنی بھی ختم ہو گئی تھی۔

"ہاں سچ ہے تو پھر؟" وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں ششدر رہ کھڑی رہ گئی۔ میرے آنسو بھی رک گئے۔ اس نے ریسٹ واچ اتار کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی اور اٹھ کر الماری سے اپنے کپڑے نکالنے لگا۔

"تو پھر یہ کہ یا تو میں تمہاری زندگی میں رہوں گی یا وہ طوائف۔" میں نے ذرا سنبھل کر ٹھوس لہجے میں کہا تو کپڑے نکالتے اس کے ہاتھ رک گئے۔ اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور پھر الماری کا پٹ بند کرتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

"اگر تم یہی چاہتی ہو تو یہی سہی ورنہ میں تو ایسا نہیں چاہتا تھا۔" وہ میرے قریب آ کر سرد لہجے میں بولے تو مجھے اپنے خون ہڈیوں میں جمتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

"ابھی تین بول بولوں یا رجسٹری بھجوا دوں۔" اس کا لہجہ حد درجے کا سفاکانہ تھا اور اس کے بعد کھڑے رہنا میرے لیے مرنے کے برابر تھا۔ میں آگے بڑھی اور سوئے ہوئے اسامہ کو کندھے سے لگا لیا اور دوسرے ہاتھ سے معاذ کو اٹھانے لگی۔

"ان کو کیوں اٹھا رہی ہو یہ کہیں نہیں جائیں گے۔ البتہ تم جانا چاہتی ہو تو ابھی چلی جاؤ ورنہ یہاں رات گزار سکتی ہو۔" اس نے آگے بڑھ کر اسامہ میری گود سے کھینچنا چاہا۔ سویا ہوا بچہ کسمسانے لگا۔

"یہ دونوں میرے ساتھ جائیں گے ماں ہوں میں ان کی ان کو میرے ساتھ جانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔" میں نے اس کے ہاتھ کو جھٹکا دے کر پرے کیا۔ "معاذ اٹھو چلو یہاں سے۔" میں نے بے خبر سوئے ہوئے معاذ کو اٹھانا چاہا۔

"میں کہتا ہوں اتارو اس کو گود سے ورنہ ابھی تمہیں اٹھا کر گیٹ سے باہر کر دوں گا۔" اس نے جھپٹ کر اسامہ کو میری گود سے چھین لیا۔

"یہ میرے بچے ہیں تم ان کو مجھ سے نہیں چھین سکتے چھوڑو انہیں۔ چھوڑو انہیں" میں چیخنے لگی معاذ ڈر کر اٹھ بیٹھا۔ اسامہ بھی اس کے کندھے سے لگا حیران آنکھوں سے دیکھنے لگا۔

"تم ان کو ہاتھ نہیں لگا سکتیں تمہاری اوقات ہے کیا۔ ابھی اس گھر سے نکلو تو دو ٹکے کی بن جاؤ گی۔ یہ میرے بچے ہیں اسفند یار کے بچے سنا تم نے تم انہیں کیا دے سکتی ہو پہلے جا کر اپنا تو کہیں ٹھکانا کر لو پھر ان کے بارے میں سوچنا۔" اس کا لہجہ حقارت بھرا تھا۔

"اور تم تم خود کیا ہو۔" طوائفوں کے پیچھے بھاگنے والے گھٹیا انسان۔" اس نے آگے بڑھ کر ایک طمانچہ میرے منہ پر کھینچ مارا میں تیورا کر دیوار سے جا لگی میرا سر چکرا گیا۔

"میں اپنے بچوں پر تمہاری اس گندی زندگی کا سایہ نہیں پڑنے دوں گی۔ چھوڑ دو ان کو۔" میں زور سے چیخی۔

"دفع ہو جاؤ تم یہاں سے اب میں تمہیں ایک پل بھی یہاں برداشت نہیں کروں گا نکل جاؤ یہاں سے۔" اس نے اسامہ کو بیڈ پر پٹخا اور مجھے بازو سے پکڑ کر باہر گھسیٹنے لگا۔ اسامہ زور سے رونے لگا۔ معاذ بھی بیڈ سے اتر کر میرے پیچھے لپکا۔

"ماما، پاپا ماما کو چھوڑ دیں۔" وہ چیختا ہوا ہمارے پیچھے آ رہا تھا اور وہ میرا بازو زور سے پکڑے مجھے باہر گھسیٹ لایا۔ شور سن کر اسی وقت اماں جی اور نیاں آ گئیں۔

"کیا، کیا ہوا ہے اسفند کیا کر رہے ہو؟" اماں جی نے گھبرا کر اس سے میرا بازو چھڑانا چاہا۔

"اماں جی! آپ پیچھے ہٹ جائیں یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے میں اس کو یہاں ایک منٹ بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ گھٹیا عورت میرے آگے زبان چلاتی ہے ابھی نکال باہر کروں گا تو اپنی اوقات میں آ جائے گی۔" اس نے مجھے زور سے دھکا دیا۔

میں برآمدے کی سیڑھیوں کے پاس جا گری باہر بارش تواتر سے ہو رہی تھی۔

''اسفند یار! کیا بک رہے ہو۔ تمہارا دماغ خراب نہیں ہو گیا۔'' اماں جی غصے سے بولیں نیہاں میری طرف بڑھی اور مجھے پکڑ کر اٹھانے لگی۔

''میں اب اس کو یہاں نہیں رکھوں گا اس کو طلاق دیتا ہوں میں اس کو۔'' اماں جی نے کھینچ کر ایک تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔

''یہی تربیت دی ہے میں نے تمہیں اتنی کمزور اور بودی۔ اس وقت شیطان تمہارے سر پر سوار ہے جاؤ اپنے کمرے میں۔'' انہوں نے اسے اندر کی طرف دھکیلا ''خولہ تم آؤ میرے ساتھ۔ مجھے بتاؤ کیا معاملہ ہے۔'' انہوں نے میرے قریب آ کر کہا میں جو اپنی چیخیں دبائے کھڑی تھی ان کے قریب آتے ہی چیخ چیخ کر رونے لگی۔

''مکار عورت کیسے چیختی ہے ماں جی آپ پیچھے ہٹ جائیں میں ابھی اس کا دماغ درست کرتا ہوں۔''

اس وقت وہ کسی لوئر مڈل کلاس کا تہذیب اور شرافت سے عاری ایک جاہل ان پڑھ مرد لگ رہا تھا۔

''اسفند یار! چلے جاؤ یہاں سے۔'' انہوں نے پلٹ کر اسے جھاڑا۔

''ماما، ماما! کیوں رو رہی ہیں آپ؟'' معاذ میرے ساتھ لپٹ کر رونے لگا۔ اسامہ بھی دروازے میں کھڑا تھا۔

اسفند یار نے لپک کر معاذ کو کھینچا اور اندر لے کر جانے لگا۔

''میں ماما کے پاس جاؤں گا چھوڑ دیں پاپا آپ مجھے۔ چھوڑ دیں۔'' وہ باپ سے زور آزمائی کرنے لگا۔ اسفند نے اس کے پھول سے گال پر تھپڑ جڑ دیا تو وہ اور زیادہ زور سے رونے لگا تو وہ اسے کھینچ کر اندر لے گیا۔

''اماں جی! مجھے جانے دیں۔ میرے بچے مجھے لا دیں میں یہاں ایک پل نہیں رکوں گی مجھے جانے دیں۔'' میں رونے لگی۔

''خولہ! مجھے بتاؤ تو سہی آخر ہوا کیا ہے۔'' اماں جی نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ نیہاں مجھے اپنے ساتھ لگائے کھڑی تھی۔

''جو ہونا تھا ہو گیا اب میرا اس گھر میں کوئی حق نہیں ہے مجھے میرے بچے لا دیں

میں یہاں نہیں رہوں گی۔'' میں روتے روتے بولی۔

''اچھا نہ رہنا۔ اب اس وقت کہاں جاؤں گی بارش ہو رہی ہے آدھی رات کا وقت ہے صبح چلی جانا۔'' انہوں نے اپنے دوپٹے سے میرے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں، نہیں اب نہیں رہوں گی یہاں ایک پل بھی رات تو بہت لمبی ہے۔ نیہاں! معاذ اور اسامہ کو لا دو میں اب یہاں نہیں ٹھہرنے سے زیادہ مرنے کو ترجیح دوں گی۔'' نیہاں نے مجھے گلے سے لگا لیا۔

''بھابھی بھابھی! پلیز حوصلہ کریں اتنی شدید سردی ہے اندر تو چلیں دیکھیں کیسے آپ کا جسم ٹھنڈا برف ہو رہا ہے۔ اندر چل کر پوری بات تو بتائیں کس بات پر جھگڑا ہوا ہے۔'' اس نے پیار سے مجھے کہا۔

''نہیں اب کوئی جھگڑا نہیں رہا۔ سارے جھگڑے ختم ہو گئے۔ بس مجھے جانے دیں۔'' میں اپنا آپ اس سے چھڑانے لگی۔

''خولہ خولہ بیٹی! عقل کرو۔ ایسی نادانی کی باتیں نہیں کرتے۔ میاں بیوی میں جھگڑے ہوتے ہی رہتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم آدھی رات کو اس برستی بارش میں گھر سے نکل پڑو۔ مجھے اندر چل کر پوری بات بتاؤ جس کا قصور نکلے گا میں اسے ہی جھوٹا کہوں گی۔ تم اپنے آپ کو تو سنبھالو۔'' اماں جی نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ پھر دونوں ماں بیٹی منت سماجت کر کے مجھے اندر لے گئیں۔

اماں جی کے پوچھنے پر میں نے انہیں ساری بات بتا دی وہ گنگ رہ گئیں مارے صدمے کے، بیٹے سے اس کی قسم کی امید انہیں ہرگز نہیں تھی۔ بابا تو اس رات گھر پر ہی نہیں تھے۔

اور پھر صبح اماں جی کے روکنے کے باوجود میں وہاں نہیں رک سکی اور پتا نہیں انہیں میری حالت پر ترس آ گیا۔ اس ظالم کو انہوں نے پتا نہیں کیسے سمجھایا کہ دونوں بچوں کو میرے ساتھ کر دیا۔

اماں جی آتے آتے بھی مجھے ٹھنڈے دل سے سوچنے کا کہہ رہی تھیں تو اس وقت میرا جی اس قدر دکھا ہوا تھا کہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں کہوں اگر آپ کی بیٹی کے ساتھ ایسا ہو اہوتا تو کیا آپ اسے بھی یہی کہتیں۔''

ڈرائیور مجھے اور بچوں کو امی ابا کے گھر کے آگے اتار کر چلا گیا۔ غصے میں، میں نے اپنے بیڑے لیے تھے نہ کوئی اور چیز بس دونوں بچوں کی انگلیاں تھامے جب میں گھر میں داخل ہوئی تو ناشتے کی میز پر بیٹھے سب لوگ جیسے حیرت زدہ رہ گئے۔

دونوں بھائی اور بھابھیاں، ابا، امی حنا اور عاصمہ آپا وہ پتا نہیں کب آئی تھیں یہاں۔ امی کی شکل دیکھتے ہی میں نے دونوں کی انگلیاں چھوڑیں اور جا کر ان سے لپٹ گئی صبر کے پیانے چھلک گئے اور میں دھواں دھار رونے لگی سب ہی گھبرا گئے۔

''خولہ خولہ کیا ہوا ہے؟'' آخری آواز جو میرے کانوں میں پڑی وہ فاروق بھائی کی تھی اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ آیا۔



میرا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔ ایک ہفتہ ہاسپٹل میں رہی، بلکہ پہلے دو دن تو مجھے ایمرجنسی میں رکھا گیا۔ یہ تو امی ابا کی دعائیں تھیں جو خدا نے مجھے اسامہ اور معاذ کے لیے دوبارہ زندگی دے دی۔ تیسرے دن ہوش میں آنے کے بعد کتنی دیر تک مجھے یاد ہی نہ آ سکا کہ میں کہاں ہوں اور میری حالت کیسے ہوگئی اور پھر اس کے بعد جو سارا واقعہ یاد آیا تو جیسے شدت غم سے میرا دماغ پھٹنے لگا۔ ڈاکٹرز کہہ رہے تھے کہ مجھے خوش رکھا جائے ٹینشن اور پریشانی سے بچایا جائے اور میرے گھر والوں کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے مجھے خوش رکھیں کیونکہ جو چوٹ مجھے لگی تھی اس کا درماں ان کے پاس نہیں تھا۔

پھر جب ایک ہفتے بعد مجھے ڈسچارج کیا گیا اور میں گھر آئی تو اسامہ کو چار دن سے شدید بخار تھا اس کا اتنا سا منہ نکل آیا تھا معاذ کو بھی فلو تھا۔ دونوں ہی ڈرے سہمے سے تھے، شاید اس رات ہم ان کے ننھے ذہنوں سے چپک کر رہ گیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی دونوں مجھ سے چمٹ گئے اور اسامہ تو مجھے چھوڑ ہی نہ رہا تھا ان کی حالت دیکھ کر میں اپنا صدمہ بھول گئی ان دونوں کو سینے سے چمٹائے میں کمرے میں پڑی رہتی اب یہ دونوں ہی تو میری زندگی ڈولتی ناؤ کو سہارا دے سکتے تھے۔

اور دوسرے روز جب اسامہ کا بخار کافی حد تک اتر گیا تو امی اور عاصمہ آپا میرے پاس آ گئیں دونوں کے اصرار پر مجھے انہیں ساری باتیں بتانی پڑیں اور ویسے بھی میرا ان سے کچھ بھی چھپانے کا ارادہ نہیں تھا۔ ماں باپ سے بڑھ کر سچا اور ہمدرد خیر خواہ اس دنیا میں

اور کوئی نہیں ہو سکتا اس لیے میں نے ساری بات امی کو بتا دی اس کی ہٹ دھرمی سے لے کر اپنی ذلت تک امی تو چپ کی چپ ہی رہ گئیں۔ عاصمہ آپا بھڑک اٹھیں۔

''اس نے کیا ہمیں اتنا ہی گرا پڑا سمجھ رکھا ہے کہ وہ جو چاہے تمہارے ساتھ سلوک کر جائے اور اس سے کوئی باز پرس کرنے والا کوئی نہیں چپ کرو میری بہن ابھی تمہارے دکھ کے لیے لڑنے والے زندہ ہیں۔ تم نے صحیح فیصلہ کیا جو یہاں آ گئیں۔ وہاں رہ کر اس سے حرام کی بھیک مانگتیں تو اس فرعون کا دماغ اور ساتویں آسمان پر چڑھ جاتا۔''

وہ مجھے گلے سے لگا کر پیار کرتے ہوئے بولیں۔ میرے آنسو ان کے دامن میں جذب ہونے لگے۔

''پھر بھی خولہ! تم نے اس سے نرمی سے پوچھنا تو تھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔''

امی نے شاید عاصمہ آپا کا ایک لفظ نہیں سنا تھا وہ اپنی ہی سوچوں میں گم تھیں کچھ دیر بعد مجھ سے بولیں۔

''امی! کیسی باتیں کر رہی ہیں وہ کیوں پوچھتی۔ جب گھر میں آگ لگتی ہے تو پھر یہ نہیں سوچا کرتے کہ آگ کیوں لگی ہے یہ دیکھتے ہیں کہ آگ کس نے لگائی ہے۔''

عاصمہ آپا نے پلٹ کر تیکھی سے امی سے کہا۔

''نہیں یہ نہیں دیکھتے کہ آگ کس نے لگائی ہے۔ بلکہ اس آگ سے کسی بڑے نقصان سے بچنے کے لیے جلد سے جلد آگ بجھانے کی ترکیب کرتے ہیں نہ کہ آگ لگانے والے کا پیچھا کرتے ہیں۔'' وہ اسی سوچ بھرے انداز میں بولیں۔

''آپ کا مطلب ہے کہ آگ لگانے والے کو کھلا چھوڑ دیا جائے اس سے کچھ باز پرس نہ کی جائے۔'' عاصمہ آپا تنک کر بولیں۔

''یہ مسئلہ بعد کا ہے۔ فی الحال اطمینان تسلی سے اس پر غور کر کے اسفندیار سے بات کی جائے کہ اس نے ایسا کیوں کیا اور اب وہ کیا چاہتا ہے؟''

''ہم کیوں جھکیں۔ ہماری بہن ہم پر بھاری نہیں ہے اسے ہی جھکنا پڑے گا۔ بچے یہیں رہیں گے خولہ کے پاس۔ دیکھیے گا جب وہ طوائف اسے کنگال کر دے گی تو خود ہی چور چور ہو کر لوٹ آئے گا۔'' عاصمہ آپا کو شروع ہی سے مجھ سے بڑا پیار تھا۔

''یہ تم بہت دیر کی سوچ رہی ہو، میں ابھی کی بات کر رہی ہوں اگر ابھی ہم اکڑ گئے

تو وہ مزید اکڑ جائے گا دونوں میں سے ایک فریق کو ذرا سا جھکنا پڑے گا یہ زندگی بھر کے معاملے ہوتے ہیں۔" امی شروع ہی سے تحمل مزاج تھیں مجھے ان کی یہ عادت بہت پسند تھی لیکن آج ان کی باتیں بے حسی کا ثبوت دے رہی تھیں۔ انہیں میری عزت کا، میرے پندار کا ذرا بھی خیال نہ تھا مجھے بڑا دکھ ہوا۔

"صرف امی کی نہیں اس کی بھی زندگی بھر کا معاملہ ہے اگر وہ سوچے تو ورنہ ہمیں بھی کوئی ضرورت نہیں اس کے پاؤں پکڑنے کی ہماری بہن ہم پر بھاری نہیں ہے۔" عاصمہ آپا اپنے موقف پر ڈٹی ہوئی تھیں۔

"بچوں جیسے جذباتی فیصلے نہ کرو عاصمہ! یہ معاملے جذباتی پن سے نہیں نبھائے جاتے ذرا سا جھکنے سے ہماری کوئی شان نہیں گھٹ جائے گی اتنا تو بیٹی والوں کو نرم ہونا ہی پڑتا ہے۔ نری اکڑ تو تباہی لاتی ہے اور وہ مرد ہے وہ نہ بھی جھکے گا تو اسے کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن ہمیں ہر حال میں فرق پڑے گا اب امی کی باتیں میری برداشت سے باہر تھیں۔

"ٹھیک ہے اگر میں آپ پر اتنی بھاری ہوں تو میں یہاں نہیں رہتی۔ کہیں اور چلی جاتی ہوں لیکن میں اب اس گھر میں نہیں جاؤں گی جہاں سے اس نے مجھے دھکے دے کر نکالا وہ بھی ایک طوائف کی خاطر۔ یا وہ اسے طلاق دے ورنہ میں وہاں نہیں جاؤں گی۔ یہ آپ سن لیں۔" میں غصے سے کھڑی ہو گئی۔

"ہم بھی تمہیں ایسے نہیں بھیج دیں گے، آخر کچھ نہ کچھ شرائط تو منوا کر ہی بھیجیں گے۔ لیکن یہ معاملہ تب ہی طے ہو گا نا جب کوئی رابطہ ہو گا یا کرے گا۔ ان کے رابطہ کرنے کے انتظار میں بات لمبی ہو جائے گی اور جوں جوں وقت گزرے گا۔ انا کا مسئلہ بڑھتا جائے گا اس لیے خود بیٹی سمجھداری سے کام لو جذباتی مت بنو۔ اس مسئلے کے بہت سے حل نکل سکتے ہیں تم ذرا اپنا ذہن کشادہ کرو اور اس بات کو ذہن سے نکال دو کہ دوبارہ تمہیں اس گھر میں نہیں جانا۔ تمہیں وہیں جانا ہو گا اور اگر خدانخواستہ ایسا نہ ہو سکا تو ابھی ہم زندہ ہیں تمہیں منفی باتیں سوچنے کی ضرورت نہیں۔ اب تم آرام کرو میں تمہارے ابا اور بھائیوں سے بات کروں گی۔" امی متانت سے کہتے ہوئے اٹھ کر باہر نکل گئیں۔

"امی کی اس نرم مزاجی سے تو میرے سسرال والوں کو شہ ملی ہے ذرا کوئی بات ہوتی ہے تو وہ جھٹ سارا الزام مجھ پر رکھ دیتے ہیں اور امی بھی ہر بار ان لوگوں کے سامنے مجھے ہی

جھوٹا کہتی ہیں اور پھر علیحدگی میں ہزار منتیں کر کے مجھے پھر ادھر روانہ کر دیتی ہیں اگر ایک بار امی ان لوگوں کے سامنے ڈٹ جاتیں تو یوں بار بار تو نہ مجھے ذلیل ہونا پڑتا۔" عاصمہ آپا امی کے باہر جاتے ہی پھٹ پڑیں۔

عاصمہ آپا کی سسرال بہت بڑی تھی تین دیور اور تین نندیں اور پھر ان کی اماں خاصی گرم مزاج تھیں سارا گھر ناصر بھائی کی کمائی پر چل رہا تھا جس کا قلق آپا کو بہت تھا اور اس کی بھڑاس وہ ہر چوتھے روز سسرال والوں سے جھگڑ کر نکالتی تھیں اور چند روز پہلے تک میں بھی اس معاملے میں امی کی ہم خیال تھی کہ عاصمہ آپا کے سسرالی جھگڑوں میں زیادہ قصور عاصمہ آپا کا ہوتا ہے لیکن آج میرے معاملے میں امی نے جس بے حسی کا ثبوت دیا تو مجھے پتا چلا کہ عاصمہ آپا کا ان جھگڑوں میں اتنا ہاتھ نہیں ہوتا بلکہ ایک تو ان کے سسرالی جھگڑالو ہیں دوسرے امی کا نرم جھکا ہوا مسکین کرتا رویہ انہیں شہ دیتا ہے اور ناصر بھائی کی کمائی پہ بھلا عاصمہ آپا سے زیادہ کس کا حق ہو گا اگر انہیں اس بات کا دکھ ہوا ہے تو صحیح ہے مجھے اپنے خیالات تبدیل ہوتے محسوس ہو رہے تھے عاصمہ آپا صحیح کہتی ہیں۔ انسان کو اتنا بھی ڈھیلا نہیں پڑنا چاہیے میں نے سوچا۔

پھر امی نے شاید اپنے نقطہ نگاہ سے ابو کو ساری بات بتائی وہ بھی کچھ سوچ میں پڑ گئے ایک آدھ دن ویسے ہی گزرا چپ چاپ۔ وہ شاید ان لوگوں کی طرف سے کسی پیش رفت کے منتظر تھے، جب وہاں سے کوئی سلسلہ جنبانی نہ ہوئی تو ابو نے فاروق بھائی اور نثار بھائی کو بٹھا کر ساری بات بتائی۔ ساری بات سنتے ہی دونوں بھائیوں کو جیسے کرنٹ ہی لگا گیا۔

"اتنی بڑی بات اور آپ نے ہم سے ذکر نہیں کیا۔" فاروق بھائی حیرت اور صدمے سے بولے۔

"ذکر کیا کرتے میں نے سوچا دو چار روز گزریں گے۔ اسفند یار کو اپنی غلطی کا احساس ہو گا چلو لینے نہ سہی کوئی پیغام ہی بھیجے گا۔ لیکن اس نے ایسا کچھ نہیں کیا تو اب یہ سب کہنا ہی پڑا۔" امی نے کچھ بے بسی سے کہا۔

"ہم کیا بے غیرت ہیں کہ اس کے پیغام کا انتظار کریں گے۔ اس نے کیا سمجھ کر اتنا بڑا قدم اٹھایا اور آپ اب بتا رہی ہیں یہ سب۔" نثار بھائی کا مارے غصے کے برا حال تھا۔

"یہ کون سی خوش خبری تھی کہ تمہیں اسی وقت بتا دیتی مجھے تو خود کل پتا چلا ہے۔ ساری بات کا، اب غصے کو چھوڑو اور یہ سوچو ٹھنڈے دل سے کہ اب کیا کرنا ہے۔" امی نے انہیں بھی صبر و تحمل کی لائن پر ڈالنا چاہا۔

"کرنا کیا ہے، اس کی طرف سے انتظار فضول ہے۔ وہ دھوکے باز ہی نہیں ڈھیٹ بھی ہے۔ لیکن ہم نے بھی چوڑیاں نہیں پہن رکھیں اسے پیغام بھجوائیں کہ یا تو اس طوائف کو طلاق دے یا پھر ہم خود اس سے نپٹ لیں گے۔" فاروق بھائی نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"اچھا اگر وہ کہہ دے کہ میں اسے طلاق نہیں دیتا تو پھر۔" امی پتا نہیں کیا ٹھانے بیٹھی تھیں۔

"پھر ہم اسے دیکھ لیں گے۔" نثار بھائی دھمکی آمیز لہجے میں بولے۔

"کیا دیکھو گے کیا کر لو گے تم۔ اسے مجبور کرو گے کہ آ کر تمہاری بہن کو لے جائے۔" ابو نے جواباً کہا۔

"دونوں بچے ہمارے پاس ہیں اور ہم اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کریں گے خولہ اس کی قانونی بیوی ہے اور خفیہ نکاح کی ہمارے ہاں کیا حیثیت ہے۔ اسفند یار کو اسے طلاق دینی ہی پڑے گی۔" فاروق بھائی پرزور لہجے میں بولے۔

"بچے وہ عدالت کے ذریعے بھی واپس لے سکتا ہے اس نے نکاح کیا ہے خولہ نے خود نکاح نامے کی کاپی دیکھی ہے ہم اسے کیسے چیلنج کر سکتے ہیں اگر خدانخواستہ اس نے خولہ کو۔" ابو نے گہرا سانس لیا "اس لیے غصہ چھوڑو اور صلح صفائی کی کوئی راہ نکالو۔"

"ابو! صلح صفائی وہاں پر ہوتی ہے۔ جہاں دونوں فریق صلح کرنا چاہیں اگر صرف ایک طرف سے ایسی خواہش ہو تو دوسرا اسے صرف جھکانے کی فکر کرتا ہے۔ اگر ہم پہل کریں گے تو اس میں ہماری ہی نہیں خولہ کی بھی انسلٹ ہے۔ پہل ہماری طرف سے نہیں ہونی چاہیے۔" عاصمہ آپا نے کہا۔

"دیکھو بیٹا اگر ہم یہ انا اور پہل وغیرہ کو لے کر بیٹھ گئے پھر اس مسئلے کا سلجھنا بے حد مشکل ہے ہم میں سے کوئی نہیں جائے گا اس کی طرف بلکہ ہم اپنی طرف سے کسی اور کو بھیجیں گے۔ آخر اس کے بھی تو ماں باپ بیٹھے ہیں ہم ان کے ذریعے بات کریں گے، وہی تو بیاہنے آئے تھے خولہ کو۔ آخر ان کی بھی عزت کا معاملہ ہے اور ہمارے ساتھ کوئی ایک مسئلہ تو نہیں ہے۔" ابو نے گہرا سانس لیا "دو چار ماہ تک حنا کی شادی کرنی ہے۔ تمہارا آئے دن سسرال والوں سے جھگڑا رہتا ہے، خولہ کی طرف سے اطمینان تھا۔ اب یہ مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ ابھی تو کسی کو پتا نہیں چلا کہ وہ اتنے دنوں سے ادھر کیوں ہے جب بات پھیلے گی تو لوگ سب پوچھیں گے، بے شک قصور خولہ کا نہیں ہے لیکن پھر بھی یہ معاشرہ ہر صورت چھری بیٹی والوں پر ہی چلاتا ہے۔ اور نقصان بھی ان ہی کا ہوتا ہے۔ ہمارے لیے صرف انا کا مسئلہ نہیں اور بھی بہت سے مسئلے ہیں جو صرف انا کو گلے لگانے سے پیدا ہوں گے اس لیے تھوڑا سا ہمیں ہی جھکنا پڑے گا اور اس میں کوئی بری بات نہیں۔" کچھ دیر بعد امی نے پوچھا۔

"وہاں جائے گا کون؟"

"میں بھائی صاحب سے بات کرتا ہوں۔" ابو نے تایا حمید کا نام لیا۔

"اسفند یار کے باپ سے ان کی بڑی اچھی سلام دعا ہے۔"

"تو کیا اس طرح بات نہیں پھیلے گی؟" نثار بھائی بولے۔

"میں کہہ دوں گا ان سے، وہ اپنے تک ہی رکھیں گے۔" ابو نے کہا "اور تم لوگ بھی ابھی شائستہ اور قری سے اس بات کا ذکر نہ کرنا۔" ابو نے دونوں بھائیوں سے کہا۔

"دعا کرو، یہ معاملہ بالا ہی بالا نپٹ جائے ورنہ بہت مشکل ہو جائے گی۔" ابو کا لہجہ فکر مند تھا اور کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔

اور میں جو کھڑکی کے پاس کھڑی ساری گفتگو سن رہی تھی کھڑے کھڑے تھک گئی۔ میری وجہ سے سب پر یہ افتاد آن پڑی ہے اور تایا حمید بھلا کیا کر سکیں گے بابا سے ان کی جتنی بھی سلام دعا سہی لیکن اسفند یار کا جو روپ میں نے اس رات دیکھا تھا۔ مجھے اب اس سے ذرا سی بھی امید نہیں رہی تھی۔ کہ وہ میرا یا بچوں کا ذرا سا بھی احساس کرے گا۔ میں خود کو گھسیٹتی ہوئی کمرے میں آ گئی۔



اور پھر وہی ہوا جس کا مجھے پتا تھا تایا حمید ایک نہیں دو دفعہ گئے اور دوسری دفعہ بھی ناکام لوٹ آئے، اسفند یار اب بابا کے بس کا نہیں تھا اور جب تک اسے یہ پتا تھا کہ اس کی چوری سے کوئی واقف نہیں وہ چور بنا رہا لیکن اب جبکہ سب کو اس بات کا پتا چل گیا تھا تو وہ شیر بن گیا تھا۔ اب وہ پوری ڈھٹائی سے سب کا سامنا کر سکتا تھا۔ اس نے کہلوا بھیجا تھا کہ

چونکہ میں خود گئی ہوں اس لیے خود ہی آؤں گی وہ مجھے لینے نہیں آئے گا اور دوسرے وہ مجھی کو طلاق نہیں دے گا۔ اگر میں خود آتی ہوں تو مجھے یہ شراکت، خوش دلی سے برداشت کرنی پڑے گی اور سوکن تو مٹی کی بھی ہو وہ نہیں سہی جاتی۔ میں ایک جیتی جاگتی سوکن کو کیسے برداشت کر لیتی اور جو یہ کسی نے کہا ہے۔

Man on is own image God Created

خدا نے انسان کو اپنے عکس پر پیدا کیا ہے۔ کس قدر صحیح ہے انسان میں اگر خدا کا ذرا سا بھی پرتو ہے تو وہ اپنے خالق کی طرح شراکت کس طرح گوارہ کر سکتا ہے اور پہلی بات بھی اس نے جھوٹ کہی تھی کہ میں خود گئی تھی اس نے مجھے گھر سے نکالتے وقت رات کا احساس نہیں کیا تھا تو وہ دن میں میرا کیا خیال کرتا۔

اس کے دوٹوک جواب پر جیسے سب گم صم ہو گئے۔ میرا قیام میکے میں لمبا ہوتا چلا گیا ایک جو امید تھی کہ شاید وہ بابا اور اماں جی کی بات مان لے گا وہ بھی ختم ہو گئی حتیٰ کہ اس نے دونوں بچوں کی بھی پرواہ نہ کی۔ نہ ان سے ملنے آیا نہ انہیں بلایا۔ وہ دونوں اپنی جگہ سہمے ہوئے تھے۔ ان کا کھانا پینا کم ہو گیا تھا کھانے میں ضد کرنے لگے تھے اور میری تو انہیں حد سے زیادہ بے اعتباری ہو گئی تھی وہ سوتے سوتے میں اٹھ کر کمرے سے باہر آ جاتی تو معاذ اتنا بڑا ہو کر زور زور سے رونے لگتا اتنی پرواتو وہ میری اپنے گھر میں بھی نہ کرتے تھے۔ ان کے اسکول بھی یہاں سے خاصے دور تھے کچھ دن تو دونوں بھائی ڈیوٹی نبھاتے رہے فاروق بھائی انہیں چھوڑ آتے اور نثار بھائی انہیں لے آتے لیکن جب انہیں بھی احساس ہوا کہ یہ کوئی ایک آدھ دن کا معاملہ نہیں تو وہ بھی اکتانے لگے۔ صبح کو فاروق بھائی کو اچانک سے دفتر سے دیر ہونے لگتی اور نثار بھائی کو دوپہر میں دفتر سے اٹھنے کا ٹائم نہ ملتا۔ کبھی صبح ان کی چھٹی ہو جاتی اور کبھی دوپہر واپسی میں انہیں دو تین گھنٹے لگ جاتے۔ ایک دو ہفتوں میں ہی مرجھا کر رہ گئے تھے۔

پھر فاروق بھائی نے ان دونوں کو وین لگوا دی ان کے اپنے بچوں کے اسکول گھر سے زیادہ دور نہ تھے اس لیے وہ صبح آسانی سے چلے جاتے تھے اسامہ اور معاذ جو مرسڈیز اور پجارو میں جانے کے عادی تھے بیس پچیس بچوں کے ساتھ وین میں جانا انہیں کسی عذاب سے کم نہ لگتا پھر واپسی میں سارے شہر کا چکر لگا کر جب وین والا انہیں چھوڑ کر جاتا تو وہ بھوک اور تھکن سے نڈھال ہو چکے ہوتے۔ اسامہ تو آتے ہی رونے لگ جاتا کہ وہ کل سے اسکول

نہیں جائے گا۔ اگلے روز میں اسے بہلا پھسلا کر اسکول کے لیے تیاری کرتی دوپہر میں آ کر وہ پھر بکھر جاتا اور اس کے ساتھ ساتھ مجھے خود کو بھی سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔

دونوں بھائی کے بچے حنا سے پڑھتے تھے، شام میں اسامہ اور معاذ کو شروع سے اپنے ٹیوٹر سے اسپیشل اٹینشن کے ساتھ پڑھنے کی عادت تھی اب اتنے بچوں کے بیچ بیٹھ کر حنا سے پڑھنا انہیں دشوار لگتا۔ دن بدن وہ پڑھائی میں کمزور ہونے لگے۔ آتے وقت میں ان کے کپڑے یونیفارم سب وہیں چھوڑ آئی تھی۔ یہاں آ کر جب انہوں نے دوبارہ اسکول جانا شروع کیا تو ابو نے انہیں دو دو یونیفارم بنوا دیے۔ مگر دو یونیفارم ان کے لیے ناکافی تھے۔ ان کے اسکول کا اسٹینڈرڈ اس قدر ہائی تھا کہ بچے کے یونیفارم پر ذرا سی شکن ہوتی تو فوراً بچے کے پیرنٹس کو شکایت بھیج دی جاتی۔ ان کے دونوں یونیفارم دنوں میں ہی پیلے پڑ گئے تو نوٹس پر نوٹس آنے لگے کہ بچوں کو نیٹ اینڈ کلین یونیفارم میں بھیجیں۔

لیکن یونیفارم تو بہت چھوٹی بات تھی، اصل مسئلہ تو ان کے اسکول کی فیسیں تھی دونوں بھائیوں کے پانچوں بچوں کے اسکول چارجز ملا کر ان دونوں کی فیس بنتی تھی اور مہینہ یوں چٹکی بجاتے ہی گزر جاتا اور جب مجھے ان کی فیس کے لیے ابو کے سامنے ہاتھ پھیلانے پڑتے تو میں سو سو بار مرتی۔ ابو ریٹائرڈ ہو چکے تھے وہ میرے فیس مانگنے سے پہلے دونوں بھائیوں سے پیسے اکٹھے کرتے تھے دونوں بھائی ایک دو دن لیٹ کر دیتے تو ابو جب مجھے یہ کہتے کہ کل لے لینا تو میں جیسے مٹی ہو جاتی۔

لیکن یہ ایک دو دن کا تو معاملہ نہ تھا یہ تو اب ساری زندگی کا معاملہ ہوتا نظر آ رہا تھا ادھر سے کسی نے پلٹ کر خبر نہ لی تھی۔ نیہاں کا اور اماں جی کا ایک دو بار فون آیا تھا خرم ایک بار آیا تھا اس کے بعد وہ جرمنی چلا گیا تھا اپنے کسی کام کے سلسلے میں۔ پتا نہیں واپس آیا تھا یا نہیں مجھے کچھ خبر نہ تھی میں تو اپنی ہی الجھنوں میں گھر کر رہ گئی تھی بھابیوں کے ماتھے پر شکنیں پڑنے لگی تھیں۔ دونوں بھائی حد درجے مصروف ہو گئے تھے۔ رات گئے دفتروں سے لوٹتے شاید اوور ٹائم لگانے لگے تھے۔ ابو اور امی بے حد چپ چپ رہنے لگے تھے حنا کے سسرال والے کتنے دنوں سے نہیں آئے تھے کہاں ان کا دن رات کا پھیرا تھا کہ انہیں فوراً تاریخ دیں شادی کی۔ اس بات پر امی خاصی پریشان تھیں۔

پھر انہیں دنوں عاصمہ آپا کا اپنی ساس کے ساتھ زبردست قسم کا جھگڑا ہو گیا اور وہ

تینوں بچوں کو لے کر آ گئیں۔ نہلے پہ دہلا ہو گیا۔ میں تو پہلے ہی شرم کے مارے وہاں مری جا رہی تھی۔ اب آپا کے آنے سے حالات بالکل ہی دگرگوں ہو گئے۔ امی نے حسب عادت آپا کو جھوٹا کہا تو وہ پھٹ پڑیں۔

"ہر بار آپ مجھے ہی جھوٹا کہتی ہیں وہ اتنے سچے ہیں کہ آپ ان کو سنے بغیر سچا مان لیتی ہیں اور مجھے سن کر بھی جھوٹا کہتی ہیں لیکن اب میں اس جہنم میں نہیں جاؤں گی زہر کھا لوں گی مگر اب وہاں نہیں جاؤں گی یہ روز روز کا تماشا تو ختم ہو۔"

"تماشا تو ہمارے ساتھ ہو رہا ہے اور دنیا دیکھ رہی ہے ایک پہلے سے آ کر بیٹھی ہوئی ہے نہ آباد میں نہ برباد میں اور اب تم آ گئی ہو زہر تو ہمیں دے دو۔ تم تو بات ختم کر آئی ہو باتیں تو ہمیں سننی پڑتی ہیں۔ پتا نہیں نصیبوں میں کیا لکھا ہے جلتی مٹی سے خدا نے ہمارے خمیر اٹھائے ہیں ایک پل چین نہیں۔ کہتے ہیں جس کی بیٹی دکھی اس کا جگ دکھی یہاں تو دو دو آ بیٹھی ہیں۔ ہمیں سکھ کہاں سے ملے گا۔"

امی روتی ہوئی اٹھ کر چلی گئیں تو آپا منہ سر لپیٹ کر لیٹ گئیں اور میں کیا کرتی کوئی راہ نہیں نظر آ رہی تھی ہر طرف جیسے پتھر پڑے تھے کس کس پتھر کو اٹھا کر راستہ صاف کرتی۔ میری پشت پناہی کرنے والوں کو اب خود حوصلوں کی ضرورت تھی وہ مجھے کیا حوصلہ دیں گے۔ میں آپا کو دیکھ کر رہ گئی۔



دن ایک ایک کر کے گزرتے چلے جا رہے تھے، آپا کو آئے ہوئے بھی مہینہ ہو چلا تھا اس بار ناصر بھائی نے بھی پلٹ کر ان کی خبر نہ لی تھی ورنہ وہ ہر بار ہفتہ دس دن بعد ہی چلے آتے تھے پھر خوب بحث مباحثہ ہوتا آپا ان کے گھر والوں کو اور اپنے نصیبوں کو برا بھلا کہتیں۔ امی آپا کو ڈانٹتیں ناصر بھائی امی سے معذرت کرتے۔ آپا اکثر جاتیں امی آپا کی تنہائی میں جا کر منت سماجت کرتیں اور دو تین گھنٹوں بعد معاملہ سلجھ جاتا اور وہ ناصر بھائی کے ساتھ چلی جاتیں۔ لیکن اس بار تو کوئی لمبا ہی جھگڑا لگتا تھا پہلے جب وہ آتیں تو دونوں بڑے بچوں کو وہیں چھوڑ آتی تھیں۔ چھوٹوں کو ساتھ لے آتیں۔ وہاں دادی اور پھوپھیاں دونوں بچوں کو رکھ لیتیں، لیکن اس بار وہ تینوں بچوں کو ساتھ لے کر آئی تھیں اور اب وہ بھی ادھر ہی سے اسکول جاتے تھے۔ بھائی اور ابو خرچ کرتے کرتے گھبرا اٹھے تھے۔

بھابیوں کی پرسکون گھریلو زندگیوں میں ہم دونوں کی وجہ سے کتنی بے سکونی در آئی تھی اس کا اندازہ بھابیوں کے اکھڑے اکھڑے رویوں سے بخوبی لگایا جا سکتا تھا اور وہ سچی تھیں آخر ہمیں کیا حق پہنچتا تھا کہ ہم اپنی پریشانیوں کی گٹھڑیاں لا کر ان کے کندھوں پر دھر دیں۔

پہلے میں میکے بہت کم وقت کے لیے آیا کرتی تھی۔ بلکہ بھائی اور بھابیاں فون کر کر کے مجھے بلوایا کرتی تھیں امی ناراض ہونے لگتی تھیں تو پھر میں آیا کرتی تھی وہ بھی محض چند گھنٹوں کے لیے بہت کم رات رہا کرتی تھی اور رات رہنا مجھے دشوار بھی بہت لگتا تھا مجھے اپنے کمرے کی عادت تھی بلکہ اس میں موجود سہولتوں کے میں اور میرے بچے عادی تھے۔ یہاں پورے پورے بیڈ روم حبس تھے پھر ائیر کنڈیشن صرف ایک کمرے میں تھا گرمیوں کی دوپہروں اور راتوں میں سارے گھر کے لوگ اسی ایک کمرے میں بھر جاتے تھے اور مجھے سب کے درمیان نیند نہ آتی تھی اور بچے تو فوراً رٹ لگا دیتے اور میں بھی ان کا بہانہ کر کے فوراً چل پڑتی۔

مگر اب تو وہ بھی نہ کہتے تھے کہ ماما گھر چلیں پتا نہیں کس نے ان کے ذہنوں میں یہ پھونک دیا تھا کہ وہ بھول کر بھی گھر کا نام نہ لیتے تھے میں ذرا خاموش بیٹھی تھی تو وہ دونوں میرے گرد منڈلانے لگتے بار بار پوچھتے ماما کیا ہوا ہے ماما کیا ہوا اور میں محض انہیں پیار کر کے رہ جاتی کیا بتاتی کہ کیا ہوا ہے۔

آپا کے آنے سے ماحول میں ٹینشن بڑھ گئی تھی۔ خاندان میں ہونے والی چہ مگوئیاں اب بلند آواز میں ہونے لگی تھیں۔

"پتا نہیں زینب نے کیسی تربیت کی ہے بیٹیوں کی۔ چار دن سسرال میں نباہ نہیں کر سکیں۔" یہ سب سے بلند طعنہ جو امی کے کانوں میں پہلی بار پڑا تھا تو وہ دو دن بستر سے نہ اٹھ سکی تھیں مگر آپا کی وہی رٹ تھی کہ وہ اب وہاں نہیں جائے گی۔

آخر سوچ سوچ کر میں نے نوکری کا فیصلہ کر لیا اور کچھ نہیں تو کسی اسکول میں جاب تو مل ہی سکتی تھی جونہی میں نے فاروق بھائی اور نثار سے بات کی تو وہ دونوں بھڑک اٹھے۔

"یوں کرو یہ جوتیاں اٹھا کر ہمارے سروں پر مارو جو تھوڑی بہت عزت رہ گئی ہے وہ تم نوکری کر کے خاک میں ملا دو۔ پہلے کیا کم زمانے بھر کے طعنے سن رہے ہیں اب ایک اور اضافہ ہو جائے گا کہ چار دن بہن کو نہ کھلا سکے۔ جو ٹکے ٹکے کی نوکری کرنے چل پڑی اور کوئی

نہیں تمہارے سسرال والوں کو ہی سب سے زیادہ موقع ملے گا۔ آج یہ بات کی ہے آئندہ نہ کرنا ورنہ اپنا ٹھکانا بھی کہیں اور کر لینا۔" انہوں نے بات ہی ختم کر دی۔

لیکن بات میرے چپ کرنے سے تو ختم نہیں ہوئی تھی اخراجات منہ پھاڑ کر کھڑے تھے اور کمانے والے دو اور جب برتن خالی ہوتے تو آپس میں ٹکرانے لگتے ہیں وہی ہوا پہلے کوئی کچھ کہتا تو دوسرا چپ کر جاتا لیکن اب وہ بات نہ رہی تھی بھابیوں کا خیال تھا کہ ہم نے آ کر ان کی زندگیوں کا سکون برباد کر دیا ہے اور آپا کا خیال تھا کہ جتنا حق بھابیوں کا اس گھر پہ ہے اس سے کہیں زیادہ ہم دونوں کا ہے۔ آپا کی طبیعت میں غصہ زیادہ تھا اور بھابیوں کی برداشت بھی اب ختم ہوتی جا رہی تھی اور پھر بچوں کی آپس کی لڑائیاں جو ماؤں کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ پہلے بچے لڑتے پھر ماؤں کے موڈ آف ہو جاتے بعد میں بات ابو اور بھائیوں تک پہنچتی تو ان کے دل برے ہوتے گھر میں ہر وقت ایک محاذ کی سی کیفیت رہنے لگی تھی۔

اور جہاں ایسی صورت حال ہو وہاں رزق سے بھی برکت اٹھ جاتی ہے دلوں سے چاہ ختم ہو جاتی ہے اور جب دلوں سے چاہ ختم ہو جاتی تو دل تنگ پڑنے لگتے ہیں۔ گنجائش کم ہونے لگتی ہے یہاں بھی یہی کچھ ہو رہا تھا دلوں سے چاہ ختم ہو رہی تھی رزق کم پڑنے لگا تھا چیزیں ایک دوسرے سے چھپائی جانے لگی تھیں اپنے بچوں اور پرائے بچوں میں فرق برتا جانے لگا اور دن بدن یہ فرق بڑھنے لگا تھا نہ میں ان باتوں کی عادی تھی نہ بچے۔ آپا جیسی محاذ آرائی اپنے سسرال چھوڑ کر آئی تھیں وہ اب یہاں بھی قائم ہو گئی تھی بھابیوں کے رویے اب یکسر بدلنے لگے تھے، امی ابو بے چارے صلح صفائی کرواتے رہتے، لیکن یہ سب کب تک چلے گا سوچ سوچ کر میرا ذہن تھکنے لگا تھا۔

لیکن یہ سب تو چھوٹے چھوٹے مسائل تھے جن سے ہم گھر کے اندر لڑ رہے تھے آخری دھماکہ اونٹ کی پیٹھ پر آخری تنکا ثابت ہوا وہ حنا کے سسرال والوں کا شادی سے انکار تھا۔ ہماری کم بختی کا سایہ اس بے چاری کے بخت پر بھی جا پڑا۔

"بہن جی! معاف کرنا بیٹے نے شادی سے انکار کر دیا ہے۔ اسے کوئی اپنے دفتر کی لڑکی پسند آ گئی ہے۔ ہم مجبور ہیں۔" اس کی ساس یہ کہہ کر منگنی کا سامان لوٹا گئیں اور ہم سب پتھر ہو کر رہ گئے کیا امی ابو اتنے بچے تھے کہ یہ سب نہ سمجھ سکتے کہ لڑکے کو اچانک اپنی کولیگ

کیسے پسند آ گئی جبکہ شادی کے لیے سب سے زیادہ اصرار وہی کر رہا تھا۔

بہر حال آپا کے لیے یہ دھچکا ہی کافی ثابت ہوا گھر کا ماحول اتنا ٹینس تھا کہ کوئی کسی کی شکل دیکھنے کا روادار نہ تھا۔ بھائی اور بھابیاں شاید ہمیں ہی قصوروار سمجھ رہے تھے۔ امی، ابو دنوں میں نچڑ کر رہ گئے تھے اور حنا کی اتری ہوئی صورت دیکھ کر ہم دونوں بہنیں اپنی جگہ چور ہو گئیں۔

اور جب تایا حمید نے آ کر بتایا کہ ان لوگوں نے رشتے سے اسی لیے جواب دیا ہے کیونکہ سب لوگوں کا خیال ہے کہ ہم تینوں بہنوں میں گھر بنا کر رکھنے کی نہ تو صلاحیت ہے نہ نباہ کی۔

ہاں بات کرنا تو بہت آسان ہے لیکن جب نباہ کا وقت آتا ہے تو لوگ نصیب کو دوش دینے لگتے ہیں ہمارے نصیب ایسے تھے کہ لوگ ہمیں آسانی سے بات کر سکتے تھے۔

"اگر نصیب نے اس پر دوسری عورت کو مسلط کر دیا تھا تو کیا ہوا لوگ تو چار چار کر لیتے ہیں کیا اس میں ذرا بھی برداشت نہ تھی۔ ماں باپ کی عزت کی خاطر ذرا سی شراکت برداشت کر لیتی وہ کون سا اس کے سر پر آ کر بیٹھی تھی۔ الگ ہی تھی نا۔"

یہ الفاظ تھے تائی جی کے میرے بارے میں۔

"اور معاف کرنا زینب! عاصمہ کی تو زبان اور رویے سے اس کے سسرال والے ناک تک بھرے ہوئے ہیں وہ ایک بار لڑ کر میکے آئی تھی تو تم نے اسے اندر نہیں کرنا تھا اسے منہ توڑ جواب دینا تھا کہ بی بی جاؤ جا کر نباہ کرو ہمارا جو فرض تھا وہ ہم نے پورا کر دیا پر تم نے اسے چھپر چھاؤں دی اور وہ ہر بار بھاگی چلی آئی۔"

اور اس وقت لوگ سچے تھے اور ہم جھوٹے۔ ہم دونوں کا اس طرح میکے آ کر بیٹھ جانا ہی لوگوں کو سچا ثابت کرنے کے لیے کافی تھا۔

اور اسی شام جب میں اسامہ اور معاذ کا یونیفارم استری کر رہی تھی آپا کاریڈور میں کھڑی فون پر ناصر بھائی سے معافی مانگ رہی تھیں۔

اور رات کو جب ناصر بھائی عاصمہ آپا اور بچوں کو منا کر کچھ کہے بنا کچھ جتائے بنا آ کر لے گئے تھے تو مجھے اپنی ذلت اور بے بسی کے گہرے دکھ نے رات بھر سونے نہ دیا۔ انہوں نے معافی مانگ لی۔ ان کا معاملہ سلجھ گیا۔ میں کس سے معافی مانگوں۔ میری تو کسی نے

پلٹ کر خبر نہ لی تھی میں تو جیسے اپنی ہی نظروں میں گر گئی تھی۔



پھر جیسے خدا کو مجھ پر رحم آ گیا یا شاید میرے والدین کی حالت زار پر رحم آ گیا۔ عاصمہ آپا کے جانے کے ہفتہ بعد، اماں جی آ گئیں مجھے لینے۔ پورے آٹھ ماہ کے بعد، اور حالات مجھے اس قدر بے وقعت ثابت کر چکے تھے کہ میں ان سے آٹھ ماہ کا حساب بھی نہ مانگ سکی۔ بس ان کے سامنے چپ چاپ بیٹھی رہ گئی۔

وہ امی اور ابو سے معذرت کر رہی تھیں اپنی اس کوتاہی کی جو ان سے سرزد ہی نہ ہوئی تھی۔

"میں اتنا عرصہ کوشش کرتی رہی کہ وہ کسی طرح اس حرافہ کا پیچھا چھوڑ دے اور بچی پھر سے گھر آ جائے مگر اسے نے تو پتا نہیں اس کیا گھول کر پلا دیا ہے کہ اسے اور کچھ سوجھتا ہی نہیں۔" انہوں نے ہاتھ ملتے ہوئے مجھے دیکھا۔ باپ بھی ہار گیا ہے اس کے آگے آپ ہی بتائیں ہم کیا کریں۔"

"بس جی! ہم کیا بتائیں ہماری تو خود اس پریشانی نے کمر توڑ دی ہے جب بھی سوچتی تھی یہ خیال آتا تھا کہ خولہ کی طرف سے مجھے ٹھنڈی ہوا آتی ہے، پر اب تو آٹھ ماہ سے جیسے ہمارا سارا گھر لو کے تھپیڑوں کی زد میں آ گیا ہے ہم کیا بتائیں۔" امی کی آواز نم آلود تھی۔

"اب بہن جی! سوائے صبر اور حوصلے کے اور کوئی چارہ نہیں۔ آپ خولہ بیٹی کو سمجھائیں وہ سینے پر پتھر رکھ کر میرے ساتھ چل پڑے۔ آخر کب تک وہ دامن چھڑائے گا کب تک اس فریب کے پیچھے بھاگے گا۔ ایک نہ ایک دن تو لوٹ ہی آئے گا اس ایک دن کی آس دل میں رکھے گی تو کٹھن رستہ بھی آسان ہو جائے گا بچوں کی خاطر اور ہماری عزت کی خاطر اسے کہیں میرے ساتھ چلے۔ گھر اس کے بغیر اور بچوں کے بغیر جنگل بن گیا ہے۔ نیہاں کے بابا کی طبیعت بالکل اچھی نہیں رہی ورنہ وہ بھی آتے۔"

یہی بات وہ اگر آج سے آٹھ ماہ پہلے آ کر کہتیں تو شاید میرا سارا گھر نکھار میں سونت کر کھڑا ہو جاتا لیکن اب ان آٹھ ماہ نے مجھے اور میرے گھر والوں کو اتنا کچھ سمجھا دیا تھا کہ وہ ان کا آنا اور کہنا ہی اپنے لیے بڑی عزت کی بات سمجھ رہے تھے جس کا نتیجہ ابو کے یہ جملے تھے۔

"بہن! خولہ بھی آپ کی ہے اور بچے بھی، ہم کون ہوتے ہیں انہیں روکنے والے، اب اس کی قسمت اس کے ساتھ۔ اتنے ماہ بٹھا کر دیکھ لیا۔ اسے جیسے اور ضد آ گئی ہے اب جو آپ کہیں کیونکہ شرفاء طلاق لینے سے مر جانا بہتر سمجھتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئے یہ دیکھے بغیر کہ طلاق کے بغیر بھی ان کی بیٹی اس ذلت پر اندر ہی اندر مر گئی ہے۔

"بہن جی! لوگ باتیں بنائیں گے اتنا عرصہ بٹھایا تو کیا تصفیہ کیا، ہاتھ پکڑ کر چلتا کیا ہم بھی عزت دار لوگ ہیں خاندان قبیلے والے اور آپ بھی۔ آپ خود سوچیں آخر آپ بھی بیٹی والی ہیں میری بچی کیا سوچے گی۔" امی نے آخری الفاظ اتنی آہستگی سے کہے تھے کہ میرے کان میں نہ پڑ سکیں لیکن کمرے میں تو پن ڈراپ سائلنس تھا اور میں امی سے کہنا چاہتی تھی امی آپ کی بیٹی اور اپنی ذلت کے آگے ختم ہو چکی ہے۔

"اچھا زینب بہن! میں پھر چلتی ہوں کوئی وعدہ نہیں کرتی کوشش کروں گی کل پھر آؤں گی۔ آپ خولہ کو ذہنی طور پر تیار کر لیجیے گا باقی جو اللہ کو منظور۔" وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئیں تو امی بھی ان کے ساتھ باہر نکل گئیں۔

اور جب رات کو بھائیوں کو ان کے آنے کی خبر ملی تو وہ بہت خوش ہوئے۔

"دیکھا میں نہیں کہتا تھا کہ وہ لوگ خود آئیں گے۔" فاروق بھائی خوشی سے بولے۔

"ہاں بھائی، اپنا گھر اپنا ہی ہوتا ہے۔ کوئی کب تک دوسرے گھر میں پڑ سکتا ہے۔" شائستہ بھابی نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا اور میں مسکرا بھی نہ سکی۔

"بالکل اچھا ہی ہوا ہم نے پہل نہیں کی ورنہ بڑی سبکی ہوتی۔" نثار بھائی اپنی دھن میں بولے۔

"کہاں چھوڑا ہے اس ڈائن کا پیچھا اس نے۔" امی نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

"امی کچھ عرصے کی بات ہے جب اسے پتا چلے گا کہ خولہ اپنے گھر آ چکی ہے اور بچے بھی تو خود ہی دل برداشتہ ہو کر چلی جائے گی ایک دن آپ یہ فکر چھوڑ دیں۔" آج سب ہلکے پھلکے ذہن سے سوچ رہے تھے۔

"واقعی یہ کوئی اتنی بڑی بات تو نہ تھی، جس کے لیے کوئی اپنا گھر بار وہ بھی آسائشوں سے بھرا چھوڑ چھاڑ کر دوسروں کے سر پر آ بیٹھے وہ خود ہی دفع ہو جائے گی مجھے یہ فکر نہیں کرنی

چاہیے۔'' میں سب کے پرسکون چہرے دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔



اور پھر اگلے دن واقعی معجزہ رونما ہو گیا جب میں شام کو معاذ کو پڑھاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اماں جی نہیں آئیں تو اسامہ اچھلتا ہوا اندر آیا۔

''ماما! پاپا! اور دادو آئے ہیں۔'' اس کے چہرے پر ہزار واٹ کی روشنی تھی اور میرے ہاتھ سے کتاب چھوٹ گئی۔

اور جب میں دونوں بچوں کا ہاتھ پکڑے ڈرائنگ روم میں سلام کرنے گئی تو وہ بڑے کروفر سے ٹانگ پر ٹانگ دھرے صوفے پر بیٹھا تھا اس نے مجھے ایک تمسخر بھری نظر سے دیکھا تھا لیکن یہ میرا خیال تھا وہ بھلا مجھے ایسے کیوں دیکھے گا۔ میں نے خود کو جھٹلایا اور اماں جی کے ساتھ جا بیٹھی۔

دونوں بچے جا کر باپ سے لپٹ گئے اور اس نے بھی انہیں اپنے ساتھ لپٹا لپٹا کر خوب پیار کیا تو میرے ساتھ سب کو جیسے تسلی ہو گئی۔ میرے گھر والے اس کی خاطر میں بچھے جا رہے تھے۔ امی ابو اسے دیکھ کر یوں خوش ہو رہے تھے جیسے وہ حج کر کے آئی ہے اور دونوں بھائی خواہ مخواہ اسے مخاطب کر رہے تھے جس کے جواب وہ ہوں ہاں میں دے رہا تھا۔ ہاں تو اسے ایسے ہی جواب دینا چاہیے، یہ کچھ کم تھا کہ وہ بلا کسی شرط کے خود چل کر مجھے لینے آ گیا تھا۔

اور پھر جب بھابیوں نے تین منزلہ ٹرالی کھانے پینے کے سامان سے لاد کر اس کے سامنے رکھی اور ٹیبل پر سجانے لگیں تو وہ یک دم کھڑا ہو گیا۔

''ماں جی! اب چلیں میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے میری میٹنگ ہے چھ بجے اور ساڑھے پانچ ہو رہے ہیں یہ سب پھر بھی ہوتا رہے گا۔'' اس نے ایک تحقیر بھری نظر ٹرالی پر ڈالی اور سائیڈ سے ہو کر باہر کی طرف بڑھا۔

''اسفند بیٹا! زیادہ وقت نہیں لگے گا بری بات ایسے نہیں کرتے۔'' اماں جی نے کھڑے ہو کر اسے ذرا سمجھانے کی کوشش کی۔

''تو پھر آپ آتی رہیے گا، میں چلتا ہوں۔'' اسے اب کوئی بھی نہیں سمجھا سکتا تھا۔

''چلو پھر، پھر کوئی بات نہیں۔'' اماں جی گھبرا گئیں پتا نہیں اسے کیسے ساتھ لائی

تھیں۔

''چلو خولہ چل کر گاڑی میں بیٹھو بچوں کو لے کر۔'' انہوں نے مجھے کہا۔ تو میں نے اس بے لحاظ شخص کی طرف دیکھا جس کا طنطنہ مجھے بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔

''میری میٹنگ نہ ہوتی تو میں کچھ دیر اور بیٹھتا امید ہے آپ محسوس نہیں کریں گے۔'' پتا نہیں اسے کیا خیال آیا کہ وہ پلٹ کر ابو سے بولا۔

''چلو کوئی بات نہیں تمہاری بھی مجبوری ہو گی اس لیے ہم تمہیں روکیں گے نہیں، چلو خولہ بیٹی جلدی کرو اسفند کو دیر ہو رہی ہے۔'' اس بات کے بعد اور کہنے کو کیا رہ گیا تھا بھلا۔

تھوڑی دیر بعد میں مختصر سامان کے ساتھ امی ابو اور سب گھر والوں سے مل کر چپ چاپ گاڑی میں آ بیٹھی۔

صرف اماں جی اور بچے خوش تھے وہ تینوں ہی چہک رہے تھے جبکہ میں اس بات پر بے حد خوش تھی کہ آج میرے ماں باپ کم از کم سکون کی نیند تو سوئیں گے اور میرے بھائی اور بھابیاں صبح ہلکا پھلکا ذہن لے کر بیدار ہوں گی۔ اس سے بڑی خوشی اور کیا ہو گی کہ آپ کی وجہ سے کسی کو ذرا سا ہی سہی سکون مل جائے اور میں واقعی اس بات پر بے حد خوش تھی۔



اب نہ ایسے ملیں گے ہم کبھی کسی موڑ پر تم سوچنا
اور تیرے یہ لفظ پھول ہیں کہ پتھر، تم سوچنا
جدائی سے بھی کڑا اک فیصلہ اس نے کیا
ہم روز ملیں گے مگر اجنبی بن کر، تم سوچنا
حالات سے فرار کا یہ بھی ایک طریقہ تھا
میری وہ چپ خبر تھا کہ صبر، تم سوچنا

اور اس رات جب آٹھ ماہ کے طویل عرصے کے بعد ہم گھر میں داخل ہوئے تو یوں لگا جیسے صحرا کے لمبے سفر کے بعد کوئی آبادی میں داخل ہوا ہو۔ نیہال اور بابا نے کھلے دل اور محبت سے ہمارا استقبال کیا لمحوں ہی میں بچے اچھلتے کودتے سارے گھر میں پھرنے لگے۔ میں تھوڑی دیر ان لوگوں کے پاس بیٹھی۔ اسفند یار تو ہمیں گیٹ پر ہی اتار کر اپنی میٹنگ میں چلا گیا تھا کچھ دیر بعد اماں جی نے مجھے میرے کمرے میں بھیج دیا۔

"جاؤ جا کر کچھ دیر آرام کر لو یا بچوں کے کپڑے وغیرہ ٹھیک کر لو صبح انہیں اسکول جانا ہوگا۔" تو میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

کمرہ بالکل ویسے کا ویسا ہی تھا جیسے میں چھوڑ کر گئی تھی۔ بیش قیمت فرنیچر اور پرتکلف آسائشوں سے سجا سجایا۔ ڈریسنگ ٹیبل اسی طرح میک اپ کے سامان سے اٹا پڑا تھا۔ ساری لائٹس آن تھیں حتیٰ کہ فانوس بھی جل رہا تھا جس کی جگمگ کرتی روشنی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ اے سی کی کولنگ سے کمرے میں ہلکی ہلکی خنکی پھیلی ہوئی تھی۔ بیج کلر کے ویلوٹ کے دبیز پردے اور ذرا تیز کلر کا قالین دیوار گیر خوبصورت منقش وارڈ روب میرے ڈریسز سے بھری ہوئی تھی۔ سب کچھ موجود تھا پہلے کی طرح پرکشش اور دل کو لبھانے والا۔ مگر کچھ بھی نہیں تھا۔ میرا یہاں کچھ بھی نہیں تھا یہ ایک مذاق تھا ایک دھوکا، ایک طنز، ایک فریب، ایک گمان اور بس، میں اس وقت تک اس کمرے اور اس میں موجود ہر شے کی مالک و مختار تھی جب تک اصل مالک چاہے اور اگر وہ نہ چاہے تو ایک پل میں لاکھ دوسرے میں خاک یہ کیا پیراڈوکس (وہ بات جو بظاہر غلط ہو حقیقت میں صحیح ہو) تھا۔ میرا دماغ پھٹنے لگا۔ اس رات کی ذلت بھرا نقشہ پھر سے آنکھ کے پردے پر ابھرنے لگا۔

"تم نے اپنی حماقت سے پہلے بھی اس سونے کے محل کو ٹھکرایا تھا تو تمہیں اس نعمت کی ناشکری کا خمیازہ بھگتنا پڑا تھا۔ اب ایسی غلطی نہ کرنا۔" اسفندیار تصویر میں مسکرایا۔

"بچوں کے لیے صرف بچوں کے لیے میں یہ سب سہوں گی۔" میں نے اذیت سے سوچا۔

"چلو بچوں کے لیے ہی سہی۔" وہ ذو معنی انداز میں بولا تو میں گھبرا کر باہر نکل آئی اور خواہ مخواہ اسامہ اور معاذ کو آوازیں دینے لگی۔

رات کو جب ہم کھانے کے لیے ڈائننگ ٹیبل کے گرد بیٹھے تو نوکر نے آ کر پیغام دیا کہ "چھوٹے صاحب کا فون آیا ہے کہ وہ آج رات گھر نہیں آئیں گے کسی کام سے شہر سے باہر جا رہے ہیں۔" تو اماں جی اور بابا مجھ سے نظریں چرانے لگے اور نیہاں خواہ مخواہ معاذ کو چھیڑنے لگی اور میں پوری توجہ سے اسامہ کو کھانا کھلانے لگی۔

دس بجے تک دونوں بچے سو چکے تھے اور اب میں سوچ رہی تھی کہ مجھے بھی اب سو جانا چاہیے۔ صبح ان دونوں کو تیار کر کے اسکول بھی تو بھیجنا ہے میں نے کروٹ بدلی، لیکن نیند

میری آنکھوں سے اس طرح غائب تھی جیسے کبھی آئے گی ہی نہیں میں نے پھر کروٹ بدلی ساتھ ہی خیال آیا کہ وہ اس وقت کہاں ہوگا تو میرا دم گھٹنے لگا میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

کیا اب ساری زندگی ایسے ہی گزرے گی اسی کرب و انتظار کی سولی پر لٹکتے ہوئے۔

تم تو کہتے ہو چلو یونہی صبر کیے جاؤ
صلیب وفا پر لٹکی ہوئی جاں ہماری ہے

میں اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔

چلو خیر پھر کیا ہوا، ایک تمہاری ہی نیند اڑی ہے نا کتنے لوگ تو سکون سے سوئیں گے۔ ابو امی بھائی بھابیاں اماں جی بابا اور اسفندیار بھی اگر اتنی آنکھیں بے سکون رہیں تو خدا کا عرش نہ ہل جائے۔ ایک تمہیں نیند نہ آنے سے کسی کو کچھ فرق نہیں پڑے گا اور ذرا خود سوچو یہ حماقت تو تم پہلے بھی کر چکی ہو بڑا زعم تھا تمہیں خود پر اپنی پرخلوص محبت وفا وغیرہ پر کیا نتیجہ نکلا یوں آزمانے کا، جیسے تمہارے زعم کے غبارے میں کسی نے سوئی چبھو دی ہو، اس سوئی کی چبھن کا احساس تمہیں آئندہ کبھی یہ غلطی نہ دہرانے دے گا۔

اور یہ تو میں مان گئی تھی کہ اس دنیا کے Axis (محور) میں سے ایک محور دولت بھی ہے۔ ہم لاکھ جھٹلائیں کہ دولت کی کیا حیثیت ہے۔ ہم لعنت بھیجتے ہیں اس پر۔ لیکن پچھلے آٹھ ماہ جس تکلیف و اذیت میں گزرے اس کا ایک سبب اسی دولت کی محرومی بھی تھا۔ کوشش کے باوجود میں بچوں کو امریکہ اسکول سے کسی عام اسکول میں نہیں ڈال سکی، کیونکہ یہ مجھے کسی طرح بھی گوارا نہیں تھا کہ میرے بچے اس ہائی اسٹینڈرڈ کے سکول سے کسی لو میڈیم اسکول میں جائیں۔

آپا غلط کہتی تھیں کہ سوکن تو مٹی کی بھی ہو تو نہیں برداشت ہوتی یہ تو پھر ایک جیتی جاگتی سوکن ہے کیسے برداشت ہوگی۔ نہیں آپا اگر دولت ہو تو سوکن تو کیا لوگ کئی کئی خداؤں کو برداشت کر لیتے ہیں ایک سوکن کیا چیز ہے۔" میں نے جلتی ہوئی سانس باہر نکالی۔

"دیکھو آپا میں ایک جیتی جاگتی سوکن کے باوجود کتنی عیش بھری زندگی گزار رہی ہوں۔" ایک آنسو میری آنکھ سے نکل کر دبیز قالین کے کسی ریشے میں جذب ہو گیا۔ "اس نے جانا کہاں ہے لوٹ کر بالآخر تمہارے پاس ہی آئے گا صبر کرنا حوصلہ کرنا۔" یہ امی کے الفاظ تھے آتے وقت ہاں لوٹ آئے گا جب اس کا آنا اور نہ آنا میرے لیے برابر ہوگا۔

''امی! یہ صبر تو پتھر کے پاس بھی نہیں ہوگا آپ ایک عورت سے کہہ رہی ہیں کہ اپنا شوہر کسی اور کو سونپ کر میں صبر کی تسبیح کروں۔'' نہیں ہے اتنا کلیجہ میرا۔ نہیں ہے مجھ میں صبر۔ یہ سب لے لو دولت یہ عیش یہ ٹھنڈی ہوائیں، یہ لمبی لمبی گاڑیاں یہ روشنیاں یہ زرق برق ملبوسات۔ مجھے صرف اسفند یار لا دو، خالص اسفند یار جو مجھے پہلی بار اس کمرے میں لایا تھا، وہی اسفند یار، میں قالین پر دوزانو بیٹھی زارو قطار رو رہی تھی اور میرا دل ایک ایسی خواہش کے لیے مچل رہا تھا جو میں ساری دولت دے کر بھی نہیں خرید سکتی تھی تو پھر یہ بے قراری کیسی۔

میں خود آئی ہوں اپنی مرضی سے یہ جانتے ہوئے بھی کہ اب وہ میرا نہیں نہ اس کی نظر میں میری کوئی وقعت ہے نہ حیثیت تو پھر بھی میں اپنی مرضی سے آئی ہوں تو پھر یہ رونا دھونا کیسا۔ یہ کیا اضطراب ہے۔ میرے مولا مجھے قرار دے مجھے سکون دے میں کیا کروں اتنے سارے لوگوں کو سکون دے کر مجھے سکون کیوں نہیں مل رہا۔ کیوں نہیں مل رہا۔ میرا پاگل دل سینے سے نکلنے کو مچلا جا رہا تھا اور رات بھیگتی رہی اور میرا دامن نارسائی کے جان لیوا احساس سے بھگوتی رہی اور پھر کتنی بے شمار راتیں۔

اور نیند ایک ایسی دیوی جو رات ہوتے ہی مجھ سے روٹھ جاتی اور میں رات بھر اس کی منت کرتی اسے مناتی آنسوؤں کے چراغ جلا جلا کر اس کے بھینٹ چڑھاتی مگر اس کو ترس نہ آتا۔ رات گزر جاتی اور نیند یونہی روٹھی رہتی۔



نیہاں نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا تھا وہ باقاعدگی سے اب یونیورسٹی جانے لگی تھی۔ لیکن خاص بات یہ تھی کہ اب وہ بہت خوش رہنے لگی تھی۔ پتا نہیں خرم اب بھی آتا تھا یا نہیں میں نے اس سے نہ پوچھا۔

تیسرے دن شام کو خرم آ گیا۔ وہ کل ہی جرمنی سے لوٹا تھا میرے لیے اور بچوں کے لیے بہت سے تحائف لایا تھا وہ اسی طرح تھا بے تحاشا باتیں کرنے والا اور بے تکی باتوں پر بے تحاشا ہنسنے والا۔ اس نے مجھ سے کچھ نہ پوچھا نہ میں نے کوئی گلہ کیا بس یوں لگا جیسے درمیان میں آٹھ ماہ آئے ہی نہیں تھے۔

''بھابی! آپ کو پتا ہے نیہاں نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا ہے۔'' وہ ایک دن مجھ سے کہنے لگا۔

''بھئی، یہ بھی کوئی بات ہے کرنے والی اب تو اس کا پریویس بھی ختم ہونے والا ہے۔ تمہیں نہیں پتا۔'' میں نے چائے کپ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''ہاں مجھے پتا ہے مگر۔''

''مگر کیا؟'' میں نے کپ اس کے آگے کھسکایا۔

''بھابی! آپ نیہاں سے بات کریں۔'' وہ جیسے سوچ کر بولا۔

''کیا بات کروں؟'' میں نے اپنا کپ اٹھا لیا۔

''میرے متعلق بات کریں اس کی رائے پوچھیں۔ کیونکہ میں تایا جان سے بات کرنا چاہتا ہوں، بہت مذاق ہو گیا؟'' وہ سنجیدہ تھا۔

''اچھا تو اب تک مذاق کر رہے تھے۔'' میں نے یونہی کہا۔

''نہیں میں سچ کہہ رہا ہوں۔ پلیز آپ اس سے بات تو کریں۔'' وہ کچھ لجاجت سے بولا۔

''اگر وہ نہ مانی اس نے انکار کر دیا تو؟'' اس کے چہرے کی روشنی بجھ گئی۔

''پھر؟'' وہ جیسے کھو سا گیا۔

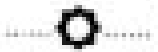
''پھر کی پھر دیکھیں گے آپ بات تو کریں۔'' وہ سنبھل کر بولا۔

''تم کہتے ہو تو کر لوں گی بات۔'' اسی وقت اسفند یار کی گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ وہ گاڑی سے اتر کر سیدھا ہماری ہی طرف آیا۔

''ہیلو کیا ہو رہا ہے؟'' اس نے رسماً خرم سے ہیلو کہا۔

''آیئے اسفند بھائی! چائے پیئیں۔''

''تھینک یو میں ذرا جلدی میں ہوں۔'' وہ اب تیکھی نظر مجھ پر پھینک کر اندر چلا گیا۔ اور مجھے بھلا اب ان نظروں کی پروا کب رہی تھی۔



''اس کی محبت نے مجھے بیگی کی دوزخ میں پھینک دیا۔ میں سلگ رہی ہوں میں جل رہی ہوں'' نیہاں کوئی نظم پڑھ رہی تھی اس کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا جب میں اندر داخل ہوئی۔

''آیئے بھابی!'' وہ مجھے دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔

"کیا کر رہی تھیں۔" میں نے کتاب یونہی اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے پوچھا۔

"یونہی بس اب تو سونے لگی تھی۔" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"کیسی جا رہی ہے تمہاری اسٹڈیز۔" میں نے رسماً پوچھا۔

"بس ٹھیک ٹھاک۔ اسامہ اور معاذ سو گئے کیا۔"

"ہاں دونوں سوئے ہیں تو آئی ہوں۔ سوتے نہیں جلدی۔ صبح پھر اٹھنے میں سستی کرتے ہیں۔"

"چھوٹے ہیں نا ابھی۔" ہمارے درمیان کبھی بہت زیادہ باتیں نہیں ہوئی تھیں۔ نیہاں اماں جی کی طرح کم گو تھی۔

"نیہاں! ایک بات پوچھوں؟" آخر کسی طرح تو بات شروع کرنی ہی تھی۔

"جی پوچھیں۔" وہ کچھ تجسس سے بولی۔

"تمہارا خرم کے بارے میں کیا خیال ہے۔" اس کی بھنویں تن گئیں۔

"آپ یہ کیوں پوچھ رہی ہیں؟" وہ کچھ دیر بعد بولی۔

"یونہی، کیا نہیں پوچھ سکتی؟"

"نہیں پوچھ سکتی ہیں، لیکن بے وجہ نہیں۔ کس نے کہا ہے یہ پوچھنے کے لیے۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"چلو جس نے بھی پوچھا ہے تمہیں بتانے میں کیا حرج ہے۔"

"ہے حرج، آپ پہلے مجھے بتائیں کیوں پوچھ رہی ہیں؟"

"بابا مجھ سے خرم نے کہا تھا کہ میں تم سے پوچھوں۔" میں نے زچ آ کر کہا۔

"کس سلسلے میں؟" وہ خشک لہجے میں بولی۔

"ظاہر ہے۔ تمہیں تھوڑا بہت تو اندازہ ہوگا ہی اس کی فیلنگز کا؟" میں نے اسے ٹٹولتی نظروں سے دیکھا۔

"اگر آپ شادی کے سلسلے میں پوچھنا چاہ رہی ہیں تو میں اس سے شادی نہیں کر سکتی یہ بات اماں جی کو بھی بتا چکی ہوں۔" وہ دوٹوک لہجے میں بولی۔

"کیا میں وجہ پوچھ سکتی ہوں اس کی کون سی بات تمہیں اس قدر ناپسند ہے۔ کہ تم اس طرح اس کے پرپوزل کو ریجیکٹ کر رہی ہو۔" میں نے کچھ ناگواری سے پوچھا۔

"کوئی خاص وجہ نہیں بس وہ نہیں۔" وہ زور دے کر بولی۔

"پھر کون؟" میں نے سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں تو وہ گڑبڑا سی گئی۔

"کوئی نہیں۔" وہ نظریں چرا کر بولی۔

"نہیں میں نہیں مان سکتی کہ خرم جیسے شخص کو کوئی لڑکی یونہی ٹھکرا دے اس کی وجہ یقیناً کوئی اور ہے اگر تم مجھے بتانا نہیں چاہ رہیں تو الگ بات ہے۔" تو وہ جیسے سوچ میں پڑ گئی۔

"بھابی آپ یہ باتیں مجھ سے خرم کی بھابی کی حیثیت سے پوچھ رہی ہیں یا میری۔" اس نے میری وفاداری کو جانچنا چاہا۔

"صرف تمہاری بڑی بہن کی حیثیت سے خرم کی بات کا جواب تم دے چکی ہو، اب صرف تمہاری بات ہو رہی ہے۔" وہ انگلیاں چٹخانے لگی۔

"وہ بھابی ہماری یونیورسٹی میں۔" وہ چپ کر گئی۔

"کوئی کلاس فیلو ہے؟"

"نہیں وہ ہمارے پروفیسر ہیں اردو کے۔ سر فیضان۔ میں کیا کروں وہ مجھے بہت پسند ہیں۔" وہ معصوم سی لڑکی جیسے بے بس ہو کر بولی۔

"کیا وہ بھی تمہیں پسند کرتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"تو اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"انہیں تو معلوم ہی نہیں۔ میں نے کئی بار کوشش کی مگر وہ ہر بار مجھے ٹال دیتے ہیں۔" آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔

"یہ کیسی عجیب بات ہے کوئی ہماری محبت کا متلاشی ہے اور ہم اس سے نالاں اور جس کی چاہ کی ہمیں طلب ہے وہ ہم سے بے خبر۔"

"پھر؟" میں نے اسے دیکھا۔

"میں بات کروں گی ان سے، لیکن بھابی پلیز ابھی کسی سے ذکر نہ کیجیے گا اور خرم تو بالکل نہیں میں کیا کروں میں نے بہت کوشش کی لیکن میرا دل نہیں مانتا۔" اس نے چہرہ صاف کیا۔

"چلو کوئی بات نہیں تم ان سے بات کرو پھر دیکھیں گے زیادہ ٹینس ہونے کی ضرورت نہیں۔ ایسا ہو جاتا ہے۔ ٹھیک ہے اب سو جاؤ۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا

تو اس نے یونہی سر ہلا دیا۔

اور میں مرے مرے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف یوں بڑھی جیسے کوئی چڑیا مقتل کا رخ کرتی ہے۔ جہاں اس کے پر کاٹ کر اڑنے کا حکم دیا جائے۔ نامہربان نیند میرے استقبال کو تیار تھی ایک دوزخ تو میرے اندر بھی سلگ رہا تھا ہر لمحہ آنچ دیتا ہوا۔



اور پھر کتنے ہی سارے دن چپ چاپ گزر گئے۔ میں نے خرم کو حتی الامکان نرم لفظوں میں نیہاں کا مطمع نظر سمجھا دیا کہ ابھی وہ ماسٹرز کرنا چاہتی ہے تم انتظار کرنا چاہتے ہو تو کرلو پتا نہیں کیوں میں نے اسے پھر انتظار کی آس دلا دی تھی کوشش کے باوجود میں اس کا دل نہیں توڑ سکی تھی۔

اسفند یار کا وہی رویہ تھا حقارت بھرا یا سرد وہ تقریباً ہفتے کی پانچ راتیں ادھر ہی گزارتا اور اگر دل چاہتا تو ایک آدھ رات خیرات میں میری جھولی میں ڈال دیتا۔ لیکن اب میں نے بھی لبوں کو سی لیا تھا کہ شکوے کی جو آہ یا سی، سی آواز ہوتی ہے۔ وہ بھی کبھی میرے منہ سے نہ نکلی۔

بس جیسے میں نے خود کو ڈھال لیا تھا، حالات کے تقاضے کے مطابق اب زندگی کچھ سہل ہو گئی تھی۔ میری نہ کسی مجھ سے متعلقہ بہت سے لوگوں کی۔

امی ابو کی طرف سے پہلے کی طرح ہفتوں بعد ایک آدھ گھنٹے کے لیے جاتی انہیں جھوٹی سچی کہانی سنا آتی کہ اسفند یار واپس آ گیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ وہ اس میں خوش ہو جاتے۔

اگرچہ میں نے بچوں سے بھی کچھ نہ کہا تھا۔ لیکن وہ خود ہی باپ سے نالاں رہنے لگے تھے کہ وہ انہیں ٹائم کیوں نہیں دیتا۔ وہ جب بھی گھر آتا وہ یا تو اس سے بھی شکوہ کرتے یا سیدھے منہ بات نہ کرتے، وہ اس کا الزام بھی مجھ پر دھر دیتا کہ میں انہیں یہ پٹی پڑھا رہی ہوں میں محض سر ہلا کر رہ جاتی یا مسکرا دیتی یا خاموشی سے وہاں سے ہٹ جاتی۔

اس روز ابھی گیارہ ہی بجے تھے میں باہر لان میں مالی کو لان کی صفائی کا کہہ رہی تھی جب نیہاں یونیورسٹی سے لوٹ آئی وہ تیز قدموں سے چلتی ہوئی بلکہ دوڑتی ہوئی میرے پاس سے گزر گئی مجھے لگا کہ وہ رو رہی ہے۔

پہلے میں نے نظر انداز کرنا چاہا مگر پھر ایسا نہ کر سکی اور اس کے کمرے کی طرف

بڑھی۔

وہ بیڈ پر اوندھی لیٹی ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

''نیہاں! نیہاں! کیا ہوا ہے کیوں رو رہی ہو؟'' میں اس کے پاس بیٹھ کر بولی مگر وہ اسی طرح روتی رہی۔

''نیہاں! کیا بات ہے طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟ اتنی جلدی کیوں آ گئیں ابھی تو ڈرائیور بھی گھر پر تھا تم کیسے آ گئیں۔''

''بھابی! بھابی! وہ ایک دم میری گود میں لیٹ کر زور زور سے رونے لگی۔

''نیہاں، گڑیا مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے کیوں ایسے رو رہی ہو اماں جی کو پتا چل گیا تو وہ پریشان ہوں گی۔'' میں نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''بھابی! بھابی! میں نے آج سر سے بات کی۔'' وہ اسی طرح لیٹے لیٹے گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔

''پھر اس میں رونے والی کون سی بات ہے۔'' میں نے اس کا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

اس کے دائیں گال پر ہاتھ کی انگلیوں کے نشان تھے اور چہرہ ویسے ہی سرخ ہو رہا تھا میں گھبرا گئی۔

''کیا ہوا ہے نیہاں بتاؤ مجھے پلیز۔'' میں نے چہرہ اس کی طرف جھکاتے ہوئے کہا۔

''وہ پیریڈ لے کر نکلے تو میں نے ان سے کہا کہ مجھے ان سے ایک ضروری بات کرنی ہے تو انہوں نے کہا کہ میں یہیں بات کروں، مگر میں نے ان سے کہا کہ میں علیحدگی میں بات کرنا چاہتی ہوں۔ وہ مجھے اپنے آفس میں لے گئے۔'' وہ یہاں تک بتا کر پھر رونے لگی میں پریشان ہو گئی۔

''پھر، پھر کیا ہوا؟'' میں بے قراری سے بولی۔

''میں نے ان سے کہہ ڈالا کہ وہ مجھے اچھے لگتے ہیں اور یہ کہ میں ان سے شادی، انہوں نے بنا کسی لحاظ کے میرے منہ پر طمانچہ دے مارا اور اتنی زور زور سے ڈانٹنے لگے کہ باہر کھڑے طلبہ کا گروپ بھی اندر آ گیا انہوں نے اتنی فضول باتیں سنائیں اور میں بھاگی ہوئی

باہر آ گئی۔ سب کے سامنے بھی وہ بولتے رہے۔" وہ پھر رونے لگی اور مجھے کچھ سمجھ نہ آیا کہ اسے کیسے تسلی دوں۔

"نیہاں! یہ تم نے غلط کیا اس طرح بات نہیں کرتے۔" میں نے اسے سمجھانا چاہا۔

"انہوں نے اتنی فضول باتیں کیں کہ ہم لڑکیاں یونیورسٹی میں پڑھنے نہیں بلکہ اپنے رشتے ڈھونڈنے آتی ہیں اور یہ کہ ہماری شرم و حیا بالکل فنا ہو گئی ہے جو ہمیں استاد کے رشتے کا بھی لحاظ نہیں رہا۔ میں نے تو میں نے تو۔" وہ پھر رونے لگی۔

"کیا وہ ان میرڈ ہیں۔" میں نے یونہی پوچھا۔

"نہیں میرڈ ہیں۔" مجھے جھٹکا لگا تھا۔ "بھابی! ان کی مسز اس قدر بدصورت ہیں کہ میں کیا بتاؤں آپ کو پھر بھی انہوں نے میری محبت کو ٹھکرا دیا۔" میرا دل چاہا کہ اب ایک تھپڑ میں اس بیوقوف کے منہ پر لگاؤں بھلا محبت کا معیار خوب صورت کب ہے یہ تو بس ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔"

جب اماں جی مجھے بیاہ کر لائی تھیں تو ویسے والے دن سب لوگ کہہ رہے تھے کہ وہ تو کوہ نور لے آئی ہیں اپنے گھر میں۔ اور آج وہی کوہ نور کوئلے سے بھی بدتر ہے کہ اسفند یار اسے جوتی پر نہیں گنتا۔ کب ہے محبت کا معیار خوب صورتی اور خوب صورت چہرے۔ یہ تو بس کوئی جنون ہے یا کوئی ابال ہے جو سب کچھ بہا کر لے جاتا ہے۔ نہ کچھ سجھائی دیتا ہے محبوب کے سوا نہ دکھائی دیتا ہے یہ بات مجھ سے بڑھ کر کون جانے گا۔

"اچھا تو حوصلہ کرو۔ یوں دل چھوٹا نہیں کرتے۔ اس پروفیسر پر دنیا ختم نہیں ہوتی۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچنا تمہیں خود اپنی یہ خواہش احمقانہ لگے گی کہ ایک شادی شدہ مرد سے محبت کہاں کنارے لگتی ہے۔" میں نے اسے بہلایا۔

"کیوں کیوں نہیں لگتی کنارے۔ کیا اسفند بھائی پہلے سے۔" آدھا فقرہ اس کے منہ ہی میں تھا جب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور میں اسے محض دیکھ کر رہ گئی اور خاموشی سے اٹھ کر باہر آ گئی۔



اس واقعے سے مجھے یہ تو اندازہ ہو گیا تھا کہ نیہاں اچھی خاصی احمق ہے۔ لیکن یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اس حماقت میں عقل کی ساری حدود پھلانگ جائے گی لیکن اگر دیکھا جائے تو سب سے بڑی حماقت تو محبت کرنا ہی ہے کہ محبت کرنے کے بعد کسی اور حماقت کی کسر باقی نہیں رہ جاتی۔

محبت ہے کیا اپنی ذات کی نفی۔ اپنی جان اپنی تمناؤں کی نفی کرنا محبت ہے۔ وہ ایک سمجھدار اور باشعور لڑکی تھی وہ ان لوگوں میں سے تھی جو دوسروں کی عزت کرتے تھے اور اپنی تکریم انہیں سب سے بڑھ کر عزیز ہوتی تھی جس کی خاطر وہ اپنی ہر خواہش کا گلا گھونٹ جاتے ہیں لیکن محبت ایسا گورکھ دھندا ہے جس میں جو کوئی الجھتا ہے وہ اپنی عزت اپنی تکریم اپنے منصب کو قطعاً فراموش کر کے اس درجے تک جھک جاتا ہے کہ خود کو جھٹلا بیٹھتا ہے اپنے ہی وجود سے منکر ہو جاتا ہے، صرف محبوب ہی مد نظر رہ جاتا ہے کہ اس نے اپنی اور اپنے والدین کے اسٹیٹس کی پرواہ کیے بغیر اتنی بڑی بات کہہ ڈالی۔ ہاں محبت نری خواری ہے اور جس کو اپنی عزت پیاری نہیں وہ اس کارزار میں قدم رکھے۔ اسفند یار اس نے کیا کیا اپنی عزت اپنے Statuse (قد و قامت) کو نظر انداز کر دیا اور اب نیہاں۔ میں نے گہرا سانس لیا۔

اور اس جذبے کی گہرائی کو دیکھنے والے نہیں جانچ سکتے نہ سمجھ سکتے ہیں۔ کہ یہ کیسا خسارے کا سودا ہے کہ آدمی اپنا بھی خیر خواہ نہیں رہتا بس جھک جاتا ہے بنا دام کے بک جاتا ہے۔

اور جب اس رات میں ٹہل ٹہل کر تھک گئی جلن کی آگ میں سو بار جل جل کر خاکستر ہو گئی تو بستر پر جا گری نیند تو نہ آئی بس بدن و دماغ تھکن سے چور چور ہو گئے نہ معلوم کتنی دیر تک میں نیند سے جنگ لڑتی رہی اس کے بعد کچھ دیر کو میری آنکھ لگ گئی کہ ایک دم سے مجھے پیاس نے اٹھا دیا۔ میرا حلق کانٹے کی طرح سوکھ رہا تھا میں اٹھ بیٹھی اور پانی لینے باہر کچن کی طرف بڑھ گئی۔ پانی پی کر واپس کمرے کی طرف جانے لگی کہ کسی خیال کے تحت میرے قدم اپنے آپ نیہاں کے کمرے کی طرف اٹھ گئے اس کے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔

میں نے آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر جھانکا تو وہ اپنے بستر پر اوندھی لیٹی تھی میں نے گہرا سانس لیا اور آگے بڑھ کر چادر اس کے اوپر ڈالنے لگی کہ اچانک سائیڈ ٹیبل پر پڑی سلیپنگ پلز کی منہ کھلی شیشی پر میری نظر پڑی میری جان ہی نکل گئی میں نے جلدی سے شیشی اٹھائی اس میں صرف دو گولیاں پڑی تھیں۔

''نیہاں نیہاں!'' میں نے گھبرا کر اسے پکارتے ہوئے سیدھا کرنا چاہا۔ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا میں نے جلدی سے اس کی نبض ٹٹولی جو مدھم سی چل رہی تھی میں اسے ایسے ہی چھوڑ کر اماں جی کے کمرے کی طرف دوڑی اور ہلکی سی ان کے دروازے پر دستک دی۔ پہلی ہی دستک پر وہ دروازہ کھول کر باہر آ گئیں شاید وہ پہلے سے جاگ رہی تھیں۔

''کیا ہوا خیریت تو ہے خولہ تم اس وقت۔'' انہوں نے حیرت سے میری حواس باختہ شکل کو دیکھ کر پوچھا۔

''وہ، اماں جی نیہاں!'' مارے گھبراہٹ کے میرے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

''کیا ہوا نیہاں کو؟'' اماں نے آہستگی سے اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

''وہ اندر اس نے، آپ آئیں میرے ساتھ۔'' میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا تو وہ پریشان ہو کر میرے ساتھ چل پڑیں۔

وہ اسی طرح بے سدھ پڑی تھی۔ ڈھیلے ڈھالے ہاتھ پاؤں اور بے جان جسم اماں جی کو بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔ وہ بے قراری سے آگے بڑھیں اور بیڈ سے نیچے لٹکتا اس کا ہاتھ پکڑ کر پاس ہی بیٹھ گئیں۔

''ک کیا ہوا خولہ اسے نیہاں نیہاں!'' ان کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

''اماں جی یہ۔'' میں نے خالی شیشی اٹھا کر ان کے آگے کی، یہ اس نے گولیاں کھا لی ہیں۔''

''کیوں کیسے نیہاں بچی یہ کیا کیا۔'' نیہاں۔'' وہ اس کا زرد پڑتا چہرہ ہاتھوں میں لے کر تھپتھپانے لگیں۔

''وہ ڈرائیور بھی آج چھٹی پر ہے اب کیا کریں۔'' بابا کو اٹھا دوں۔'' میں نے ایک بار پھر اس کی مدھم پڑتی نبض کو ٹٹول کر کہا۔

''نہ نہیں انہیں نہ اٹھانا وہ اس سے پہلے گزر جائیں گے کچھ کرو۔'' اسفند کہاں ہے؟'' وہ جیسے پوچھ کر خود ہی شرمندہ ہو گئیں۔

''نیہاں! نیہاں میری بچی! یہ کیوں کیا تم نے۔'' وہ اس کے چہرے پر سر رکھ کر رونے لگیں۔

''میں دیکھتی ہوں کچھ۔'' میں کہہ کر تیزی سے باہر نکل آئی۔

''کیا کروں ڈرائیور کے علاوہ اور کسی نوکر کو ڈرائیونگ بھی نہیں آتی کیا کروں؟'' میں ہاتھ ملتے ہوئے پریشانی سے اپنے کمرے میں آئی۔

''اسفند کو فون کرتی ہوں۔'' ایک دم سے مجھے وہ خاکی لفافہ یاد آیا وہ اس کے کپڑوں والے خانے میں ابھی بھی پڑا ہوا تھا۔

میں نے جلدی سے الماری کھول کر وہ لفافہ نکالا اور جلدی سے سارے کاغذات میز پر الٹا دیے، وقت وقت کی بات ہے یہ لفافہ اور اس میں موجود ایک ایک لفظ سے مجھے اس قدر شدید نفرت تھی کہ میں نے قسم کھائی تھی کہ کبھی دوبارہ اس لفافے کو ہاتھ نہیں لگاؤں گی۔

میں نے جلدی سے فون نمبر والی چٹ نکالی اور کانپتے ہاتھوں سے نمبر ڈائل کیے دوسری طرف بیل جانے لگی۔ تقریباً چھ سات گھنٹیوں کے بعد کسی نے فون اٹھایا۔

''ہیلو ہیلو!'' میں نے بے قراری سے کہا۔

''ہیلو کون؟'' دوسری طرف سے نیند میں ڈوبی ہوئی لیلیٰ کی آواز تھی۔

''وہ اسفند صاحب ہوں گے۔'' میں نے آواز کی لڑکھڑاہٹ پر قابو پاتے ہوئے کون سا سوال قصداً ہضم کیا۔

''آپ کون بول رہی ہیں'' دوسری طرف سے تیکھے چتون سے پوچھا گیا شاید اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔

''کون کو چھوڑیں یہ بتائیں۔ اسفند صاب موجود ہیں۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

''جب تک آپ یہ نہیں بتائیں گی کہ آپ کون ہیں میں آپ کے سوال کا جواب نہیں دوں گی۔'' دوسری طرف سے ہٹ دھرمی سے کہا گیا۔

''اسفند صاحب کو پیغام دے دیں کہ ان کے گھر سے فون آیا ہے سخت ایمرجنسی ہے ان کی سسٹر نیہاں موت و حیات کی دہلیز پر کھڑی ہے اور ڈرائیور چھٹی پر ہے وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر پہنچ جائیں ورنہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

میں نے ایک ہی سانس میں کہہ کر اس کا جواب سنے بغیر ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

میرا سانس یوں پھول رہا تھا، جیسے میں نے ایک لمبی مسافت دوڑ کر طے کی ہو۔ چند لمحے میں نے خود کو سنبھالنے میں لگائے اور پھر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

"اگر اس نے اسفند کو نہ بھیجا تو۔" میں نیہاں کے کمرے میں پہنچتے ہی یہ سوچ کر کانپ اٹھی۔

"کیا کیا ہے؟" اماں جی میری صورت دیکھ کر کھڑی ہو گئیں ان کی آنکھیں اور ناک سرخ ہو رہے تھے۔

"جی وہ فون کر کے آئی ہوں اسفند کو۔" میں نے نظریں چرا کر نیہاں کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

"وہ خود ملا تھا۔" وہ بے چینی سے بولیں۔

"نہیں میں نے پیغام دے دیا ہے۔" میں نے نیہاں کی ہتھیلیاں رگڑتے ہوئے کہا۔

"پتا نہیں کتنی دیر میں آئے وہ۔ میری بچی تو جان سے چلی جائے گی۔" وہ بیڈ کے پاس قالین پر بیٹھ کر رونے لگیں۔

"حوصلہ کریں اماں جی! میں ایمبولینس منگوا لیتی ہوں فون کر کے۔ ہاں یہ ٹھیک ہے۔" میں ایک دم کھڑی ہو گئی۔ یہ خیال مجھے پہلے کیوں نہیں آیا، میں تیز قدموں سے باہر کی طرف بڑھی اور جلدی جلدی ہاسپٹل کا نمبر ملانے لگی، فون کرنے کے بعد میں اندر جانے کے بجائے باہر گیٹ کی طرف بڑھی، سات آٹھ منٹوں بعد ہی باہر سے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکیں اور ہارن زور زور سے بجنے لگا چوکیدار جلدی سے گیٹ کھولنے لگا میں واپس اندر کی طرف بھاگی کہ جا کر اماں جی کو خبر کروں۔



اس پوری رات اسے آئی سی یو میں رکھا گیا بابا کو تو میں نے بتایا..... کہ اسے فوڈ پوائزننگ ہو گئی تھی اماں جی سارا ٹائم جائے نماز پر بیٹھی رو رو کر نماز حاجت پڑھتی رہیں اور

یہ شاید ایک ماں کے دکھی دل کی دعائیں ہی تھیں جو خدا نے روٹھی ہوئی زندگی پھر سے اس کی جھولی میں ڈال دی۔ خرم اگلے روز صبح ہی آ گیا تھا اور شام تک جب ڈاکٹروں نے اس کی حالت خطرے سے باہر ہونے کی اطلاع دی تھی۔ وہ گم صم ویٹنگ روم میں بیٹھا رہا تھا۔ اسے بھی وجہ فوڈ پوائزننگ ہی بتائی گئی تھی۔

ایمبولینس کے آنے سے پہلے اسفند یار پہنچ گیا تھا، اس نے اسٹارٹ گاڑی گیٹ کے باہر کھڑی کی تھی اور اڑتا ہوا نیہاں کے کمرے میں پہنچا تھا، اور لمحوں میں اسے کسی چڑیا کی طرح اپنی بانہوں میں اٹھا کر باہر لے گیا تھا میں تیزی سے پچھلی سیٹ پر جا بیٹھی اماں جی گھر رہیں میں نے ہاسپٹل جا کر انہیں فون کیا پھر وہ دن نکلنے پر بابا کے ساتھ ہاسپٹل آئی تھیں۔ بابا اور خرم تو فوڈ پوائزننگ سے مطمئن ہو گئے تھے لیکن جب شام کو ڈاکٹرز نے اسے کمرے میں شفٹ کرتے ہوئے میڈیکل رپورٹس اسفند یار کے ہاتھ میں پکڑائیں تو انہیں پڑھتے ہوئے اس کے ماتھے کی شکنیں لمحہ بہ لمحہ بڑھنے لگیں۔ خرم نے آگے ہو کر رپورٹس پڑھنا چاہیں تو اس نے سرد مہری سے انہیں فولڈ کر کے ہاتھ میں پکڑ لیا خرم کو بابا نے آواز دے کر اپنے پاس بلایا تو اسفند یار کڑے تیوروں کے ساتھ میری طرف بڑھا۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے رپورٹس کا رول میرے آگے کرتے ہوئے مدھم مگر تیکھی آواز میں غراتے ہوئے کہا۔

"ظاہر ہے جو ڈاکٹرز نے تشخیص کیا ہو گا وہی ہو گا۔" میں نے کچھ بے نیازی سے کہا۔

"جب اس نے یہ حرکت کی تو تم کہاں تھیں؟" اس کا سوال اتنا فضول تھا کہ میرا دماغ گھوم گیا۔

"مسٹر اسفند یار! میرا اس سے جو بھی تعلق بنتا ہے وہ آپ کے حوالے سے ہے اور معاف کیجیے گا یہ سوال تو مجھے آپ سے کرنا چاہیے تھا کہ اسنے جب یہ حرکت کی تو اس وقت آپ کہاں تھے؟" میں نے چبا چبا کر ایک ایک لفظ ادا کیا تو اس کے بدن کا سارا خون جیسے چہرے میں سمٹ آیا۔

"شٹ اپ! اگر ہاسپٹل نہ ہوتا تو شاید اس کا جواب شٹ اپ کی عملی تفسیر ضرور ہی

ہوتا۔

پھر نیہاں پورے ایک ہفتے ہاسپٹل میں رہی اور اس دوران اسفند یار ہر رات اس کے پاس ہوتا یا اگر گھر جاتا بھی تو آدھی رات کے بعد وہ بھی اگر میں نیہاں کے پاس ہوتی۔

اس کو کہتے ہیں اپنا خون اور اپنے خون کی کشش۔ اپنی بہن کی ذرا سی تکلیف نے اسے سب کچھ بھلا دیا تھا حتیٰ کہ لیلیٰ بھی۔ جو گزشتہ ڈیڑھ سال سے اس کے لیے ہر رشتے کے مقابلے میں Priority (پہلی ترجیح) تھی۔

میرا خیال تھا کہ وہ نیہاں کے گھر جاتے ہی اس سے اس حرکت کا سبب ضرور دریافت کرے گا، کیونکہ یہ آٹھ دن اس نے مبہم سی خاموشی سے ساتھ گزارے تھے اور اس کی اس طرح کی خاموشی کا نتیجہ عموماً شدید غصے کی شکل میں نکلا کرتا تھا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا، نیہاں کو گھر آئے تیسرا روز تھا اور اسفند یار اتنے دن سے مسلسل راتیں ادھر ہی گزار رہا تھا، خدا جانے اس نے کیا سوچا تھا۔

خرم روز شام کو آجاتا۔ نیہاں کی بے اعتنائی اس کے ساتھ ہنوز ویسی ہی تھی اسے دیکھ کر وہ یا تو کروٹ بدل لیتی یا آنکھوں پہ بازو رکھ کر سوتی بن جاتی یا پھر کہہ دیتی بھائی میں سونا چاہتی ہوں اور وہ بھی اس قدر ڈھیٹ تھا مجال ہے، جو اس کے اس سرد اور بے مہر رویے کا ذرا بھی برا مانتا وہ ہر روز اسی خوش دلی اور محبت سے ڈھیروں ڈھیر پھل اور پھول اٹھائے چلا آتا۔

واقعی محبت دیوانگی ہے اور دیوانوں کو کیا خبر ہوتی ہے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔

اس روز نیہاں بالکل ٹھیک تھی چہرے کی زردی کچھ سرخی میں تبدیل ہو چکی تھی اگرچہ وہ ابھی بھی صدمے کی زیر اثر تھی اور بہت کم بات کرتی تھی لیکن اس کے باوجود وہ میڈیکلی بالکل فٹ تھی اور سب کے اصرار پر رات کے کھانے پر ڈائننگ ٹیبل پر موجود تھی۔ اسفند یار بھی موجود تھا اور اسامہ اور معاذ کو بڑے لاڈ سے کھانا کھلا رہا تھا۔ کھانا خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔ اماں جی نیہاں کو بڑے اصرار سے مختلف ڈشیں پیش کر رہی تھیں۔

”نیہاں بیٹا! اب تمہارے کیا ارادے ہیں؟“ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد بابا نے شاید یونہی نیہاں سے پوچھا۔

”جی بابا کیا مطلب؟“ وہ کچھ حیرانی سے بولی۔

”میرا مطلب ہے یونیورسٹی کے متعلق۔“ انہوں نے وضاحت کی تو اس کے چہرے کا رنگ جیسے بدل سا گیا اس نے نظریں جھکا لیں لیکن لرزتی پلکیں اس کے ذہنی اضطراب کا پتا دے رہی تھیں یا شاید وہ آنسوؤں کا رستہ روک رہی تھیں۔

”تم نے جواب نہیں دیا بیٹا۔“ وہ نرمی سے بولے۔

”ابھی تو بابا! کچھ ارادہ نہیں۔“ اس نے انگلیاں چٹخاتے ہوئے جھکی نظروں سے کہا۔

”ہوں میرا خیال ہے کافی پڑھائی ہو گئی اب تم پڑھنے کا خیال دل سے نکال دو کیوں کہ میں نے کچھ اور فیصلہ کیا ہے۔“ اماں جی اور اسفند یار یوں بیٹھے تھے جیسے پہلے سے باخبر ہوں۔

”تمہاری ضد تھی آگے ایڈمیشن لینا۔ اب تمہارا شوق بھی پورا ہو گیا ہے اور اب تم اپنا وعدہ بھی پورا کرو جو تم نے کیا تھا کہ ایک بار میں تمہیں اجازت دے دوں پھر تم میری ہر بات مانو گی یاد ہے نا تمہیں۔“ وہ اسے کچھ یاد دلا رہے تھے اس نے سر ہلا دیا۔

”میں نے خرم سے تمہاری شادی کا فیصلہ کیا ہے۔ اسی مہینے کا آخری ہفتہ یا اگلے مہینے کا پہلا ہفتہ۔ میرا خیال ہے اب تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔“ اس نے تڑپ کر باپ کی طرف دیکھا۔

”نہیں بابا میں اپنا ماسٹرز کمپلیٹ کرنا چاہتی ہوں۔“ اس نے بھیگی بھیگی آواز میں احتجاج کیا۔

”بس بہت ہو گیا یہ ماسٹرز واسٹرز کا ڈرامہ جو بابا کہہ رہے ہیں ٹھیک ہے بہت تم نے من مانی کر لی۔ اب مزید تمہیں ڈھیل دے کر اپنی عزت سے کھیلنے کی اجازت نہیں دیں گے۔“ اسفند یار جو کب سے ضبط کیے بیٹھا تھا ترش لہجے میں بولا۔

”بھائی! اگر میں نے کچھ کیا ہے تو اپنے ساتھ کیا ہے۔ آدھے شہر کی آہیں نہیں سمیٹیں۔ لوگوں کے دلوں کو ٹھوکر نہیں ماری اور نہ آپ کی طرح اپنے ماں باپ کی عزت کو دو ٹکوں میں بک جانے والیوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنایا ہے۔“ وہ بھی اسفند یار کی بہن تھی۔ بھلا اتنی بڑی بات پر چپ رہ جاتی۔

"شٹ اپ!" اس نے کھڑے ہوتے ہوئے زور سے کرسی کو لات ماری اور کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ سب ایک لمحے کو چپ رہ گئے۔

"اسفند ٹھیک کہتا ہے اب میں کوئی عذر نہیں سنوں گا۔" بابا نے جاتے جاتے اسے یاد دلایا تو اس نے شکایت بھری نظروں سے باپ کو دیکھا اور پھر اماں جی کے بازو پر سر رکھ کر رونے لگی۔



پھر وہی ہوا جو اسفند یار اور بابا نے چاہا۔ اگلے مہینے پورے دھوم دھڑکے سے نیہاں اور خرم کی شادی ہوگئی۔ شادی کا فنکشن کسی جشن سے کم نہیں تھا اسفند یار اور بابا کا شمار اگر شہر کے پائے کے صنعت کاروں میں ہوتا تھا تو دوسری طرف خرم نے بھی بزنس سرکل میں بہت تھوڑے عرصے میں خود کو منوا لیا تھا۔ وہ اس وقت کروڑوں کی آسامی تھا سو شادی کا فنکشن کسی جشن سے کم تو نہیں ہوسکتا تھا شہر بھر کی کریم نے شادی میں شرکت کی۔ شادی میں دونوں طرف سے مجھے بھرپور طریقے سے حصہ لینا پڑا۔ نیہاں کی بھابی کی حیثیت سے بھی اور خرم کی بہن کی حیثیت سے۔ جہیز اور بری دونوں کی شاپنگ اور تیاری جیسے میں گھن چکر بن کر رہ گئی ایک ماہ کی قلیل مدت میں ساری تیاری کی گئی۔

شادی سے ایک دن پہلے اماں جی کو لیلیٰ کا پیغام ملا کہ وہ شادی میں شرکت کرنا چاہتی ہے پیغام اسفند یار کا دوست صفدر حیات ہی لایا تھا اماں جی نے سختی سے اسے گھر میں کسی بھی حیثیت سے قدم رکھنے سے منع کر دیا۔

"اس سے کہنا خدا نے اسے جتنی عزت دے دی ہے اسے ہی ہضم کر لے تو بڑی بات ہے اتنے اونچے اونچے خواب نہ دیکھے اس گھر کی صرف ایک بہو ہے خولہ اسفند یار اس جیسی تو رستے میں بہت ٹکراتی ہیں ضروری نہیں ہر کسی کو اٹھا کر ہم اپنی کلغی پر سجا لیں۔" اسفند حیات سے غصے میں کہہ کر وہ باہر نکل گئیں۔

بارات والے دن نیہاں پارلر سے تیار ہو کر آئی تو اسفند یار نے اسے لیلیٰ کا گفٹ دیا۔ ڈائمنڈ کا خواب صورت سیٹ۔

"بھابی! میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں اور میں اجنبیوں سے یوں گفٹ نہیں لیا

کرتی۔" یہ کہہ کر وہ ہوٹل جانے کے لیے تیار گاڑی میں جا بیٹھی۔

اس روز مجھے لگا میرے سینے میں جلتے انگاروں پر کسی نے ٹھنڈے یخ پانی کے چھینٹے مارے ہیں آگ تو نہ بجھی مگر تپش جیسے کچھ کم ہوگئی۔

بارات اور ولیمہ دونوں فنکشن رات کے تھے پہلے دن کے فنکشن میں گولڈن ڈریس میں ملبوس نیہاں کے جگمگ کرتے وجود کے سامنے میرج ہال کی لائٹس بھی مدھم لگ رہی تھیں اور اگلے دن ولیمے کے فنکشن میں اس نے سلور اینڈ گرین کا کمبینیشن پہن رکھا تھا وجود تو اس کا آج بھی روشنیاں بکھیر رہا تھا لیکن پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا جیسے وہ ایک ہی رات میں صدیوں کی مسافت طے کر آئی ہے۔ پھر میں نے اسے اپنا وہم سمجھ کر جھٹک دیا۔ ڈارک گرے سوٹ میں خرم کسی ریاست کا ولی عہد لگ رہا تھا اور پھر نیہاں تو اس کے دل کی سب سے بڑی خواہش تھی پھر بھلا کیا ہوا میں نے دونوں کے بجھے بجھے چہرے دیکھ کر سوچا۔

لیکن یہ میرا وہم نہیں تھا۔

"نیہاں کیا بات ہے اتنی خاموش کیوں ہو۔" اگلے روز جب شام کو وہ دونوں ملنے کے لیے آئے نیہاں اماں جی کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی وہ اٹھ کر باہر گئیں تو میں پوچھ بیٹھی۔

"کیا بات ہے بھابی! آپ کون سی بات کے بارے میں پوچھ رہی ہیں؟" وہ یونہی اپنی چوڑیوں سے کھیلتے ہوئے بولی۔

"تمہاری خوشی کے بارے میں۔ تم مجھے ذرا بھی خوش نہیں لگ رہیں۔"

"خوشی کی بھی بھلا کوئی زبان ہوتی ہے۔ میں خوش ہوں آپ کو کیوں خیال آیا۔"

وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔

"خوشی کی واقعی زبان ہوتی ہے اور وہ لفظوں سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے اور یہ میرا وہم نہیں ہے کہ تم خوش نہیں ہو۔ تم واقعی خوش نہیں ہو۔ مجھے بتاؤ کیا بات ہے۔ کیا خرم نے کچھ کہا ہے۔" تو اس نے مجھے دیکھ کر ایک گہرا سانس لیا۔

"بھابی! یہ محبتیں یہ نفرتیں یہ سب دھوکا ہے فریب ہے ہماری نظر کا ان کا سارا بھید فاصلوں میں چھپا ہے۔ میں اس سے دور تھی تو وہ علی الاعلان میری محبت کا دم بھرتا تھا اسے مل

گئی تو۔" اس نے پھر گہرا سانس لیا۔ "یہاں کوئی بھی چیز پائیدار نہیں ہے کہ جذبے بھی، پل بھر میں سب کچھ بدل جاتا ہے۔" وہ بات کرتے کرتے کھو سی گئی۔

"کیا کہا خرم نے بولو۔ مجھے بتاؤ۔" میں بے قرار ہو اٹھی۔

"وہی جو اسے کہنا چاہیے تھا۔" وہ لاپروائی سے بولی۔

"کہ تم سے زبردستی کی گئی ہے یا کہ تم اس سے شادی پر راضی نہیں تھیں اس بات کا غصہ ہے اسے۔" میں نے قیاس کیا۔

"نہیں خرم کا کوئی دوست ہے یونیورسٹی میں۔ اس نے اس روز کا واقعہ۔" اس کی آواز گھٹ گئی۔ "اسے میری فوڈ پوائزننگ کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ جب وجہ سمجھ میں آتی ہے تو نتائج کی پروا کسے رہتی ہے۔ ٹھکرائے جانے کا احساس بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ شاید مجھے ہوا تھا۔ اس اتنی بڑی غلطی نے میری آنکھیں کھول دیں لیکن وہی غلطی اب میری ساری زندگی کی خطا بن گئی ہے بھابی۔ اسے مجھ سے شدید نفرت ہو چکی ہے۔ محض شادی سے ایک دن پہلے سے اب باقی سب دکھاوا ہے دیکھیں، کتنے دن تک دکھاوے کا یہ بھرم چلتا ہے۔" وہ بڑے سکون سے بول رہی تھی۔ میں جیسے بھونچکی رہ گئی۔ مجھے خرم سے یہ امید نہیں تھی۔

"میں خرم سے خود بات کروں گی۔ بھلا یہ کوئی مذاق ہے۔ ٹھیک ہے۔ انسان سے غلطی ہو جاتی ہے لیکن اسے ایسا کم ظرفی کا ثبوت نہیں دینا چاہیے۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔

"نہیں آپ اس سے کچھ نہیں کہیں گی ورنہ یہ دکھاوا شاید وہ دن بھی نہ چل سکے گا۔ وہ بہت بری طرح ڈس ہارٹ ہوا ہے اور میرے پاس اپنی صفائی دینے کے لیے نہ تو الفاظ ہیں نہ کوئی ثبوت۔ حقیقت وہی ہے جو اسے معلوم ہوئی ہے اور یہ حقیقت بہت ناقابل برداشت ہے۔ ٹھیک ہے میں اسے نظر انداز کرتی تھی۔ یہ اس کے لیے قابل برداشت تھا لیکن کسی اور کے لیے اتنا بڑا قدم اٹھانا۔ اب اگر میں اس کے سامنے ہزار بار بھی قسم کھاؤں کہ وہ واقعی میری حماقت تھی، نادانی تھی۔ اب میں صرف اس کے ساتھ مخلص ہوں وہ کبھی بھی یقین نہیں کرے گا۔ ایک ان دیکھی رقابت نے اسے اندر تک جلا دیا ہے۔ پتا نہیں میں زندگی میں اب بھی اپنا اعتماد بحال کر پاؤں گی یا نہیں۔ اب یہ میرا ہیڈک (دردِ سر) ہے۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔" وہ اتنی بڑی بات اتنے سکون سے کہہ رہی تھی جیسے معمولی بات ہو۔

پھر اس کے منع کرنے کے باوجود میں نے خرم کا ذہن صاف کرنے کی کوشش کی اسے بتانا چاہا کہ انسان سے چھوٹی موٹی غلطی ہو جاتی ہے۔ معاف کر دینا یا بھول جانا زندگی کو سہل بنائے یا نہ بنائے ذہنی اذیت کو کم ضرور کر دیتا ہے۔ لیکن وہ تو جیسے چند ہی دنوں میں اس معاملے میں بالکل پتھر کا بن چکا تھا۔

"بھابی! یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے۔ آپ اس معاملے میں نہ بولیں اس سے آپ کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔" وہ ایک دم سے کٹھور بن گیا تھا۔

"اس معاملے سے نہ ہو۔ تم دونوں سے تو ہے نا۔ خرم وہ اس کی ایک جذباتی حماقت تھی۔ محض اور کچھ بھی نہیں وہ اپنے کیے پر نادم ہے۔ تم بھی اس بات کو بھول جاؤ۔"

"وہ تو پتا نہیں نادم ہے یا نہیں۔ مگر میں ضرور بہت پچھتاؤں میں گھر گیا ہوں، اپنے محبت بھرے جذبات کی توہین کا پچھتاوا اور نیہاں سے ہونے والی زبردستی کا پچھتاوا بھابی میرا دل اس کی محبت سے ایک دم سے خالی ہو گیا ہے بالکل بلینک اور محبت کہنے سے تو نہیں ہوتی۔ یہ یا تو ہو جاتی ہے۔ اب میرے دل میں اس کی رتی برابر بھی محبت نہیں ہے۔ میرے دل سے اس کی طلب مٹ گئی ہے اب بنا طلب کے اگر سمندر بھی سامنے آ جائے تو بندہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔" وہ کہتے ہوئے اٹھ کر باہر چلا گیا اور میں جیسے سناٹے میں گھر کر رہ گئی۔

ابھی تو ایک کہانی کی بازگشت ختم نہیں ہوئی تھی۔ دلوں کے سانحے زندگی کے حادثوں سے کہیں زیادہ اذیت ناک ہوتے ہیں۔ یہ کوئی مجھ سے پوچھتا۔

اور میں کوشش کے باوجود دونوں کے لیے کچھ نہ کر سکی اور یہ کتنا بڑا لطیفہ تھا کہ کل تک خرم نیہاں کی محبت کے لیے ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا اور آج وہ اس کی دسترس میں تھی تو وہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا اور کل تک نیہاں اسے دیکھتے ہی منہ پھیر کر چل دیتی تھی آج وہی نیہاں اس کی ایک نظر کے لیے ہمہ وقت اس کے آگے پیچھے پھرتی رہتی تھی۔

اسفندیار اگر بھٹکا تھا تو بہت دور نہیں گیا تھا کہ اسے ڈھونڈنا ناممکن ہو جاتا اب تو اس سے متعلق ہر شخص جانتا تھا کہ اگر وہ ادھر، موجود نہیں تو ڈیفنس کے ای بلاک کی سب سے

خوب صورت کوٹھی میں موجود ہوگا لیکن خرم جو بھٹکا تو اتنی دور نکل گیا کہ اسے ڈھونڈنا ناممکن ہو گیا تھا وہ اکثر راتوں سے غائب رہتا وہ ڈرنک کرنے لگا تھا اور گھر سے باہر اس کا کوئی ایک ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ شخص دل کے سکون کے لیے ہر چمک دار شے کے پیچھے دیوانہ وار بھاگ رہا تھا اسے روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ اسفند یار اسٹینڈ لیتا اس کے خلاف تو کس منہ سے۔

خرم حد سے زیادہ بدلحاظ ہو گیا تھا اور نیہاں کے پتی ورتا رویے نے اسے اور شہ دی تھی۔ وہ اس کی ہر ناروا حرکت پر اس کا خواہ مخواہ دفاع کرتی تھی۔ اس بات پر اس کی اسفند یار سے بھی تلخ کلامی ہوگئی۔

"بھائی! یہ دنیا مکافات عمل کی جگہ ہے۔ آپ جیسے بھائی بیویوں کے ہوتے ہوئے جب گندگی میں گرتے ہیں تو وہ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ان کی بھی کوئی بہن ہے اور ان کا بھی کیا کل کو ان کی بہن ان کی بیٹی کے ساتھ بھی پیش آ سکتا ہے اور انہیں آئینہ دکھا سکتا ہے اگر ان کی بینائی ٹھیک ہو تو۔"

نیہاں کے اس جواب کے بعد اسفند یار نے اس معاملے میں بولنا ہی چھوڑ دیا اس نے جس جہنم میں مجھے پھینکا تھا۔ آج اس دوزخ میں اس کی بہن بھی پھینک رہی تھی لیکن شاید اس کی بصارت اتنے روشن سچ کو دیکھنا ہی نہیں چاہ رہی تھی۔



چار سالوں میں نیہاں کی دو بیٹیاں ہوگئیں، وجیہہ اور سامعہ۔ مگر خرم پر اس کا ذرہ برابر اثر نہ ہوا تھا۔ اور اس کی دفن شدہ محبت کو زندہ کرنے کے لیے نیہاں نے اپنے آپ کو فنا کر دیا تھا مگر اس کے پتھر دل کو موم نہ کر سکی۔ دل کی کنسٹرکشن صرف کانچ سے نہیں ہوتی اس میں پتھر بھی ہوتا ہے جو کانچ کو توڑ پھوڑ کر اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ اس کا دل بھی اب صرف پتھر کا تھا اور پتھروں پر بارش کے موسم کا جذبوں کا کچھ اثر نہیں ہوتا اس کے پتھر دل کو وہ دونوں معصوم صورتیں بھی نہ پگھلا سکیں اور ایک دن وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر جرمنی چلا گیا بنا کچھ بتائے، بنا کچھ سنے اور کتنے مہینے بعد پتا دیا۔ اماں جی اور بابا نیہاں کی کتنی منتیں کیں کہ وہ ادھر آ جائے مگر اس نے اپنے گھر کی چوکھٹ نہ چھوڑی وہ آخری سانس تک اس کا انتظار کرنے کا عزم کیے ہوئے تھی صرف ایک جذباتی غلطی نے اس کی باقی کی ساری زندگی کو کفارہ بنا دیا

تھا اور وہ بدنصیب اتنی بڑی دولت کا مالک ہوتے ہوئے بھی ایک قطرے کی تلاش میں بھٹک رہا تھا۔

پھر چند ہی سالوں میں اماں جی اور بابا اس سنگدل کا انتظار کرتے کرتے آگے پیچھے اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ ان دونوں کے جانے کے بعد جیسے میں اکیلی ہو گئی۔ یوں تو میں بہت عرصے پہلے ہوگئی تھی، اکیلی اب ہوئی تھی مگر اب یہ اکیلا پن مجھے پتہ نہیں لگتا تھا جو شخص تنہائی کا مقابلہ کر سکتا ہے وہ اکیلے پن کا بھی کر سکتا ہے۔

معاذ اور اسامہ بڑے ہو گئے تھے اور اسفند یار کی اہال کی طرح اٹھنے والی محبت کی شدت میں بھی کمی آ چکی تھی وہ بہت کم اب ادھر جاتا تھا اور پھر جس طرح اماں جی اور بابا کے آخری دنوں میں میں نے ان کی خدمت کی تھی اس نے شاید اسفند یار کو متاثر کیا تھا یا اس 'واہ واہ' نے جو لوگوں نے میرے اتنے بڑے دل کی مالک ہونے پر کی تھی۔

"ظرف ہو تو خولہ جیسا، جس نے اتنی بڑی چوٹ سہنے کے باوجود اف نہیں کی اور اسفند یار کے ماں باپ کی یوں خدمت جیسے کوئی اپنے سگے ماں باپ کی بھی نہیں کرتا اور کس طرح ان کے بعد گھر کا نام روشن کیا ہے سب کے لیے قابل تقلید ہے۔"

اب کسی کو کیا پتا اس نام کو روشن کرنے کے لیے میں نے کتنی بار اپنا تن من پھونکا ہے۔ لیکن کسی کو بتانے کی کیا ضرورت ہے بظاہر تو میں ویسی کی ویسی ہی تھی بلکہ اس ان دیکھی سلگتی آگ نے جیسے میرے حسن کو جلا بخشی تھی سب کہتے تھے میں آج بھی وہی خولہ ہوں چودہ بیس سال پہلے والی خولہ جسے دیکھ کر سب نے کوہ نور کا نام دیا تھا۔

اور سب سے بڑا پلس پوائنٹ جو میرے حق میں ہوا اگرچہ میں نے اس طرح کبھی نہیں چاہا تھا بلکہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ لیکن آج بھی ایک بے ثمر درخت تھی، جس کی چھاؤں تو آج بھی بڑی دلفریب تھی جس کے نیچے بیٹھ کر حالات کی دھوپ میں جلتا مسافر ایک سکون بھری نیند لے سکتا ہے لیکن بہت دیر تک نہیں اور شجر کی پہچان تو اس کا پھل ہوتا ہے ورنہ تو بندہ کسی دیوار کے سائے میں بھی کچھ دیر سستا سکتا ہے اور اسفند یار کو جتنا اس کی چھاؤں میں سستانا تھا سستا لیا تھا۔ اب اسے معاذ اور اسامہ کے مضبوط وجود اپنی طرف کھینچتے تھے جن کے اونچے لمبے قد کے سائے اس کے وجود کو اپنی اوٹ میں چھپا سکتے تھے۔ لیکن یہاں بھی اسے

بہت امید نہیں تھی کہ جو دہقان وقت پر اپنے کھیت کو پانی نہیں لگاتا اس کی آبیاری محبت سے نہیں کرتا راتوں کو جاگ جاگ کر اس کی حفاظت نہیں کرتا اسے پھر فصل سے بہت امیدیں لگانی بھی نہیں چاہئیں۔

معاذ اور اسامہ کو اسفند یار سے بس اتنی ہی الفت تھی، جتنی کسی گاڑی میں ایک مسافر کو دوسرے مسافر سے ہوتی ہے مگر اس معاملے میں بھی میں ان پر سختی کرتی تھی کہ وہ ان کا باپ ہے اور انہیں کسی طرح بھی اس کے ساتھ سخت لہجے میں بات کرنے کی اجازت نہیں۔ وہ میرے اس حکم پر جز بز ہوتے باپ کی آمد پر دل پر جبر کر کے نرم لہجے میں بات کرتے اور میری عظمت کے قائل ہو جاتے۔

اور محبتوں کی یہ جنگ میں نے لڑے بغیر ہی جیت لی تھی اور اصل فاتح وہی ہوتا ہے جو تلوار سونتے بغیر، ایک قطرہ خون بہائے بغیر، سارے مورچوں پر قبضہ کر لے اور آج میرا سب مورچوں پر قبضہ تھا سب سے مضبوط مورچے اسامہ اور معاذ، ننھیال میرے والدین بھائی سب میری دل سے قدر کرتے تھے میری عظمت کو سراہتے تھے اور یوں آہستہ آہستہ میرے اندر لگی آگ پر چھینٹے پڑتے رہتے اور تو اور اب اسفند یار کا رویہ میرے ساتھ خاصا محبت بھرا ہو چلا تھا اس کی محبت میں ایک شکر گزاری کا عنصر نمایاں ہوتا تھا کہ میں نے اس کے آشیانے کو اپنا خون دل دے کر قائم رکھا تھا مگر اب کی اس کی محبت کی مجھے نہ تو پرواہ تھی نہ ضرورت سب کی محبتوں نے مجھے ایک عظیم دیوی کا سا درجہ دے دیا تھا جس کی ایثار اور قربانی کے سامنے سب کے قد چھوٹے پڑ جاتے ہیں اور اسفند یار تو جیسے بونا بن گیا تھا اور بونوں سے کون ڈرتا ہے بھلا۔



اسفند یار دو تین دن سے گھر نہیں آیا تھا۔ نہ رات کو نہ دن کو پہلے میں نے سوچا اس کا پتا کروں پھر میں نے اس خیال کو دل سے جھٹک دیا۔

وہ چوتھے دن کی آدھی رات کو آیا بے حد تھکا ہوا۔ آنکھوں کے گرد حلقے سے پڑے ہوئے اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں جیسے وہ ایک عرصے سے سویا نہ ہو اس کے قدم بھی اکھڑے اکھڑے سے وہ آتے ہی تکیے میں منہ چھپا کر لیٹ گیا۔

"کیا بات ہے طبیعت تو ٹھیک ہے؟" پاس سے گزرتے ہوئے میں نے رک کر اس سے پوچھا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ میں سونا چاہتا ہوں۔" اس نے چہرہ تکیے میں چھپائے چھپائے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا تو میں لاؤنج سے اپنا کپ اٹھا کر باہر نکل آئی۔

اور اگلے دن کے اخبار کے پچھلے صفحے پر ایک چھوٹی سی خبر تھی۔

"ماضی کی مقبول ڈراموں کی خوب صورت اداکارہ لیلیٰ کا ہارٹ فیل سے کل صبح انتقال ہو گیا ہے۔" آگے دو تین لائنوں میں تفصیل تھی اور بس!

میں ناشتے کی میز پر جیسے چپ چاپ بیٹھی رہ گئی۔ اس خبر کا نا معلوم مجھے کب سے انتظار تھا اور آج جب یہ خبر پڑھی تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ خوش ہونا چاہیے یا غمگین ہونا۔ میں نے خود کو ٹٹولا۔ بہت عرصہ ہو گیا بڑی سے بڑی خوشی مجھے بہت خوش نہیں کر پاتی تھی اور غم جو اس دل نے جھیلا تھا اس کے بعد ہر غم اس کے آگے حقیر لگتا تھا۔

اسی لیے اسفند یار دو تین دن گھر نہیں آیا تھا، مجھے اس کی بکھری بکھری حالت یاد آ گئی۔

اسی وقت جیولر کا فون آ گیا میں معاذ کی شادی کی تیاری کر رہی تھی شادی میں صرف پچیس دن رہ گئے تھے معاذ نے اپنی کلاس فیلو صائمہ کو پسند کیا تھا اور میں نے اس کی پسند کو پسند کر لیا تھا۔ اسفند یار نے اعتراض کیا تھا وہ وجیہہ سے معاذ کی شادی کرنا چاہتا تھا لیکن اب اس کے اعتراض کی کسی کو بھی بہت پروا نہ تھی۔

رات کے خبر نامے کے بعد ٹی وی کے آگے بیٹھی تھی جب اناؤنسر نے لیلیٰ کے مشہور ڈرامے پیاس کی اناؤنسمنٹ کی یہ ڈرامہ اس کے کیریئر کا سب سے ٹاپ کلاس ڈرامہ تھا۔ پیاس، ایک ایسی لڑکی کی کہانی تھی جو ساری زندگی سچی اور بے غرض محبت کی تلاش میں گزار دیتی ہے اور اسی تلاش میں وہ کتنے ہی دھوکے کھاتی ہے کتنے سرابوں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے بالآخر ختم ہو جاتی ہے۔ لیلیٰ کی پرفارمنس اور کہانی کا تھیم اس قدر بھرپور تھا کہ جب کھیل ختم ہوا تو میری آنکھ سے ایک آنسو ٹپک کر میرے لباس میں کہیں گم ہو گیا۔

"ماما! آپ بھی حد کرتی ہیں، خدا خدا کر کے اس ڈائن نے ہمارا پیچھا چھوڑا ہے اور

آپ اس کا سوگ منا رہی ہیں۔ جس نے ہماری زندگی میں زہر گھولا تھا۔'' اسامہ نے ٹی وی کا بٹن آف کرتے ہوئے زہر خند لہجے میں کہا۔

''بری بات ایسے نہیں کہتے جو مر گیا اس کی اچھائی یا برائی سب اس کے ساتھ ختم ہو جاتے ہیں ہمیں یہ فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں کہ وہ کیسا تھا؟'' میں نے کھڑے ہوتے ہوئے اسے ٹوکا۔ میں نے بچوں کو ہمیشہ اچھے اخلاق کا سبق دیا تھا۔ میں جانے کے لیے پلٹی تو میرے پیچھے اسفند یار کھڑا تھا اس کی آنکھوں میں وہی احسان مندانہ محبت کا جذبہ چھلک رہا تھا میں کترا کر باہر آ گئی۔

''دیکھا پاپا ہماری ماما کتنی عظیم ہیں۔'' یہ اسامہ کے الفاظ تھے جو میں نے باہر نکلتے وقت سنے۔

تو جیسے سینے میں جلتا ایک انگارہ ٹھنڈا ہو گیا۔ گزرتا وقت میری عظمتوں میں اضافہ کرتا چلا گیا اسفند یار کا قد اور چھوٹا ہوتا گیا اب وہ دل و جان سے میری عظمت کا قائل ہو چکا تھا وہ اب بہت سارا وقت میرے ساتھ بچوں کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا لیکن اب نہ تو مجھے اس کے ساتھ وقت گزارنے کی عادت رہی تھی نہ بچوں کو، معاذ صائمہ میں مصروف ہو گیا اور اسامہ بزنس میں۔

اور تقریباً اب سے چھ ماہ پہلے میں نے اسامہ کی خواہش پر اس کی شادی وجیہہ سے کر دی۔ خرم اس دوران صرف دو بار پاکستان آیا اور چند روز رہ کر پھر واپس چلا گیا۔ نیاں کو اندر ہی اندر غم کی دیمک چاٹتی رہی اسے بلڈ کینسر ہو گیا مگر شاید خرم کو اس کا علم نہیں تھا یا شاید تھا۔

اور آج تقریباً چار ماہ قبل ایک دن اچانک بیٹھے بیٹھے اسفند یار کو ہارٹ اٹیک ہو گیا اور میری جان تو جیسے آدھی اس کے ساتھ ہی نکل گئی۔ اس کے انتظار میں رت جگے گزارتے گزارتے میں نے اللہ سے لو لگا لی تھی۔ اسفند یار کو ہارٹ اٹیک کیا ہوا میں نے جیسے رب کی چوکھٹ ہی تھام لی۔ دن رات گریہ زاری کر کے میں نے خدا سے اس کی زندگی کی بھیک مانگی اور پھر شاید خدا کو میری التجاؤں پر رحم آ گیا اور اس نے اسفند یار کو نئی زندگی دے دی، وہ زندگی جو لیلیٰ کی جدائی کا زخم نہ سہہ سکی تھی، اب ختم ہو چکی تھی اور اس کی جگہ نئے اسفند یار نے

جنم لیا تھا پورا میری عظیم محبت کے احساس سے بھیگا ہوا اسفند یار۔ دونوں بچوں نے اس کی ہدایت کے مطابق اسے مکمل بیڈ ریسٹ دیا تھا۔ اسے ہر طرح کی ٹینشن لینے سے منع کر دیا تھا۔ لیکن انہیں بار بار کاروباری معاملات کے سلسلے میں اس کی ضرورت پڑتی تھی۔ کچھ اس وجہ سے اور کچھ ان کی بے پناہ فرمانبرداری سے متاثر ہو کر اسفند یار نے بزنس اور مل دونوں کے نام منتقل کر دیے اور تقریباً ڈیڑھ ماہ پہلے ہماری شادی کی تیسویں سالگرہ کے موقعہ پر یہ گھر اس نے میرے نام کر دیا۔

''وہ کہیں نہیں جائے گا۔ لوٹ کر تمہارے ہی پاس آئے گا۔ تم حوصلہ کرو صبر کرو۔''

یہ میری ماں کے الفاظ تھے جو آج سے ڈیڑھ ماہ پہلے پورے ہو گئے تھے اور وہی گھر جس سے آج سے بائیس سال پہلے اسفند یار نے مجھے دھکے دے کر نکالا تھا وہ آج میرے نام تھا۔ مدھم مدھم برسوں سے سلگتی آنچ پر جیسے کسی نے ڈھیر سارا ٹھنڈا پانی ڈال دیا تھا بس اب تو دھواں سا رہ گیا تھا یا اک تپش کا ذرا سا احساس۔



اور آج اسفند یار کو اسی محل سے باہر دھکیل کر میں نے وہ احساس بھی ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا تھا۔ اندر باہر موسم ایک جیسا ہو گیا تھا ٹھنڈا ٹھار اتنے سالوں سے بجھ بجھ جلتا الاؤ ایک دم سے جیسے گلستان بن گیا تھا میں آج بے حد خوش ہوں بے حد سے زیادہ۔''

میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے برفیلی فضا میں گہرے گہرے دو تین سانس لیے شاید رات بیت چلی تھی بارش نہ معلوم کب تھم چکی تھی اب ہر طرف بارش کے بعد کا سناٹا پھیلا ہوا تھا۔

''میرا خیال ہے مجھے اندر چلنا چاہیے۔'' میں نے دھند میں لپٹے آسمان کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

وہ کہاں گیا ہو گا لیلیٰ کی کوٹھی بیچ کر تو اس نے سارا سرمایہ ٹیکسٹائل مل میں لگا دیا تھا۔ وہ کہیں بھی گیا ہو، مجھے اب اس کے خیال سے خود کو رہا کر لینا چاہیے میں نے سر جھٹکتے ہوئے یونہی گیٹ کی طرف دیکھا۔

اسی وقت مجھے محسوس ہوا کہ اندر کہیں فون کی بیل بج رہی ہے۔

اگرچہ اب میرے دل سے ہر بوجھ اتر گیا تھا پہلے جب اسفند یار گھر سے باہر ہوتا تھا تو میں بیر جلی بلی کی طرح ساری رات دل پر منوں بوجھ لیے جاگتی رہتی تھی۔ لیکن نیند تو آج بھی میری آنکھوں میں نہیں تھی۔ میں نے تھک کر آنکھیں بند کر لیں۔

''ماما! آپ ابھی تک یہیں ہیں۔ کیا ساری رات اندر نہیں گئیں؟ آپ کو پتا ہے رات کے ساڑھے تین بج رہے ہیں۔'' اسامہ کی حیرت بھری آواز پر میں نے مڑ کر اسے دیکھا وہ ڈریسنگ گاؤن کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے مجھ سے مخاطب تھا۔

''بس۔'' میں یہی کہہ سکی۔

''ماما! اتنی سردی میں۔ آپ پاپا کے انتظار میں بیٹھی رہیں، جبکہ آپ جانتی ہیں انہیں۔ خدا کے لیے ماما کیوں آپ نے انہیں خدا کا درجہ دے دیا ہے ایسے شخص کو تو۔'' وہ کچھ کہتے کہتے رہ گیا اور ایسے موقع پر ہمیشہ میں ان دونوں کو ٹوک دیا کرتی تھی لیکن آج میرا اس کو ٹوکنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا دوغلی زندگی بسر کرتے کرتے میں تنگ آ چکی تھی۔

''ماما! ابھی فون آیا ہے۔ وہ ہاشمی انکل ہیں نا جن کا کارنر پر گھر ہے......'' وہ چپ کر گیا۔

''کیوں اس وقت فون آیا ان کا؟'' میں نے بے تاثر آواز میں پوچھا۔

''آپ نے حوصلے سے سننا ہے۔ وہ کسی ضروری کام سے تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے گھر سے نکلے تو انہیں اپنے گھر کے آگے کوئی شخص پڑا ملا۔'' وہ تو پھر چپ کر گیا۔

''وہ کون تھا؟'' میں نے پریشانی سے پوچھا۔

''وہ پاپا تھے پتا نہیں کیسے گھر آتے ہوئے وہ کب بے ہوش ہو کر وہاں گر گئے اتنی بارش میں۔'' اس کی نظریں میرے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔

''کیا کہہ رہے ہو؟'' میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''وہ ہاشمی انکل انہیں ہاسپٹل لے گئے تھے اب وہ آئی سی یو میں ہیں میں جا رہا ہوں ہاسپٹل آپ کچھ دیر آرام کر کے آ جایئے گا۔'' اس نے محبت سے مجھے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا تو میں چپ رہی۔

اور پھر جب تھوڑی دیر بعد اسامہ ہاسپٹل جا رہا تھا میں بھی اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر جا بیٹھی وہ بس مجھے تاسف سے دیکھ کر رہ گیا۔



اگلے دن اسفند یار کو آئی سی یو سے وی آئی پی روم میں شفٹ کر دیا گیا۔ اس کی لیفٹ سائیڈ مکمل طور پر پیرالائز ہو گئی تھی اور زبان مکمل طور پر گنگ ہو گئی تھی۔ ڈاکٹرز کا خیال تھا کہ کچھ عرصے بعد وہ تھوڑی بہت آواز نکالنے لگے گا۔ لیکن ابھی وہ ذہنی طور پر بالکل مفلوج ہو چکا ہے اس کی حالت بہتر ہونے میں کچھ ماہ لگیں گے۔

سب ہی اسے دیکھنے آئے تھے۔ خرم صبح سے آیا ہوا تھا اور میں تو اسی صبح سے ہاسپٹل میں تھی سب کے اصرار کے باوجود میں گھر نہ جا سکی تھی۔ بس اس کے بیڈ کے پاس بیٹھی تھی۔ خرم کتنی دیر سے میرے پاس بیٹھا تھا خاموش۔

''ٹھیک ہو جائیں گے اسفند بھائی!'' وہ کافی دیر بعد بولا تو میں نے لاتعلقی سے ایک نظر اسفند یار کو دیکھا پتا نہیں کب میرے دل کا رشتہ اس سے ٹوٹ گیا تھا اب تو شاید نکاح نامے کے علاوہ کوئی ثبوت نہ تھا ہمارے تعلق کا۔

''ہوں۔'' میں صرف یہی کہہ سکی۔

''تم اب مستقل آ گئے ہو نا؟'' میں نے کچھ دیر بعد اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس کے سر کے سارے بال سفید ہو چکے تھے شاید اس نے بھی انہیں ڈائی نہیں کیا تھا چہرے کی دلکشی اور لطافت سب کہیں گم ہو چکی تھی۔ اس کی جگہ ادھیڑ عمر کرخت چہرے نے لے لی تھی۔

''نہیں ابھی جانا ہے۔''

''نیہاں کو لندن لے کر جانا ہے علاج کے لیے اگلے ماہ۔'' وہ کچھ دیر بعد بولا۔

''اب، اب خیال آیا ہے تمہیں نیہاں کے علاج کا۔ جب......'' میں تلخی سے بولتے بولتے چپ ہو گئی۔

''اب ہر کوئی آپ کی طرح تو نہیں ہوتا، اتنے بڑے سمندر جیسے ظرف کا مالک کچھ لوگ میرے جیسے ہوتے ہیں، ایک ورز سے بھی چھوٹا ظرف رکھنے والے۔'' وہ پھیکی سی ہنسی ہنسا تو میں نے یونہی اسفند یار کو دیکھا وہ سکون آور دواؤں کے زیر اثر سو رہا تھا۔

''ظرف بڑا کرنے سے بڑا ہوتا ہے، خود بخود بڑا نہیں ہو جاتا۔'' میں نے مدھم

آواز میں کہا۔

"شاید۔" وہ یونہی بولا۔

"خولہ بھابی! آپ کو پتا ہے۔ ہم سب مشروط محبتیں کرتے ہیں جب ہم کسی سے محبت کرتے ہیں تو جواب میں اس سے زیادہ محبت کی ڈیمانڈ کرتے ہیں اور اگر اتنی محبت جواباً ہمیں نہ ملے تو ہم بھی دامن جھٹک دیتے ہیں۔"

وہ جیسے خلاؤں میں کھویا ہوا تھا۔ "میں نیہاں سے اتنی محبت کرتا تھا یہ تو آپ کو علم ہی ہے لیکن جب مجھے پتا چلا کہ وہ مجھ سے اتنی محبت نہیں کرتی بلکہ سرے سے کرتی ہی نہیں تو میں بھی اس کی محبت سے منکر ہو گیا۔ میں گلی گلی بے لوث بے ریا محبت کے لیے بھٹکتا رہا۔ ملکوں ملکوں اس در نایاب کی تلاش میں پھرا لیکن بے لوث محبت مجھے کہیں نہ ملی ہر جگہ Give and Take (لین دین) کا اصول لاگو تھا۔ میں جب بھی کسی سے محبت کرتا تو جواب میں اتنی ہی شدت کا طلبگار ہوتا لیکن بے ریا محبت نہ میں نے کی نہ مجھے کہیں سے ملی۔ والدین بچوں سے اس لیے محبت کرتے ہیں کہ بڑے ہو کر وہ اس محبت کا قرض بمعہ سود کے اتار دیں گے۔ بیوی شوہر سے اس لیے محبت کرتی ہے کہ وہ کما کر لاتا ہے اس کی خواہشات پوری کرتا ہے اگر وہ ایک لمحے کو بھی اپنی اس محبت سے ہاتھ کھینچ لے تو اس کی باوفا بیوی آنکھیں بدلنے میں بہت زیادہ دیر نہیں لگائے گی آپ بھی اسفند بھائی سے محبت کرتی رہیں جب تک آپ کو علم تھا کہ وہ صرف آپ سے محبت کرتے ہیں اور جب آپ کو علم ہوا کہ ان کی محبت کا محور آپ نہیں کوئی اور ہے تو کیا آپ ان سے پھر بھی محبت کرتی رہی تھیں؟" اس نے سوالیہ نظریں مجھ پر جما دیں میں کچھ نہ کہہ سکی۔

"نہیں نا، یہ سب تو دنیا داری ہے یہاں کوئی بھی کسی سے بے غرض محبت نہیں کرتا، اگر کرتا بھی ہے تو جواب میں طلب بھی ضرور کرتا ہے۔

ہم وفائیں کر کے رکھتے ہیں وفاؤں کی امید محبتوں میں اس قدر سوداگری بھی جرم ہے۔

اس نے کرسی کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے شعر پڑھا۔

یہ اتنا گہرا فلسفہ اسے دیس دیس کے پانی نے سکھایا تھا۔ لیکن کس قدر سچ تھا یہ

میں بھی صرف اسی وقت تک اسفند یار سے محبت کرتی رہی تھی جب تک یہ خیال تھا کہ وہ صرف مجھے چاہتا ہے محض مجھ سے محبت!

"اور اب تم پھر نیہاں سے محبت کرنے لگے ہو؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں کیونکہ شاید میرے دل کو یقین آ گیا ہے کہ وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔"

وہ خود ہی زور سے ہنسا۔

پھر کتنے دن بیت گئے اسفند یار کو ہاسپٹل میں۔ اس کی جو حالت پہلے دن تھی، وہی اب بھی تھی اسے ہوش آ چکا تھا لیکن وہ بات کرنے سے بولنے سے قاصر تھا۔ بس خاموشی سے سب کو تکے جاتا وہ ایک روز میں ڈاکٹرز اسے ڈسچارج کرنے والے تھے۔ معاذ اور صائمہ اگلے دن ہی آ گئے تھے۔

میں سارے دن میں بہت تھوڑی دیر کے لیے گھر جاتی تھی، پھر واپس آ جاتی میرے بیٹے میری صحت کے بارے میں فکر مند تھے۔ باپ کی حالت کا انہیں صرف افسوس تھا مگر اس بے وفا شخص کے لیے میری بے چینی انہیں ایک آنکھ نہیں بھا رہی تھی۔

"ماما پلیز گھر جائیں۔ گھر جا کر آرام کریں دیکھیں آپ نے اپنی کیا حالت بنالی ہے، کتنی کمزور ہو گئی ہیں آپ پلیز آپ اب گھر جائیں پاپا کے پاس ہم سب ہیں اور ویسے بھی انہوں نے کب آپ کی محبت کی پروا کی ہے جو اب اس حالت میں آپ کے جذبوں کی پروا کریں گے۔ آپ اسامہ کے ساتھ گھر چلی جائیں۔" معاذ کتنی دیر سے مجھ سے بحث کر رہا تھا۔

"بیٹا! میں ٹھیک ہوں چلی جاؤں گی گھر۔ ابھی ڈاکٹرز آئیں گے وزٹ پہ۔ ان کی رپورٹس چیک کریں گے تو پھر میں چلی جاؤں گی۔" میں نے اسفند یار کی طرف دیکھا جو خاموش نظروں سے مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ اگرچہ میں جانتی تھی کہ اس کی زبان مفلوج ہو چکی ہے لیکن پھر بھی مجھے اس کی نظروں سے خوف آتا تھا کہ کہیں یہ نظریں سب کو اس رات کی کہانی نہ سنا دیں۔ خولہ کا اصلی روپ نہ دکھا دیں۔

"ہاں خولہ! معاذ ٹھیک کہتا ہے تم اب گھر جاؤ۔ ہم بھی یہاں ہیں۔" نثار بھائی نے بھی کہا۔

"آپ لوگ کیوں اتنا اصرار کر رہے ہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔ چلی جاؤں گی گھر اور گھر جا کر مجھے کون سا چین آتا ہے مجھے بس یہیں رہنے دیں۔" میں نے اسفند یار کی شکایت آمیز نظروں سے گھبرا کر آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

"کہاں ہوتی ہیں، آج کل کے زمانے میں ایسی وفا شعار شوہر پرست بیویاں۔ خولہ تم نے حق ادا کر دیا بیوی ہونے کا۔ ہاں ایسی ہی نیک طینت بیویوں کے لیے خدا نے جنت کی بشارت دی ہے۔ تم ہم سب کے لیے ایک روشن مثال ہو تقلید کی، ہمیں واقعی تم پر فخر ہے۔" یہ بڑی بھابی تھیں اور میرا سینہ ٹھنڈا پڑنے کے بجائے جلنے لگا۔



"خولہ بنت ثعلبہ جس کا شوہر اس سے ناراض ہو گیا تو اس نے نبی ﷺ کے پاس جا کر رو رو کر دہائی دی کہ جب تک میرا شوہر مجھ سے راضی نہیں ہو گا، میں تو کچھ کھاؤں گی نہ پیوں گی اس کی فریاد نے عرش ہلا دیا کہ خدا کو وحی نازل کرنا پڑی۔ وہی خولہ آج بھی عورتوں کے لیے ایک مثال ہے تقلید کی روشن مثال۔ ہم اگر چاہیں تو اس ایک مشعل سے اپنی زندگی کے تمام گوشے منور کر سکتے ہیں۔"

اسفند یار کے گھر آنے پر میں نے قرآن پاک ختم کر دیا تھا اور اب قاریہ شمسہ ایک سورت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے خولہ بنت ثعلبہ کا واقعہ بیان کر رہی تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے پوری دل کی لگن کے ساتھ اسفند یار کی صحت یابی کی دعا کروائی۔ دعا کے بعد خواتین ٹولیوں میں بٹ کر سرگوشیاں کرنے لگیں، ملازمین دوسرے کمرے میں کھانے پینے کا اہتمام کر رہے تھے۔

"کیا خوب درس دیا ہے شمسہ آپا نے۔ ایمان تازہ ہو گیا ہے۔" ایک عورت بولی۔

"یہی تو وہ باتیں ہیں جن کو ہم بھولے بیٹھے ہیں اور ان واقعات کو صدیوں پرانا کہہ کر جھٹک دیتے ہیں حالانکہ صدیوں پہلے بھی انسان ایسا ہی تھا اور اس طرح کے واقعات سے گزرتا تھا اپنی خولہ کو لے لو۔ کیسے اس نے صدیوں پرانی اس عورت کی کہانی کو حقیقت کا روپ دیا ہے شوہر سے محبت وفا اور فرمانبرداری کی زندہ مثال۔ ہمیں تو رشک آتا ہے اس کے سمندر

جیسے قلب کے بارے میں سوچ کر۔ خدا اس کے طفیل ہمیں بھی نیکی کی ہدایت دے۔" یہ فری بھابی تھیں۔

"صحیح کہتی ہیں آپ بھابی! میری بھابی جیسا حوصلہ کسی میں ہو گا میں نے ان کی مثال ہی سے تو زندگی کا رستہ پایا ہے یہ میرے لیے زندہ ہدایت تھیں۔ ان کی خاموش وفا نے میرا رستہ آسان کیا ہے۔" نیہاں بھی میرے پاس آ بیٹھی۔

ان کے تبصروں سے میرا بدن جلنے لگا۔

اگر یہ سب اسفند یار کی خاموش نگاہوں کا ایک حصہ بھی جان لیں تو شاید میرے منہ پر تھوک کر کے نکل جائیں۔

پتا نہیں خدا نے کس کا بھرم رکھا تھا اسفند یار کا یا میرا۔

اسفند یار نے جو کچھ کیا، وہ ڈنکے کی چوٹ پر کیا سب اس کے ظلم، سے واقف تھے۔ وہ آج بھی سب کی نظروں میں مجرم تھا مجھے اور بچوں کو ہر طرح کی آسائشیں دینے کے باوجود اور میں، میں نے کیا کیا مجھے اپنا کردار سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں زور زور سے روؤں سب کو بتاؤں کہ میرا اصل کیا ہے مجھے اس شخص سے محبت تھی لیکن ضرورت کی محبت۔ اگر بے ریا محبت ہوتی تو میں بھی دوبارہ اس کے پاس لوٹ کر نہ آتی۔ میں اپنی ضرورتوں کے لیے آئی اور یہ میری اعلیٰ ظرفی کہلائی۔ ساری زندگی کی کمائی یہ فرمانبرداری اور مطیع بیٹے یہ تعریف و تحسین کے قلادے یہ عزت و عظمت کا منصب اور میرا اصل کیا ہے۔

اگر کوئی مجھے اس رات دیکھ لیتا تو۔

یہ جو خرم کو سمجھاتی تھی کہ وہ معاف کر دے کہ غلطی انسان سے ہوتی ہے اور خود اس کی ایک خطا نہ بخش سکی۔ اس کا زہر بائیس برس اندر ہی اندر پلتی رہی کہ آج میرے وجود کے زہر سے یہ شخص مفلوج ہو گیا۔

میں نے بائیس برس جلن اور انتقام کی آگ میں جلتے گزار دیے اور آئندہ کے باقی برس پچھتاوے اور ملال میں کہ خدا ہر کسی کو ایک موقع ضرور دیتا ہے اور ہم اکثر ہی اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھا پاتے اسے سمجھ ہی نہیں پاتے۔

اسفند یار کو یہ موقع اگر بائیس برس پہلے ملا تھا تو مجھے فقط پندرہ روز پہلے اسی طرح میں نے کندن بننے کا یہ موقع گنوا دیا۔ خدا کی رضا کو انتقام کی بھینٹ چڑھا دیا اور اس کے بعد بھی ایک پل کی خوشی نہ مل سکی۔

لیکن نہیں ابھی تو میرے پاس وقت ہے اگرچہ ہر کسی کو وہ چانس نہیں ملا کرتے لیکن مجھے دوسرا موقع بھی دیا گیا ہے خدا کی رضا حاصل کرنے کا موقع اور میں اس موقعے کو ضائع نہیں کروں گی اور توبہ کا در تو ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ اگر سچے دل سے کی جائے مجھے بھی یہ در کھٹکھٹانا ہے اور مجھے ہر مقصود ضرور حاصل کرنا ہے۔ آپ بھی میرے حق میں دعا کیجئے گا۔ ہاں ابھی وقت ہے۔

میں نئے عزت اور حوصلے سے اسفند یار کے کمرے کی طرف بڑھی "اس کی خاموش نظریں یقیناً میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔" میں نے سوچا۔

اختتام